Pdfbookkorner.blogspot.com

رات کی سیاہ چادر کو چیرتی منظور کی نیلی گھوڑی سرپٹ بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی زیبو کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ گاؤں سے دور ویرانے میں نکل آئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح اندھیرے کی دیوار سے سر ٹکرا رہے ہیں۔

زیبو کو کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس سمت بڑھے چلے جاتے ہیں۔ اس کے دل میں ہول سے اٹھ رہے تھے اور اسے ہر طرف سے تعاقب کرنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پسینے میں بھیگی ہوئی ہتھیلیوں سے منظور کا کرتا مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر گھوڑی کے دوڑتے ہوئے قدموں سے لگنے والے جھٹکوں نے جیسے اس کی ہڈی ہڈی کو چور چور کر دیا تھا۔

اچانک سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا خوفناک آواز سے ہنہناتا درختوں کے ایک جھنڈ تلے رک گیا۔ گھوڑے کی آواز سے ننھے منے پرندے گھبرا کر اپنے گھونسلوں میں شور مچانے لگے۔ کچھ نے تھوڑی دیر پر پھڑ پھڑائے اور پھر چپ چاپ اپنے آشیانوں میں آن بیٹھے۔ منظور ایک ہی جست میں گھوڑے سے نیچے اترا اور اس نے سہارا دے کر زیبو کو بھی نیچے اتار لیا۔

کالی سیاہ رات چاروں جانب سے امنڈی پڑتی تھی۔ ستاروں کی روشن شمعیں بھی گھور اندھیرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں۔ زیبو نے چاروں طرف ایک سہمی سہمی سی نگاہ ڈالی۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

''یا منظور! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

منظور نے منہ میں دو انگلیاں ڈال کر ہلکی سی سیٹی بجائی اور اس کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''حوصلہ رکھ بہنا...... دل کو مضبوط کر...... میں جو تیرے ساتھ ہوں تجھے ڈرنے کی ضرورت

نہیں۔ حوصلہ کر...... حوصلہ......"

زیبو اس کے قریب آ گئی۔ "ہائے پا منظور مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ کوئی ہمارے پیچھے آ گیا تو۔" وہ بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں بولی اور اس کے سفید ریشمی کرتے کی آستین پکڑ لی۔

منظور نے تسلی کیلئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور مضبوط لہجے میں بولا۔ "کیوں گھبراتی ہے بہنا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ وہاں تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہے۔"

"اگر شریف نہ آیا تو؟؟" وہ سانس روک کر بولی۔

"شریف آ گیا ہے۔" اچانک کسی نے مدھم سی سرگوشی کی اور جھاڑیوں میں سے ایک سایہ نکل کر ان کی طرف لپکا۔

"ہائے میں مرگئی...... یہ کون ہے پا منظور!" زیبو کی جان نکل گئی۔

"چڑی جتنا دل ہے تیرا۔ جھلی نہ ہو تو کہیں کی۔" منظور نے پیار سے اس کے سر پر چپت جمائی۔ "غور سے دیکھ یہ شریف ہے۔"

"زیبو پھر بھی سہمی ہوئی سی کھڑی رہی۔ وہ قریب آ گیا۔ اس نے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ جس کے ایک لڑ سے اس نے آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔" منظور نے پوچھا۔

"سب خیر سلا ہے۔" شریف دبی زبان سے بولا۔ "تمہیں تو کسی نے نہیں دیکھا نا۔"

"بس اللہ نے ہی مدد کی ہے۔ میں کئی راستے بدل کر آیا ہوں۔ بس تو بھی اب پھرتی دکھا اور راتوں رات یہاں سے نکلنے کی کر۔ صبح کا منہ تو چوہدریوں کے علاقے سے باہر نکل کر ہی دیکھنا۔" منظور نے تاکید کی۔ اور زیبو کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"دیکھ شریف! میں نے زیبو کو بہن کہا ہے اور یہ قول میں جان دے کر بھی نبھاؤں گا۔ میں اپنی بہن کو تیرے سپرد کر رہا ہوں۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دینا۔"

زیبو نے پلٹ کر منظور کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"حوصلہ کر بہنا!..... حوصلہ۔" منظور نے محبت سے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ "تو فکر نہ کر...... اللہ کو منظور ہوا تو تجھے ملنے آؤں گا۔"

"ویرا بھاگ بھری اور بھرجائی ہاجراں کو بھی لے کر آنا۔" زیبو نے سسکیوں کے

درمیان کہا۔

"چل اب بس کرنا...... خوشی خوشی شریف کے ساتھ وداع ہو۔" منظور اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے بولا۔ دکھ کی ایک گہری ٹیس اسے اندر ہی اندر مضمحل سا کر رہی تھی۔ اس کا دل یوں ڈوب سا رہا تھا۔ جیسے اپنی سگی بہن کو وداع کر رہا ہو۔ اس میں اب وہاں ٹھہرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر شریف سے گلے ملا اور اس کا تشکر اور احسان ومنونیت میں ڈوبا ہوا کوئی لفظ سنے بغیر اچک کر گھوڑے پہ سوار ہوا اور ناہموار راستوں پر اڑتا چلا گیا۔

گھوڑے پہ سوار منظور کی شبیہ اندھیرے میں تحلیل ہوگئی۔ اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا بھی معدوم ہوگئی تو زیبو نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ شریف کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے ہولے سے زیبو کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ہمیشہ کیلئے ایک ہو جانے کی خوشی کے اس البیلے لمحے پر اپنے عزیزوں، اپنے دوستوں اور اپنے گاؤں کی ہواؤں، فضاؤں اور مٹی کی بوباس سے جدائی کا گمبھیر دکھ چھا گیا۔ زیبو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے پا منظور کی طرف سے ڈر آتا ہے۔ اللہ اسے ستے خیراں رکھے۔"

"اللہ نے چاہا تو اسے ستے خیراں ہیں...... تو دعا کر۔" شریف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"وہ بڑا جی دار ہے۔ وہ ایسے ویسے چوہدریوں سے نہیں ڈرتا۔ یار کی یاری نبھانا جانتا ہے۔"

زیبو کے ہونٹوں پر اس کے لئے دعائیں مچلنے لگیں۔ جو سیاہ تاریک رات میں نیلی گھوڑی پہ سوار دشمنوں کی جوہ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

۞......۞......۞

سپیدہ سحری کے نمودار ہونے سے پہلے ہی منظور اپنے گاؤں میں تھا۔ اس نے گھوڑی تھان پر باندھی اور کچھ محبت سے اس کی ایال پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ آج اس نے بھی وفاداری کا حق ادا کر دیا تھا۔ طویل مسافت کی تھکن میں وہ بھی حصہ دار تھی۔ اس نے بڑے پیار سے اسے کئی بار تھپکی دی اور محتاط قدم اٹھاتا صحن میں سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

سفر کی تکان ایک کیف آور نشے میں بدل گئی تھی۔ فتح مندی کا سرمدی احساس اس

کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر کھل اٹھا تھا۔ اس کا سارا وجود گنگنا رہا تھا۔ اس کے مطمئن دل کے قریب کوئی خوف' کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ وہ طمانیت کی شگفتہ کیفیت میں سانس لیتا احتیاط سے اپنے کمرے کی دہلیز تک پہنچا تو اسے ہاجراں چوکھٹ پر ہی مل گئی۔ وہ اس کے انتظار میں رات بھر جاگتی رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے سینے پہ ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر کے ایک لمبے سانس کے درمیان بولی۔

''ہائے ربا...... تیرا شکر ہے۔''

منظور اسے بازو سے پکڑ کر پلنگ تک لایا۔ ''جھلیئے...... تو ابھی تک جاگ رہی ہے۔''

ہاجراں نے پیاسی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو ایک ایک پل مرتے جیتے گزارا ہے منظورا! بتا سولی پہ بھی کسی کو نیند آتی ہے۔ تو کیوں پرائی مصیبت سر لیتا ہے۔ چوہدریوں سے بیر لینا اچھا نہیں منظورا!''

''کیسی باتیں کرتی ہے تو؟'' منظور نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔

''تیرا کیا مطلب ہے دوست کی دوستی نہ نبھاؤں...... زیبو کو بہن کہا تھا تو قول سے پھر جاتا۔ اسے چوہدریوں کے ہاتھوں برباد ہوتے ہوئے خاموشی سے دیکھتا۔ ہاجراں...... ہاجراں...... اگر ہم سب چوہدریوں کے سامنے یونہی سر جھکاتے رہے تو نہ کسی کی عزت سلامت رہے گی نہ آبرو۔''

''ناراض کیوں ہوتے ہو منظور۔'' ہاجراں اس کے بازو سے لگ گئی۔ ''مجھ سے خفا نہ ہوا کرو۔ خدا کے واسطے مجھ سے خفا نہ ہوا کرو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔''

محبت کے نرم گرم احساس نے منظور کو شرابور کر دیا۔ اس کے اندر مسرت کی ایک لہر سی اٹھی۔ وہ احساس ملکیت سے سرشار ہو گیا۔ محبت کی یہ وسیع کائنات تمام و کمال اس کی تھی۔ جو اس سے دلربا لڑکی کے روپ میں اس کے بازو سے لگی ہوئی تھی۔

''جینے کی بات کر ہاجراں...... جینے کی......'' اس نے پیار سے اپنی انگلیاں ہاجراں کے گھنگھریالے بالوں میں الجھا کر اس کا جھکتا ہوا شرمیلا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے تپتے ہوئے [illegible] عارض شفق آلود ہو رہے تھے۔ اس کی دلنواز آنکھوں میں ایک خوبصورت التجا تھی۔ اس [illegible] پلکوں کی جنبش میں لگاؤ اور سپردگی تھی۔ منظور چند لمحے اس کے دہکتے ہوئے چاند [illegible] ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہولے سے اس کے کان میں [illegible] اس کا حجاب آلود چہرہ گلنار ہو گا۔

O......O......O

گاؤں میں کوئی بات بھی چھپی نہیں رہتی۔ اگلے ہی دن گاؤں کی فضا میں یہ سرگوشی رینگتی پھرتی تھی کہ شریف اور زیبو غائب ہیں۔ شریف کی بوڑھی ماں کسی سے ملنے کا کہہ کر گئی تھی مگر لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ وہ اپنا ٹوٹا پھوٹا گھر اسی طرح خالی چھوڑ گئی تھی۔

سارے گاؤں میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ہر جگہ دبی زبان میں لوگ یہی کہتے تھے کہ شریف اور زیبو کی خیر نہیں۔ وہ دونوں دنیا کے جس کونے میں بھی ہوئے چوہدریوں کی پہنچ سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ نہ جانے کیسے اس تمام قصے میں منظور کا نام بھی آ تا تھا۔ حالانکہ رات کی تاریکی کے سوا اسے کسی نے زیبو کو گاؤں سے نکال کر لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی ازخود سب نے فرض کر لیا تھا کہ اس فرار میں منظور کا ہاتھ ہے۔ شریف کے ساتھ اس کی دوستی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔

منظور کا باپ ماسٹر شکور یہ وضاحت کر کر کے تھک گیا تھا کہ شریف اور زیبو کے فرار میں اس کے بیٹے کا کوئی دخل نہیں تھا مگر کوئی بھی اس کی بات پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ گاؤں کی فضا میں پراسرار سی سرگوشیاں گونجتی رہتی تھیں جو ماسٹر شکور کو اندر ہی اندر پگھلاتی رہتی تھیں۔ اس کے سارے وجود پر چوہدریوں کے انتقام کا خوف آسیب کی طرح چھایا رہتا تھا۔

الصبح جب منظور بیلوں کی جوڑی لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہوتا تو جیسے اس کا دل کوئی مٹھی میں لے لیتا۔ وہ ہر پل' ہر لمحے اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اسکول میں تفریح کا وقفہ ہوتا تو وہ کھیتوں میں اسے دیکھنے چل پڑتا۔ رات کو کبھی اس کی آنکھ کھلتی تو اس کی چارپائی کی طرف دیکھ کر تسلی کر لیتا کہ وہ آرام سے سو رہا ہے۔

منظور اسے اس طرح سرگرداں دیکھتا تو ہنس کر کہتا۔

''بابا! بھلا ہمارا اس معاملے سے کیا تعلق؟ شریف مرد آدمی تھا اسے تو اپنی ٹھیکرے کی مانگ کو بچانا ہی تھا۔ اب چوہدری آپ ہی اسے ڈھونڈتے پھریں گے۔ بھلا ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔''

ماسٹر شکور اس کی اس ناتجربے کاری پر دل ہی دل میں ہول جاتا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی۔ اسی گاؤں کی مٹی سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ اسے چوہدریوں اور مزارعوں کی پوری تاریخ ازبر تھی۔ اسی لئے کوئی ان دیکھا وسوسہ اسے اندر ہی اندر ڈراتا رہتا تھا

بھاگ بھری کئی بار اس سے پوچھتی کہ وہ اس قدر پریشان کیوں رہتا ہے۔ اس کی

طبیعت تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ ہنس کر ٹال جاتا۔ لیکن اس کے دل کو ڈرانے والے وسوسے اس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے سارے بدن میں گردش کرنے لگتے۔ وہ دلربا چہرے والی دراز قد بھاگ بھری کو دیکھ کر کچھ اور نہتا سا ہو جاتا اور دل ہی دل میں پکا ارادہ کر لیتا کہ وہ اس فصل پر اس کے ہاتھ ضرور پیلے کر دے گا۔

گھر کیلئے پانی بھاگ بھری ہی کنوئیں سے بھر کر لاتی تھی۔ ہاجراں اور کرمتے گھر کا کام کاج سنبھالتی تھیں۔ لیکن جس روز سے گاؤں کے لوگوں کی پراسرار سرگوشیوں میں منظور کا نام آیا تھا کرمتے بھاگ بھری کو گھڑے اٹھائے دیکھتی تو اس کا دل دہل جاتا۔ وہ فکرمندی ہو کر پوچھتی۔

"نی بھاگ بھریئے...... تیرے ساتھ اور لڑکیاں بھی پانی بھرنے جاتی ہیں؟"

"ہاں ماں...... ہم سب اکٹھی جاتی ہیں۔ میں...... ناجو...... ریشم...... زیتون...... ساری سہیلیاں۔" وہ الھڑپنے سے کہتی۔

"ذرا جلدی آ جایا کر زمانہ بڑا خراب ہے۔" کرمتے پھر بھی تاکید کرتی۔

"ماں! میں وہاں کونسا ترنجن میں بیٹھ جاتی ہوں۔ بس گھڑے بھرے اور واپس۔" وہ چٹکی بجا کر بولی اور اس نے گھڑوں میں سے پانی دوسرے برتنوں میں انڈیل کر خالی گھڑے اٹھائے اور گھر سے باہر نکل آئی۔

راستے میں اسے ناجو اور ریشم بھی مل گئیں۔ تھوڑی دیر میں زیتون بھی آ گئی۔ آپس میں باتیں کرتیں، ہنستیں ایک دوسرے کے ساتھ میٹھی میٹھی چہلیں کرتیں وہ کنوئیں پر پہنچیں تو جمیماں اور گابو پانی بھر رہی تھیں۔ وہ باری باری پانی کھینچنے اور گھڑے بھرنے لگیں۔

جمیماں نے موٹی موٹی آنکھوں کی گھنیری پلکوں کو جھپک کر بھاگ بھری کی طرف دیکھا۔ "بھاگ بھریئے...... زیبو کدھر گئی ہے...... کچھ پتہ ہے تجھے؟"

"مجھے کیا پتہ؟" بھاگ بھری نے نفی میں سر ہلا کر شانے اچکائے۔

"تمہارے گھر اس کا آنا جانا جو بہت تھا۔ پاء منظور نے تو اسے بہن بنایا ہوا تھا۔ شریف بھی تو اس کا جگری یار تھا۔" ناجو نے کہا۔

جمیماں قریب آ کر راز داری سے بولی۔ "سارے گاؤں میں مشہور ہے کہ پاء منظور زیبو کو لے کر گیا تھا۔ شریف کے ساتھ نکاح پڑھوانے۔"

"دفع دور......" بھاگ بھری تڑخ کر بولی۔ "پاء منظور مولوی تو نہیں جو دوسروں کے

نکاح پڑھواتا پھرتا ہے۔"

"تو غصہ نہ کر بھاگ بھریئے۔" ریشم نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔ "پنڈ میں بچے بچے کی زبان پر یہی بات ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ پاء منظور سے کہنا ذرا ہوشیار رہے۔ میرا ابا کہتا ہے چوہدری تو پھنیئر سانپ ہیں۔ بدلہ لیے بغیر نہیں چھوڑتے۔"

"خدا نہ کرے...... اللہ برے وقت سے بچائے۔" بھاگ بھری نے بے ساختہ کہا۔

لیکن اس کا دل اندر ہی اندر ہول گیا تھا۔ اس نے ماں اور بابا کو فکرمند دیکھا تھا۔ خود وہ بھی اتنا شعور رکھتی تھی کہ ان کی فکرمندی کی تہہ میں جوان جانے اندیشے چھپے ہوئے تھے انہیں اپنے وجود پر رینگتا ہوا محسوس کر سکے۔

وہ ہمیشہ کی طرح سہیلیوں کے ساتھ خوش گپیاں نہیں کر سکی۔ اس کے دل میں حبس کی سی کیفیت بھر گئی۔ اس کا دل چاہا کہ فوراً اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری میں چلی جائے۔ کسی کی تسلی لے۔ کسی کا تحفظ محفوظ کرے۔ اس نے جلدی جلدی ریشم کی مدد سے گھڑا سر پر رکھا اور جانے کیلئے مڑی ہی تھی کہ اچانک خودرو جھاڑیوں کو اپنے بھاری چپل سے مسلتا...... چرمرکی آوازیں نکالتا ایک اونچا لمبا مردان کے سامنے آن رکا۔ وہ سب کی سب ٹھٹک سی گئیں۔ ریشم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہائے میں مرگئی...... چوہدری منور......"

بھاگ بھری اس نام کو سن کر دھک سے رہ گئی۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور ریشم کو چلنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھی۔

"ٹھہرو۔" بھاری آواز کی گونج نے اس کے قدم باندھ لئے۔ دوسری لڑکیوں نے بھی گھبرا کر اپنی اوڑھنیاں درست کیں اور ان کے بھرے ہوئے گھڑوں سے پانی چھلک گیا۔

چوہدری منور نے ان سب پر ایک چبھتی ہوئی سی نظر ڈالی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی باریک چھڑی سے اس کی جانب اشارہ کیا۔

"تو ہے بھاگ بھری......؟ منظور کی بہن......؟"

بھاگ بھری کے سارے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ جمیماں اور زیتون وغیرہ بغیر کچھ کہے ایک جانب نکل گئیں۔ چوہدری منور نے چھڑی کے اشارے سے ریشم کو بھی جانے کیلئے کہا تو وہ بدک کر اپنے راستے کی طرف بڑھی۔

بھاگ بھری نے ریشم کا بازو پکڑ لیا۔ "ٹھہر جا ریشمے...... تو میرے ساتھ جانا۔"

1

چوہدری منور نے اپنی باریک چھڑی زور سے ہوا میں لہرا کر سڑاک کی آواز نکالی اور سرخ ڈوروں والی آنکھوں سے ریشم کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس کی گھنی مونچھیں خوفناک انداز میں پھڑک رہی تھیں۔ ریشم نے سہم کر بھاگ بھری سے اپنا بازو چھڑایا۔

''تو جاتی ہے یا......'' چوہدری منور نے لفظ چبائے۔

ریشم اپنا بازو چھڑا کر تیزی سے گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ اس کے گھڑوں میں سے پانی چھلک چھلک کر اس کے کپڑے بھگو رہا تھا۔

بھاگ بھری نے بھی چاہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چل دے لیکن چوہدری منور نے راہ میں آ کر اپنی چھڑی اس کے شانے سے چھواتے ہوئے اسے روک لیا۔ اس کی چبھتی ہوئی نگاہیں جیسے اسے حصار میں لینے لگیں۔ بھاگ بھری کو اس کے انداز' اس کی نگاہوں سے وحشت سی ہونے لگی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اسے سر پہ رکھے ہوئے گھڑے کا بوجھ سہارنا مشکل ہو گیا۔

وہ چند قدم اور قریب آیا اور چھڑی کے ساتھ اس کے سراپے پر جیسے ایک لکیر سی کھینچتا ہوا بولا۔

''ہوں...... تو تو ہے بھاگ بھری......'' اس نے ایک آنکھ دبائی۔ ''زیبو تو تیرے سامنے کچھ بھی نہیں تھی...... سنا ہے تو آٹھ جماعتیں بھی پاس ہے۔''

بھاگ بھری لرز کر پیچھے ہٹ گئی اور اس کی چھڑی کو اپنا آپ چھونے نہیں دیا۔ اس کے سر پہ رکھے گھڑے کا پانی چھلک کر اس کے اوپر آ رہا۔ اس کے تمتمائے ہوئے عنابی رخساروں پر پانی کے قطرے گلاب کی پتیوں پر شبنم کی طرح دلآویز معلوم ہونے لگے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں صیاد دیدہ ہرنی کی سی وحشت انہیں اور بھی دلکش بنانے لگی۔ وہ خشک لبوں کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''میرا راستہ چھوڑ دے۔''

اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر قہقہہ لگایا۔ ''راستہ تو اب نظر آیا ہے۔''

بھاگ بھری کو اس کے لفظوں میں اس کی ہوس کی گندگی بھنبھناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نہ جانے اس میں اتنی ہمت کس طرح آ گئی۔ اس نے سر پہ رکھا ہوا گھڑا زمین پر زور سے پٹخا اور جس طرف راستہ دکھائی دیا دوڑتی چلی گئی۔

وہ نہ جانے کس طرح گھر تک پہنچی۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا اور سانس سے سانس نہیں ملتی تھی۔ کرمتے اسے اس حال میں دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں اس نے بھاگ بھری کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''نی بھاگ بھریئے...... نی بھاگو!...... کیا ہوا تجھے؟ کہاں سے آ رہی ہے تو؟ کیا ہوا......؟ تیرا گھڑا کدھر ہے؟ یہ تیرے کپڑے گیلے کیوں ہیں؟''

بھاگ بھری ماں کے سینے سے لگ گئی۔ وہ اب تک ہانپ رہی تھی۔ کرمتے کا اپنا دل نہیں ٹھہر رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے اسے پاگل سا کر رہے تھے۔ وہ بار بار اس سے پوچھنے لگی کہ اسے کیا ہوا ہے۔

ہاجراں بھی قریب آ گئی اور متفکر سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کرمتے نے جھنجھلا کر ایک دوہتڑ اسے دے مارا۔ ''بتاتی کیوں نہیں کہ کیا ہوا ہے تجھے؟ کہا بھی تھا کہ اکیلی پانی بھرنے نہ جایا کر۔''

''ماں!......'' بھاگ بھری آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''تو مجھے کیوں مارتی ہے...... میرے ساتھ ریشم' ناجو...... جمیماں سب تھیں مگر چوہدری منور نے سب کو بھگا دیا۔ وہ کہتا تھا...... وہ کہتا تھا......'' وہ اٹکی۔

''کیا کہتا تھا وہ مرن جوگا......'' کرمتے نے سانس روک کر پوچھا۔

''وہ کہتا تھا...... وہ کہتا تھا...... تو ہی منظور کی بہن ہے۔'' بھاگ بھری نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' کرمتے دہل کر بولی۔

''اس نے منظور کا نام کیوں لیا؟''

بھاگ بھری نے موٹی موٹی آنکھوں میں بھرے ہوئے شفاف موتی صاف کیے اور بولی۔ ''ماں...... جمیماں اور ناجو کہہ رہی تھیں کہ زیبو کو پاء منظور نکاح پڑھوانے لے کر گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ سارے گاؤں والے یہی کہتے ہیں۔''

''پھر تو نے کیا جواب دیا......؟'' کرمتے نے فق چہرے کے ساتھ کہا۔

''کہیں کوئی الٹی سیدھی تو نہیں بول آئی۔''

ہاجراں نے بھی دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے بولی۔ ''نہیں ماں! میں نے تو ان سے کہا کہ پاء منظور کوئی مولوی ہے جو دوسروں کے نکاح پڑھواتا پھرتا

ہے۔"

"اللہ اسے ستے خیراں رکھے۔" کرمتے نے زیرلب کئی بار کہا۔

ہاجراں متفکر سی ہو کر بڑبڑائی...... "منظور کی بھی بھلی پوچھی...... مفت میں دوسروں کی بلا سر ڈال لیتا ہے۔ اماں...... تم ہی اسے سمجھایا کرو نا۔"

"وہ کسی کی سنتا ہی کب ہے۔" ماں نے کچھ تشویش سے۔ کچھ پیار سے کہا اور تینوں اپنی اپنی لگن اور محبت کے رشتے میں بندھیں۔ منظور کے بارے میں سوچنے لگیں۔ جو اس چھوٹے سے گھر کے چند ہاتھ بھر کے آسمان کا چمکتا سورج تھا۔ جس کے چہرے کی ضیا سے ان کے کچے گھر کے در و دیوار روشن روشن سے رہتے تھے۔ جس کے دم سے گھر بھرا پرا محسوس ہوتا تھا۔

○......○......○

سجاول جیسے ہی گھوڑی باندھ کر پلٹا اس نے صحن میں کسی لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ ایک لمحے کو وہ ٹھٹک سا گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس کے من میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اس کے روئیں روئیں میں ایک انوکھی مسرت جاگ اٹھی۔ اسے اپنے کچے آنگن پر سرسوں کے کھیت کا گمان ہونے لگا۔ اسے اس جانی پہچانی انجان لڑکی کا دوپٹہ بسنتی رنگ میں رنگا ہوا نظر آنے لگا۔ سارا صحن جگمگاتے ہوئے ستاروں سے بھر گیا اور وہ لڑکی چاند کی طرح سب سے الگ اور ممتاز معلوم ہونے لگی۔ اسے یہ دیکھ کر خوشگوار سی حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے آ جانے سے اس کا عام سا کچا گھر کتنا خوبصورت اور نرالا معلوم ہونے لگا تھا۔

"چاچی...... چاچی......!" لڑکی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

مگر سجاول کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی صدا میں ترنم کا ایک جھرنا سا پھوٹا ہے۔ اس نے ایک اور حیرت بھری بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

"وہ لڑکی...... وہ تو وہی تھی...... بالکل وہی...... سردارے لوہار کی بیٹی رانی...... جس نے گاؤں کے مولوی صاحب سے اس کے ساتھ ہی قرآن پاک ختم کیا تھا۔ جس کا رنگین تصور نہ جانے کب سے اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ کہیں راستے میں' کنوئیں پر...... کھیتوں کے بیچ یا ندی کے گھاٹ پر ایک جھلک دکھا جاتی تو اس سے بات کرنے' اسے جی بھر کر دیکھنے' اس کے قریب ہونے کی ہٹیلی تمنا اس کے اندر ہلچل سی مچا دیتی۔ لیکن من کی یہ لہر...... روح کی یہ پکار اور دیوانے دل کی یہ معصوم سی ضد پوری کر دینے کی اسے ہمت نہیں

ہوتی تھی۔

"چاچی...... چاچی......! بھرجائی ہاجراں......! آپا بھاگ بھری......!" اس نے تیز گھبرائی ہوئی آواز میں ان سب کو پکار لیا۔ تاکہ اس کی آمد کا مقصد واضح ہو جائے۔ اور دزدیدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

سجاول اپنے جھلمل جھلمل کرتے خیالات سے چونکا۔ ماں' بھرجائی اور بہن میں سے گھر کوئی نہیں تھا۔ ہاجراں ہمسایوں کی طرف کسی کام سے گئی تھی اور ماں بھاگ بھری کے ساتھ گھڑے لے کر پانی بھرنے نکلی تھی۔ وہ گھر میں تنہا تھا اور اس کی سب سے پیاری آرزو کسی پری کی طرح چھن سے اس کے آنگن میں اتر آئی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر نہال ہو گیا تھا۔ اسے اس گھر میں' اس آنگن میں اتنے قریب سے دیکھنے کی جو آرزو اس کے دل میں کسی ننھے منے بیج کی طرح دبی ہوئی تھی ایک دم پھوٹ کر پھولوں سے لدے ہوئے پودے کی طرح بارآور ہو گئی تھی۔ وہ بغیر کچھ سوچے...... بغیر یہ طے کیے کہ گھبرائی ہوئی رانی سے کیا کہے گا...... ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چند قدموں میں ہی اس کے قریب آ گیا۔

وہ کچھ جھجک گئی...... کچھ سمٹی...... دو قدم پیچھے ہٹی...... چلے جانے کو پلٹی...... پھر ہچکچائی اور مڑ کر کن اکھیوں سے سجاول پر ایک چھپی ہوئی سی نگاہ ڈالی اور جاتے جاتے یوں رک گئی جیسے وہ خود بھی کسی تذبذب بھری کیفیت میں ہو۔ اس کی کوئی جھجکی سی' ادھوری اور چور سی شرمیلی نگاہ میں شناسائی ایک لمحے کو اس طرح چمکی کہ اجنبیت کا احساس جاتا رہا۔ سجاول کو اسے بے تکلفی سے مخاطب کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوئی۔

"تم...... تم رانی ہو نا...... رانی......" وہ بمشکل یہی بظاہر بے معنی لیکن حقیقت میں بے حد پر معنی فقرہ ہی کہہ سکا اور مسرت کے بے پایاں احساس سے اس کا سانس پھول گیا۔ یہی بات تو سب سے اہم اور بہت ہی پیاری تھی کہ وہ رانی تھی اور اس کے آنگن میں اچانک کسی خودرو پھولدار پودے کی طرح نمودار ہو گئی تھی اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

رانی نے مسکرا کر یوں اثبات میں سر ہلایا۔ جیسے اسے اپنے رانی ہونے پر بہت ناز ہو۔ وہ ابھی تک وہیں اسی انداز میں کھڑی تھی۔ جیسے جانے کو پلٹ رہی ہو۔ اس کے دلکش چہرے کا ایک رخ ہی سجاول کے پیش نظر تھا۔ وہ اس کے گلابی' ملائم رخسار پر کھلتے ہوئے شاداب سرخ گلاب کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اشتیاق سے دو ایک قدم اور آگے بڑھا کہ اس کے دلربا

چہرے کے روشن روشن جلوؤں کو سمیٹ سکے۔ اسے قریب سے اپنے مقابل...... اپنے روبرو دیکھے۔

رانی نے گھنیری پلکوں کو ایک شرمیلی سی جنبش دی۔ وہ اپنی پھولدار اوڑھنی کے ایک کونے کو یونہی اپنی انگلی پر لپیٹنے اور کھولنے لگی۔ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نکھرے اور سنہرے چنچل جذبوں نے ننھے شریر بچوں کی طرح ان دونوں کے گرد گھیرا سا ڈال لیا اور پکار پکار کر کہنے لگے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا ہے۔

ایک دوسرے کو پہچان کر دونوں گردوپیش کو بھول گئے۔ رانی کو کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ چاچی کرمتے کے پاس کیا لینے آئی تھی۔ سجاول کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ گھر میں کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔ وقت آج ان پر مہربان ہوا تھا۔ تو وہ ایسے ہی ان گنت سہانے لمحوں سے اپنی جھولیاں بھر لینا چاہتے تھے۔ وہ محبت کی شناخت کے اس امر لمحے کو چمکتے ہوئے جگنو کی طرح اپنی مٹھی میں قید کر لینا چاہتے تھے۔

پھر دروازے پر کسی کی آہٹ نے اس طلسم کو بکھیر کر رکھ دیا۔ دونوں ہی چونک گئے۔ رانی کچھ گھبرائی گھبرائی سی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اور سجاول پلٹ کر مویشیوں کے باڑے کی طرف چلا گیا۔ اسے گردوپیش نیا نیا سا معلوم ہونے لگا تھا۔ ان چند لمحوں میں ہی اس کی چھوٹی سی دنیا وسیع جہان میں بدل گئی تھی۔ جس کی ایک ایک شے اس کی اپنی تخلیق تھی۔ بڑی ہی دلفریب اور نرالی...... اپنی اپنی سی...... بالکل اپنی مرضی کے مطابق۔

وہ خود بھی جیسے ایک نیا سجاول بن گیا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ وجیہہ' دلیر اور جی دار...... اسے اپنے جیسا کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ رانی کی ایک نگاہ التفات نے اسے جیسے سب سے نمایاں' ممتاز اور منفرد بنا دیا تھا۔ اس کی نگاہ میں کوئی جچتا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک نوخیز لڑکے سے بھرپور گھبرو جوان بن گیا تھا۔

دروازہ کھلا اور منظور اندر داخل ہوا۔ وہ خلاف معمول جلد ہی گھر آ گیا تھا۔ وہ بیلوں کی جوڑی باندھنے کیلئے باڑے کی طرف آیا تو سجاول کو اسے دیکھ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

''خیر تو ہے پا منظور...... بہت جلدی گھر آ گیا تو۔''

منظور خوشدلی سے ہنسا۔ ''ہاں...... ہاں...... سب خیر ہے۔ آج نذیرے کی تیل مہندی ہے نا...... میں نے کہا اس کی طرف جا کر پتہ کروں۔ کوئی کام شام ہو تو......'' اس نے صحن پر نگاہ ڈالی۔ ''سب کدھر گئے ہیں...... کوئی بھی تو نظر نہیں آ رہا۔''

''بھرجائی تو شاید ہمسائے میں گئی ہے اور اماں آپا بھاگ بھری کے ساتھ پانی بھرنے۔''

سجاول نے اطلاع دی۔ اس کے دل میں اب بھی انجانی مسرت کے پھول سے کھل رہے تھے۔ وہ ان شادمان کلیوں کے چٹکنے کی صدا دور کہیں اکیلے میں سننا چاہتا تھا۔

''اماں پانی بھرنے گئی۔'' منظور نے تعجب آمیز ناگواری سے کہا۔ ''یہ ہاجراں کیوں نہیں چلی گئی...... بھاگ بھری کے ساتھ...... سجاول تو ہی دو چار گھڑے بھر دیا کر...... اماں کی یہ عمر تو نہیں ہے نا پانی بھرنے کی۔''

سجاول نے تائید میں سر ہلایا اور وہاں سے نکل جانے کو بولا۔ ''میں دیکھتا ہوں انہیں بس آتی ہی ہوں گی۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ ماں اور بھاگ بھری دروازے میں داخل ہوئیں۔

''اماں! میں تجھے ہی دیکھنے جا رہا تھا۔'' سجاول نے چھوٹتے ہی کہا۔

بھاگ بھری زور سے ہنس پڑی۔ ''واہ...... بڑا خیال ہے اماں کا۔''

سجاول چڑ کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ منظور بھی قریب آ گیا اور ماں کے سر سے گھڑا لے کر اترواتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ہی سجاول سے کہا تھا کہ پانی یہ بھرا کرے...... اماں تجھے تو نہ جانا پڑے گا۔''

ماں نے گیلے ہاتھ اپنی چادر سے خشک کئے۔ ''میں آپ بھاگ بھری کے ساتھ گئی تھی۔ لڑکی کی ذات ہے...... یہ اکیلی جاتی ہے تو مجھے فکر ہی رہتی ہے۔''

منظور نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا اور دبی زبان سے بولا۔ ''کیوں......؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے۔'' اس کے تیور کڑے تھے۔

''نہیں...... کسی نے کیا کہنا ہے...... تیرے ہوتے کسی کی ہمت ہے...... اللہ تجھے سلامت رکھے۔'' ماں نے جلدی سے جواب دیا اور بات بدلنے کو بولی۔ ''منظورے...... آج تو تو سویرے ہی گھر آ گیا ہے۔ خیر تو ہے۔ تیرا جی تو اچھا ہے نا۔''

''سب خیر ہے ماں...... بس بھوک بڑے زور کی لگ رہی ہے...... ماں تو گرم گرم روٹی کھلا دے تو میں ذرا نذیرے کی طرف ہو آؤں۔ آج اس کی مہندی ہے۔ میں اسی لئے جلدی گھر آ گیا ہوں۔''

''ماں صدقے......'' میں تجھے ابھی توے پہ روٹی ڈال دیتی ہوں۔ تندوری تپانے

میں تو ابھی وقت لگے گا۔'' ماں نے محبت سے کہا اور جلدی جلدی اپلوں کی آگ سے چولہا روشن کرنے لگی۔ منظور اس کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

ہاجراں بھی ہمسایوں کے یہاں سے آ گئی اور منظور کو گھر میں دیکھ کر ایک شاد کام سی حیرت میں ڈوب گئی۔ وہ تو شام ڈھلے اترتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ پرندوں کی طرح گھر آتا تھا۔ لیکن آج سورج کی سنہری کرنوں کے بیچ اسے آنگن میں بیٹھے دیکھنا کتنا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے آ جانے سے گھر کی فضا جاگ اٹھی تھی۔ اس کے ہونے سے ہر طرف ایک رونق سی ہو گئی تھی۔ اس کے دم سے در و دیوار روشن روشن سے نظر آتے تھے۔

وہ کھانا کھا کر ہاتھ صاف کرتا ہوا تھوڑی دیر آرام کرنے پچھواڑے کے چھوٹے کمرے میں آیا تو ہاجراں کو محسوس ہوا جیسے سورج آکاش سے اتر کر نیچی چھت والے اس نیم تاریک کمرے میں سما گیا ہے۔ اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ وہ دہلیز پر سے اس کے ساتھ ہو لی اور اس کے برابر چلتے ہوئے بولی۔

''منظورے! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''کیوں......؟ اچھا بھلا تو ہوں......میری طبیعت کو کیا ہونا ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''آج تو جلدی جو گھر آ گیا ہے۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ہنستی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ شگفتگی سے ہنس پڑا۔ ''تو نہ آیا کروں جلدی گھر......'' اس نے چھیڑا۔

ہاجراں نے مصنوعی ناراضی سے منہ بنایا۔ تجھے گھر یاد ہی کب رہتا ہے۔ کام کاج میں تو تو گھر بار......سب بھول جاتا ہے۔''

منظور نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ''جس دن تجھے بھول جاؤں اس دن کیا......اس دن......''

ہاجراں کے رخسار شہابی ہو گئے۔ وہ انداز سپردگی سے اپنا ہاتھ چھڑاتی ہوئی ناز آمیز اکھڑ پنے سے بولی۔ ''ذرا بھول کر دیکھ تو سہی......''

منظور نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ ہاجراں کے گلابی ہونٹوں سے مترنم ہنسی پھوٹنے لگی۔ وہ اس پر جھک کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چیخوں کی تیز آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔

منظور نے عجلت میں ہاجراں کو خود سے علیحدہ کیا۔ وہ گرتے گرتے بچی......شور کچھ اور

بڑھ گیا۔ منظور بدحواسی میں تڑپ کر اٹھا اور جوتے پہنے بغیر دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آنگن میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کا خون کھولا دینے کیلئے کافی تھا۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح ان دو ہٹے کٹے آدمیوں پہ جا پڑا جو سیاہ ڈھاٹوں میں چہرے چھپائے چٹے سفید دن میں بھاگ بھری کو گھسیٹ رہے تھے۔ وہ پوری قوت سے چیختی ہوئی اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

منظور دیوانہ سا ہو گیا......طیش اور جنون نے اسے کئی گنا زیادہ طاقت ور بنا دیا تھا۔ وہ دونوں آدمیوں پر بھاری پڑنے لگا۔ اس نے انہی میں سے ایک کی لاٹھی چھین لی اور وار پہ وار کرنے لگا۔

بھاگ بھری کے بال بکھر گئے تھے۔ اس کے کپڑے کہیں کہیں سے پھٹ گئے تھے۔ اس کی اوڑھنی قدموں تلے روندی جا رہی تھی۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ وہ خود کو آزاد کرانے کی کوشش میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

اچانک صحن کی دیوار پر سے فائر ہوا۔ گولی منظور کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور تیورا کر گرا۔ بھاگ بھری خود کو چھڑا کر پاگلوں کی طرح روتی ہوئی اس کی جانب لپکی لیکن ان میں سے ایک آدمی نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

منظور لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ اٹھ کر گرا۔ پھر اٹھا اور مجنونانہ انداز میں ان کے پیچھے لپکا لیکن سنبھل نہ سکا۔ وہ بار بار اٹھتا پھر گر پڑتا اور انہیں روکنے کی کوشش کرتا۔ اس کے جوان خون کی سرخ لکیر اس کے ساتھ ساتھ گھر کے دروازے تک بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

یہ کسی نے کیا کہا تھا؟

ماسٹر شکور نے پاگلوں کی طرح سوچا اور حیرت سے کہنے والے کی طرف دیکھا۔ جو اس کے مقابل کھڑا کہہ رہا تھا کہ منظور قتل ہوگیا ہے۔ وہ سکتے کے سے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر بے رحم کہنے والے نے بھاگ بھری کا نام بھی لیا اور اس کے بارے میں نہ جانے کیا کہا کہ وہ صحیح طور پر سن اور سمجھ نہیں پایا۔ نہ ہی اس نے سمجھنے کی کوشش کی۔ نہ اسے دہرانے کو کہا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اندھا دھند اپنے گھر کی سمت دوڑ پڑا۔

اسے گھر کا راستہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ نہ ہی اسے کچھ سجھائی دیتا تھا۔ وہ پیر کہیں ڈالتا تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ اس کے قدم اضطرار میں خود بخود اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کس طرف جا رہا تھا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ راہ میں سے کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

"ماسٹر شکور آگیا۔" کئی آوازیں آئیں۔

ہجوم میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ سہمی ہوئی آنکھیں ایک دوسرے کو خاموش اشارے کرنے لگیں۔ تاسف بھری نظریں ماسٹر شکور کو ہمدردی سے دیکھنے لگیں۔ لوگ ادھر ادھر ہٹ کر اس کے لئے راستہ خالی کرنے لگے۔ کچھ نے اسے سہارا دیا اور منظور کی خون میں ڈوبی ہوئی جوان لاش تک لے آئے۔

ہاجراں بلند آواز میں بین کر رہی تھی۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس نے چوڑیاں توڑ کر اپنی کلائیاں زخمی کر لی تھیں۔ وہ دیوانگی سے بال نوچتی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر منظور کا خون تھا۔ اس کی مانگ میں خاک اڑ رہی تھی۔ ماسٹر شکور نے خود کو لوگوں کی گرفت سے چھڑایا اور چیخ کر بولا۔

"نی ہاجراں!...... بھاگ بھری کدھر ہے؟" اس کی آواز انجانے اندیشوں سے لرز رہی تھی۔

مجمعے پر یکلخت سکوت چھا گیا۔ ہاجراں دھاڑیں مارتی اس کے گلے سے لگ گئی۔ نہ جانے وہ چیخ چیخ کر کیا کچھ کہتی رہی مگر ماسٹر شکور کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اس نے نفرت سے اسے پرے دھکیل دیا۔

"یہ رونے کا نہیں مر جانے کا مقام ہے۔" وہ غرایا۔

"منظور غیرت مند تھا۔ اچھا ہوا مر مک گیا۔" اس نے جیسے خود سے کہا۔

پھر ارد گرد تماشائیوں کی طرح کھڑے ہوئے لوگوں پر ملامت کی نگاہ ڈال کر بولا۔

"اب یہاں تماشہ دیکھنے کو کیوں مجمع لگا رکھا ہے۔ جب وہ میری لڑکی کو لے جا رہے تھے اس وقت تم میں سے یہاں کوئی نہیں پہنچا۔ جاؤ ڈوب مرو جا کر بے غیرتو۔"

وہ منظور کے خون میں سے چلتا ہوا صحن کی دوسری جانب گیا جہاں جانور بندھے تھے۔ اس نے عجلت میں گھوڑی کھولی۔ اچک کر اس پر سوار ہوا۔ اسے چابک پہ چابک رسید کرتا، سرپٹ دوڑاتا ایک جانب نکل گیا۔

اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بھی رفتہ رفتہ معدوم ہوگئی تو وہاں کھڑے لوگوں نے جھکے ہوئے سر اٹھائے۔ ماسٹر شکور نے ان کے منہ پر کالک مل دی تھی۔ ان سے نگاہ اٹھانے کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بھی نظریں چرا رہے تھے۔ بہت کم لوگوں نے ایک دوسرے سے بات کی۔ کسی میں کچھ کہنے کی تاب ہی نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے۔

کچھ جوشیلے نوجوانوں نے ماسٹر شکور کا پیچھا کرنے کی ٹھانی اور اپنے اپنے گھوڑے لینے کو لپکے۔ عورتوں میں سے کسی نے کرمتے کو جھنجھوڑا جو چولہے کے پاس دیوار سے لگی خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے حیران چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی وحشت زدہ آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں۔

"اٹھ ہوش کر کرمتے۔ تیرا تو سارا گھر گھڑیوں میں اجڑ گیا۔"

کرمتے ایک جانب لڑھک گئی۔ دوسری عورتوں نے اسے بڑھ کر سنبھالا۔ کچھ نے اس کی نبضیں ٹٹولیں۔ کچھ نے دل پر ہاتھ رکھا۔ پھر کسی نے بین کے انداز میں چیخ کر دہائی دی۔

"ہائے۔ ہائے نی۔ کرمتے بھی اپنے پتر کے ساتھ ہی ٹر گئی۔"

ماسٹر شکور کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ظلم و بربریت سے بھری ہوئی اس دنیا میں وہ نہ جانے کہاں بھٹکتا پھرتا تھا۔ گھر کے در و دیوار پر وحشت برستی تھی۔ کل تک جس کی گرم اور مانوس فضا جاگتی تھی آج وہاں قبرستان کا سا ہولناک سناٹا تھا۔ کل جہاں منظور کے زندہ قہقہے ہاجرہ کی رسیلی ہنسی میں گھل مل کر گیت سا بن جاتے تھے۔ آج وہاں ہاجرہ کی دلدوز ہچکیاں سنائی دیتی تھیں۔ ماں کی ممتا بھری شبیہ فضا میں کہیں تحلیل ہو گئی تھی۔ بھاگ بھری کی آواز سننے کو کان ترس گئے تھے۔

سجاول کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ اس نے کھلی آنکھوں سے ایک ایک چیز کو لٹتے اور تباہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے سکھ کو رخصت ہوتے ہوئے آپ دیکھا تھا۔ اس کے حواس مختل ہو گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ اس پہ کیا گزری ہے۔ وہ تو بھرے پرے خوشحال کنبے کے ساتھ سویا تھا لیکن آنکھ کھلی تو خود کو تنہا پایا۔

پیہم حادثات نے اسے سہا دیا تھا۔ وہ جیسے مفلوج سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ایسی چپ لگی تھی جیسے اس کے اندر کوئی جذبہ، کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ یا اس گھر سے، اس واقعے سے، گرد و پیش سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

ہاجرہ نے کئی بار اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑا تھا۔ اسے بے غیرتی کے طعنے دیئے تھے۔ اسے بدلہ لینے کی قسمیں دیں تھیں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں پڑا نہ جانے کیا سوچتا رہتا تھا۔ ہاجرہ آتے جاتے، اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کوئی زہر بھرا فقرہ اس کی جانب یوں اچھال دیتی جیسے اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔

''لخ لعنت ہے۔ تیری اوقات پر۔ گھر میں گھسا بیٹھا ہے۔ تو چوڑیاں بھی پہن لے۔''
پورا پنجہ اس کی جانب لہرا کر وہ حقارت سے کہتی۔

''بھائی کا درد نہیں تو بہن کی غیرت کھا۔ جا ڈوب مر کہیں جا کر۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے۔''

سجاول سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ نہ ہی کسی ردعمل کا اظہار کرتا۔ بس خاموش بیٹھا اس کے طعنے یوں سنتا رہتا جیسے سماعت سے محروم ہو۔ جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو۔ گاؤں کے لوگ اس کے حالت دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ اس کے ہمدرد کڑھتے تھے۔ اکثر کا خیال تھا کہ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ اس حادثے نے اسے گم صم کر دیا تھا۔

ہاجرہ ہر لمحے انتظار کی جان لیوا کیفیت میں جلتی بجھتی رہتی۔ راہ تکنے کی بے چینی اس

کے انگ انگ میں دوڑتی پھرتی۔ وہ ہر رات سوچتی کہ نئی صبح طلوع ہو گی تو ماسٹر شکور بھاگ بھری کو لے کر گھر آ جائے گا۔ دن ڈھل جاتا تو وہ خود کو ڈھارس دیتی کہ شام سے پہلے ماسٹر شکور ضرور آ جائے گا اور گاؤں والوں سے منظور کے خون کا حساب مانگے گا۔

وہ ہر صبح ایک نئی امید باندھتی اور ہر شام اس آس کے ٹوٹ جانے کا ملال سہتی۔ وہ چڑ جاتی۔ وہ پریشان ہو جاتی۔ اس کے سارے وجود میں آگ سی لگ جاتی۔ جب اس طیش اور ملال کے نکاس کا کوئی راستہ نہ ملتا تو وہ سجاول پر برس پڑتی۔ اسے کٹنے کٹنے کوسنے سناتی، بے غیرتی کے طعنے دیتی۔ اس کی بے حسی پر لعنت بھیجتی۔

اس کا بس چلتا تو منظور کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب چکاتی۔ اپنی ہنستی بستی دنیا کو اجاڑنے والوں کو نیست و نابود کر دیتی۔ اپنی مانگ میں راکھ بھر دینے والوں کو راکھ کر دیتی لیکن وہ اکیلی بے بس عورت تنہا کیا کرتی؟ کس طرح کرتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی اور کڑھتی رہتی۔ سجاول کی غیرت جگاتے جگاتے وہ خود نڈھال ہو گئی تھی۔ مگر وہ تو برف کا ایسا ڈھیر تھا جس میں انتقام کی کوئی چنگاری نہیں پھوٹتی تھی۔

رفتہ رفتہ گاؤں والے ماسٹر شکور کو بھول گئے تھے۔ بھاگ بھری کی تلاش میں وہ ایسا نکلا تھا کہ گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔ اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ غیرت اسے کھا گئی ہے اس نے خودکشی کر لی ہے یا کہیں منہ چھپا کر بیٹھا ہے۔ اس کے پلٹ آنے کی امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔

پولیس نے بھی اس کیس میں کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ شروع میں تھانیدار نے جلد جلد گاؤں کے پھیرے کئے تھے۔ بیانات لئے تھے، گواہیاں ہوئیں لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں تھا۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے لیکن کسی کو اشارہ کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ کوئی گواہی دے کر اپنی جان عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ بھاگ بھری کے بارے میں یہی مشہور کر دیا گیا تھا کہ اسے اس کے آشنا نے اغواء کیا تھا جسے اس کے گھر والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

۞......۞......۞

ایک روز رانی ادھر ادھر دیکھتی، محتاط قدم دھرتی۔ ہولے ہولے گھر کے صحن میں داخل ہوئی تو ہاجرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں منہ ڈھانپے پڑی تھی۔ گھر میں ایک کربناک سی خاموشی تیرتی پھرتی تھی۔ ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا صحن کے ایک گوشہ میں

نیم کا پیڑ اداس کھڑا تھا جس کے تلے جھلنگا سی چارپائی میں سجاول گٹھڑی بنا لیٹا ہوا تھا۔

رانی ٹھٹک گئی۔ شوخ اور ہنس مکھ سجاول کس طرح ایک دکھ میں ڈھل گیا تھا۔ چلبلا اور متحرک سجاول جیسے خاموشی اور سناٹے میں زندہ دفن ہو گیا تھا۔ ہمدردی اور دکھ کی ایک شدید چبھن نے رانی کی خوبصورت بادامی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔ سجاول کے ناطے اسے یہ گھر کتنا پیارا ہو گیا تھا۔ اس کے ذرے ذرے میں اسے محبت کا لمس اور چاہت کی خوشبو محسوس ہوتی تھی مگر اب یہاں چاروں طرف دکھ کے بادل اور غم کے سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ سوگوار اور مغموم سی ہولے ہولے چلتی قریب آئی۔ آہٹ کے باوجود سجاول نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا نہ ہی اس نے کوئی جنبش ہی کی۔ بس چپ چاپ اسی طرح پڑا رہا۔ رانی نے محتاط سے لہجے میں پکارا۔

''سجاول!'' اس کا نام لیکر دکھوں کی تڑپ دل میں سوا ہو گئی۔ جس نے اس کی آنکھوں سے بھرے ہوئے آنسوؤں کو رخساروں پر بہا دیا۔ گٹھڑی بنے ہوئے سجاول کے سراپے میں حرکت ہوئی۔ رانی ایک قدم اور آگے بڑھی اور ذرا سا جھک کر پھر اسے پکارا۔

''سجاول!'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

سجاول نے چہرے سے بازو ہٹا کر اس کے دکھ سے سنولائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رانی نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''ہائے وے سجاول یہ سب کچھ کیا ہو گیا؟''

سجاول کو محسوس ہوا جیسے اس نے صدیوں بعد کوئی انسانی آواز سنی ہے۔ ہمدردی اور دکھ سے لبریز۔ اپنائیت سے بھری ہوئی۔ اس کا دکھی دل آپ سے آپ پگھلنے لگا۔ رانی کی محبت بھری آواز میں اسے سب اپنوں کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی ذات میں کتنی ہی محبتوں کا عکس تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے قطرہ قطرہ بہتے آنسو اس کی خاطر بہہ رہے تھے۔ سجاول کو محسوس ہوا جیسے وہ بھی ایک آنسو بن کر رانی کے ملگجے دامن میں جذب ہو جائے گا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

رانی بے حد پریشان کھڑی اضطرار میں ٹوٹے پھوٹے جملے کہہ رہی تھی۔

''ہا ہائے یہ کیسا اندھیر ہو گیا۔ سجاول......! ہائے میں مر جاؤں۔ یہ کیسا گھر کا گھر اجڑ گیا۔ ہائے میرے مولا۔ اب کیا ہو گا؟''

سجاول سر جھکائے بیٹھا ہونٹ چباتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ابھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گا۔ جیسے ابھی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ پگھل کر رہ جائے گا۔ اس نے زور سے سر کو کئی بار جھٹکا۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پاؤں میں جوتیاں اٹکاتے ہوئے بولا۔

''رانی تو یہاں کھڑی کیوں رو رہی ہے۔ جا اپنے گھر جا۔ یہاں اب تیرے لئے کچھ نہیں ہے۔''

رانی دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا تیز قدموں سے بگولے کی طرح اس کے برابر سے نکل گیا۔

''ہوں۔'' گھنی مونچھوں والے پہلوان نما انسان نے گلے میں پھنسی ہوئی آواز میں لمبی سی ہوں کی اور سر ہلا کر بولا۔

''اچھا۔ تو یہ قصہ ہے۔''

''ہاں جی۔'' سجاول جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ زوردار تھپڑ نے اس کی زبان دانتوں تلے دبا دی۔ وہ بری طرح بوکھلایا۔ بھونچکا سا رہ گیا۔ انگلیوں کے نشان اس کے رخساروں پر ابھر آئے۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک اور بھرپور ہاتھ نے اس کا منہ پھیر دیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا اور آنکھوں کے سامنے شرارے سے ناچ رہے تھے۔ وہ کسی تیسرے حملے کی توقع کر ہی رہا تھا کہ پہلوان زور سے ہنس پڑا۔ اس کا قہقہہ کمرہ میں چاروں طرف گونجنے لگا۔ سجاول کا ہاتھ کھینچ کر اس نے اسے قریب ہی بٹھا لیا اور ہنستے ہوئے بولا۔

''بس کا کا اتنا ہی دم تھا تو تو دو چوٹوں میں ہی اپنا آپ بھول گیا۔''

سجاول کچھ نہیں سمجھ پایا۔ زناٹے دار تھپڑوں سے اس کی کنپٹیاں سنسنانے لگیں اور آنکھوں کے سامنے شرارے سے رقص کرنے لگے۔ اردگرد بیٹھے ہوئے اس کے ہم عمر لڑکے اس کی حالت پر بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ استاد نے انہیں ڈانٹ کا خاموش ہو جانے کو کہا اور ایک لڑکے سے بولا۔

''اوئے بھولے۔ ٹھنڈائی کا ایک گلاس لا کر لڑکے کو پلا تا کہ اس میں روح بھرے۔''

''استاد جی۔ یہ تو لغا گیا۔'' وہ آنکھ دبا کر مسکرایا اور جگ میں سے بادام ملا ہوا دودھ

ایک لمبے بھدے گلاس میں ڈال کر اسے تھما دیا۔

سجاول کا حلق خشک تھا۔ اس کے اندر پیاس ہی پیاس تھی لیکن اسے پینے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ استاد نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے پی جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک ہی سانس میں پورا کا پورا گلاس خالی کر گیا۔

قدرے سنبھل کر اس نے گردوپیش میں دیکھا۔ لڑکے ہنستی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ استاد کے چہرے پر نرمی تھی۔ سجاول کے حواس بحال ہوئے اس کے دل پر چھائی ہوئی خوف کی کیفیت چھٹنے لگی۔ استاد نے دھپ سے اپنا بھاری ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور چربی میں دھنسی ہوئی شکرے جیسی تیز آنکھوں سے اس کی جانب تکتا ہوا بولا۔

''کاکا! تجھ سے تو تھپڑ بھی ہضم نہیں ہوئے تو آگے جا کر کیا کرے گا۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ سمجھا تو۔ ایک مرتبہ پھر سوچ لے۔''

سجاول ہچکچا گیا۔ اس کا شانہ پہلوان کی مضبوط گرفت میں تھا۔ وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ متذبذب سا ہو گیا۔ وہ فیصلہ جو اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد کیا تھا اس پر قائم رہنا بہت دشوار سا معلوم ہونے لگا۔ اس کی فطری شرافت اسے لوٹ جانے پر مجبور کرنے لگی۔ ماسٹر شکور کا شریف خون جو انتقام کی آگ میں لاوا بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا یک لخت سرد ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے شانے سے استاد کا ہاتھ اٹھا کر یہاں سے بھاگ جائے اور اپنے گھر پہنچ کر ہی دم لے لیکن گھر کے خیال کے ساتھ ہی اسے اس کا اجڑا آنگن اور سونے درودیوار یاد آ گئے جو اسے گھائل سا کر گئے۔

استاد بڑے غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ، تذبذب کی کیفیات اور ہچکچاہٹ کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتا رہا۔ اس نے ایک بار زور سے اس کا شانہ ہلایا اور بردباری سے بولا۔

''دیکھ جوان! اچھی طرح سوچ لے۔ ہم نے ایک دفعہ تجھ پر محنت کر لی تو پھر نکلنے کا راستہ نہ ڈھونڈنا۔ سوچ لے۔ پھر سوچ لے ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔''

سجاول کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ وہ متضاد جذبوں کی آویزش میں پس کر رہ گیا۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا سوچے، کیا سمجھے، استاد کو کیا جواب دے؟ اس راہ کو چن لے یا پیچھے ہٹ جائے۔ ڈیرے پر موجود دوسرے لوگ بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے اپنی اس ہچکچاہٹ اور تذبذب پر بڑی ندامت ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں

یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ دوسرے لوگ اسے بزدل سمجھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ مگر پھر بھی اس کے لئے کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا دشوار سا ہو گیا تھا۔

استاد نے پھر ایک بار پوچھا۔ تو وہ جیسے اپنی خجالت مٹانے کو صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

''استاد جی! میرا باپ بڑا شریف آدمی ہے۔''

استاد نے زوردار قہقہہ لگایا۔ دوسرے لڑکے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر یوں ہنسے جیسے اس نے کوئی دلچسپ لطیفہ سنا دیا ہو۔ ان قہقہوں سے بیٹھک کے درودیوار گونجنے لگے۔ ان میں سے کوئی بڑے تمسخر سے بولا۔

''واقعی یار! تیرا پیو شریف آدمی تھا جو تجھے بہن کی نہیں شرافت کی فکر ہے۔''

یہ طعنہ سجاول کے سارے وجود کو چھید گیا۔ وہ آگ بگولہ ہو کر اٹھا اور لپک کر اس لڑکے کا گریبان پکڑ لیا اور بے تحاشہ گالیاں بکتے ہوئے دھاڑا۔

''الو کے پٹھے۔ بہن کا نام لیا تو تیری زبان کھینچ لوں گا۔''

دوسرے لڑکے اٹھ کر بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ استاد کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے سجاول کا کرتا پکڑ کر کھینچا۔

''اوئے سجاولا! بس کر۔ بڑی ہو گئی۔ تیری جی داری نے دل خوش کیا ہے۔ آج سے تو اپنا شاگرد ہے۔ لا اوئے پپو۔ گڑ۔ سب کا منہ میٹھا کرا۔''

''سجاول!'' اسے ناشتہ کراتے ہوئے ہاجرہ نے ایک عرصے بعد اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ سجاول نے لسی کا گلاس منہ سے ہٹایا اور اس کی طرف دیکھا اور لمحے بھر کو دیکھتا ہی رہا۔ اس حادثے نے اسے کتنا بدل دیا تھا۔ اس کا دہکتا ہوا گلابی رنگ سرسوں کی زردی میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے سوگوار چہرے پر کرب کی جابجا لکیروں نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

وہ لہو کے گھونٹ پیتے ہوئے بولی۔

''سجاول! ہم کب تک یوں ہاتھ باندھ کر پڑے رہیں گے۔ تو...... تو کچھ نہیں سوچتا۔ تجھے کچھ خیال نہیں آتا۔ کچھ......'' شدت جذبات میں وہ بات بھی پوری نہیں کر سکی اور بے دردی سے ہونٹ چبانے لگی۔

"بھرجائی۔ تو فکر نہ کیا کر۔" سجاول نے گلا صاف کر کے کہا۔ "ذرا وقت آ لینے دے پھر دیکھنا۔"

"کون سا وقت!" وہ تڑخ کر بولی۔ "جب دنیا والے طعنے مہنے دے دے کر ہمیں مار ڈالیں گے اور کون سے وقت کی اڈیک ہے تجھے۔"

سجاول کچھ نہیں بولا۔ وہ اس کے ساتھ تکرار کر کے اسے اور مشتعل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دکھی عورت تھی۔ وہ اسے اور دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تقدیر کے ہاتھوں ستائی ہوئی تھی۔ اسے وقت کی مصلحتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھ کر وقت کو ہاتھ میں لے لینا چاہتی تھی۔ اس کے جواب کے انتظار میں اسی نے کئی بار سجاول کی طرف دیکھا۔ مگر وہ چپ چاپ ناشتہ کرنے میں لگا رہا۔

ہاجرہ کو ضبط کرنا محال ہو گیا۔ اس نے غصے سے دانت کچکچائے۔

"تو دفع کیوں نہیں ہو جاتا یہاں سے کمینے! تو بھی بابے کی طرح کسی پاسے منہ کر لے۔ تجھے تو نہ بھائی کا دکھ۔ نہ بہن کی غیرت۔ تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے لاروں پر منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھی رہوں گی۔ تیری طرح ہاتھ پیر توڑ کر لوگوں کے مہنے سہتی رہوں گی۔ میں منظور کے خون کا بدلہ لے کر رہوں گی۔ میرا نام بھی ہاجرہ نہیں جو۔"

"کیا چڑ چڑ لگائی ہوئی ہے بھرجائی۔" سجاول نے غصے سے اس کی بات کاٹی۔

"ایک پہلے ہی کون سا سکھ میں ہوں جو تیرے طعنے سانس نہیں لینے دیتے۔ تجھے کیا پتہ کہ میں کس طرح دن گزار رہا ہوں۔ میں کس کس طرح مر مر کے جیتا ہوں۔ تو تو بدلہ بدلہ کا شور مچاتی رہتی ہے۔ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کسی پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے نا۔ کیا ثبوت ہے ہمارے پاس کہ اس واردات میں جاگیرداروں کا ہاتھ ہے۔ ان کے مقابلے میں کون ہمارا ساتھ دے گا۔ کون گواہیاں بھرے گا؟ تو سمجھتی ہے کہ میں بھول گیا ہوں۔ میں تو وقت دیکھ رہا ہوں۔ ایک ایک سے گن گن کر بدلے نہ لئے تو کہنا۔"

"تو ٹکے ٹکے کی باتیں ہی کرتے رہنا اچھا۔" وہ حقارت سے بولی۔

سجاول بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ناشتہ ادھورا ہی چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ہاجرہ حسب عادت اسے کوس کوس کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرنے لگی۔ وہ اس کی آواز کی پہنچ سے دور نکلنے کے لئے اپنی کوٹھڑی میں گھس گیا۔

O......O......O

"اوئے منڈیا۔ اتار دے سجاول کو۔ چل اٹھ۔" استاد نے بالوں سے بھرے ہوئے بازو پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔

دو لڑکے ایک دوسرے کو چھیڑتے، الجھتے اٹھے اور ساتھ کی کوٹھی میں الٹے لٹکے ہوئے سجاول کو کھولنے لگے۔ رسیوں کی گرہیں کھول کر دونوں نے اسے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ ایک نے اس کے شانے پہ دھپ جمائی۔

"کیوں استاد! قائم ہونا؟"

سجاول نے دانت بھینچ لئے۔ اس میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ جسم کا سارا خون جیسے آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے شرارے سے ناچ رہے تھے لیکن اس نے اف بھی نہیں کی۔

وہ گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھا۔ اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر ماسٹر شکور اس پر ہاتھ اٹھاتا تو ماں ڈھال بن جاتی۔ بھاگ بھری اسے اپنی گود میں چھپا لیتی یا منظور معاملہ رفع دفع کرا دیتا مگر وہ پھر بھی ماں کے گھٹنے سے لگا بسورتا رہتا۔ ماں اسے پچکارتی، چمکارتی تو وہ ممتا کی شاداب پھوار میں بھیگ جاتا۔ وہ ماسٹر شکور کو کوستی ہوئی اسے پیار کرتی جاتی اور مکھن اور شکر کے ساتھ اسے نوالے بنا بنا کر کھلاتی تو اس کی تسلی ہو جاتی۔ ممتا کی مٹھاس اس کے انگ انگ میں گھل جاتی۔

مگر اب وہ تنہا سب کچھ سہتا تھا۔ منہ سے ایک حرف نہیں نکالتا تھا۔ ماں کا نام کئی بار اس کے لبوں پر آتا لیکن وہ ہونٹ بھینچ لیتا۔ اس نے سارے سکھ، سارے چین بھلا کر استاد کا سکھایا ہوا سبق یاد کر لیا تھا۔ وہ پتھر کی طرح بے حس بن گیا تھا۔ وہ استاد کے کہے پر مشین کی طرح عمل کرتا تھا۔

اس کا ایک ایک عضو جیسے فولاد میں ڈھل گیا تھا۔ اس کا جوڑ جوڑ دھات کا بن گیا تھا۔ اس کا پور پور چٹان کی طرح سنگین تھا۔ وہ گھنٹوں مار کھا سکتا تھا۔ پہروں الٹا لٹک سکتا تھا۔ پانی میں غوطے کھا کر بھی وہ ہشاش بشاش رہتا تھا۔ اس نے خود میں برداشت کی اتنی قوت پیدا کر لی تھی کہ وہ صبر و ضبط کے ان مرحلوں سے اف کئے بغیر گزر جاتا تھا۔

آج اسے استاد نے معمول سے زیادہ دیر الٹا لٹکائے رکھا تھا۔ اس لئے جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو اسے زمین گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ آنتیں جیسے منہ کو آ رہی تھیں لیکن اس نے دونوں لڑکوں پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا استاد کی

بیٹھک میں آ گیا۔

استاد نے اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا اور ایک لڑکے سے بولا۔

''چل اوئے کاکے۔ سجاول کے لئے گرم گرم دودھ لا۔ دو چمچ گھی بھی ڈال کر لانا۔''

''ذرا جلدی آ۔'' سجاول نے ہانک لگائی اور اپنی آنکھوں کو مل کر گرد و پیش صاف طور پر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

استاد نے اس کی پشت پر دھپ جما کر اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو وہ سنبھل کر زندہ دلی سے بولا۔

''استاد جی! آج تو مجھے الٹا لٹکا کر تم نے چمگادڑ ہی بنا دیا۔''

دوسرے لڑکوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ استاد بھی محظوظ ہوا اور ایک غلیظ سی گالی اگل کر بولا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں۔ پلسئے تو نامراد الٹا لٹکا کر ناک میں مرچوں کی دھونی دیتے ہیں۔ پھر تو کوئی مرد کا بچہ ہی ہوتا ہے جو نہیں بکتا۔''

''بلکہ وہ کچھ بھی بک دیتا ہے جو اس نے نہیں کیا ہوتا۔'' سجاول نے ہنس کر اس کی بات مکمل کی۔

استاد نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ اس کا بھاری پیٹ دیر تک تھل تھل کرتا رہا۔

''ان پولیس والوں کی کیا مجال کہ ہمارے بندے کو ہاتھ لگا جائیں۔ مال لگاتے ہیں ان کو مال۔ نہیں تو یہ سگے باپ کو نہیں چھوڑتے۔''

''استاد جی! بس تمہاری یہ ذمہ داری کہ قانون میری راہ نہ روکے۔ میں دل کے سارے ارمان نکال لوں تو پھر چاہے پھٹے لگ جاؤں۔ پروا نہیں۔'' سجاول جوشیلے انداز میں بولا۔ اس کے چہرے پر ایسی بے تابی اور پیچ تھی جیسے کوئی بڑا منصوبہ بنا رہا ہو۔

''غم نہ کر کاکا!'' استاد نے بے فکری کی ترنگ میں اسے حوصلہ دیا۔

''اپنے رب سوہنے نے چاہا تو ایک ایک کی الٹی کھال اتاریں گے۔''

سجاول کو جیسے تسلی ہو گئی۔ اس کے دل سے بھاری بوجھ ہٹ گیا وہ ان دیکھے اندیشے جو اس کے پاؤں کی زنجیر تھے رفتہ رفتہ پس منظر میں چلے گئے۔ وہ پہلے کی نسبت اور دلیر ہو گیا۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ اسی جذبے میں سرشار دل ہی دل میں بہت کچھ سوچتا گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔

اپنے آپ میں الجھا ہوا۔ ایک نئے راستے کو دیکھتا ہوا وہ چلا جاتا تھا کہ کسی نے اس کا دامن تھام لیا۔ وہ رک گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

رانی اس کے مقابل تھی۔ اس کی روشن بادامی آنکھوں میں اس کا اپنا عکس جھلک رہا تھا۔ اس کا چاند ایسا چہرہ اس کی محبت سے چھلکتی نگاہوں کا والہانہ پن اس کی اکتائی ہوئی بے آب و گیاہ زندگی کو ٹھنڈے اور خنک موسم میں بدل دیتی تھی۔ اس کی بھیگتی ہوئی دلکش شربتی آنکھوں کے سامنے دنیا کی ہر شے ہیچ نظر آتی تھی۔

سجاول نے دیکھا۔ اس کے ترشے ہوئے گلابی لب کچھ کہنے کیلئے لرز رہے تھے لیکن وہ کچھ کہہ نہیں پاتی تھی۔ وہ بھی چپ رہا اور استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب تکتا رہا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ دے۔ اپنے دل کی میٹھی بات سے اس کی زندگی میں گھلے ہوئے کرب کو ہلکا کر دے۔

''سجاول!'' وہ دھیرے سے گنگنائی۔ اس کے ہونٹوں کی آنچ نے اس کے نام کو سلگا دیا۔ اسے اپنی بچھڑی ہوئی محبتیں شدت سے یاد آئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے اسی طرح پکارتی رہے اور اس کے زخم ایک ایک کر کے بھرتے رہیں۔ اس کی ویران دنیا میں وہی ایک تو رہ گئی تھی جو اس کا نام لیکر اسے زندگی کا احساس دلاتی تھی۔

رانی نے سر جھٹکا اور پیار بھری خفگی سے بولی۔

''سجاول! تو تو کبھی ملتا ہی نہیں۔'' شدت جذبات نے اس کی خوبصورت آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔ سجاول نے ان آنسو بھری بادامی آنکھوں کو دیکھا اور زندگی کی تمام تلخیاں بھول گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما اور محبت سے چھلکتے لہجے میں بولا۔

''تو آج مل لے نا۔ دل بھر کے۔''

''ہاجراں! ہاجراں! نی ہاجراں۔'' بیگاں بھٹیاری ہاجرہ کو پکارتی ہوئی صحن میں داخل ہوئی۔

''آ جا ماسی۔ ادھر لنگ آ۔'' ہاجرہ نے آٹا گوندھتے ہوئے وہیں بیٹھے بیٹھے پکارا اور لمبے چوڑے صحن کے اس پار بیگاں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا چمکتا ہوا ڈول تھا اس کے بوجھ سے جھکی ہوئی وہ ہانپتی کانپتی چلی آتی تھی۔

ہاجرہ کو اسے دیکھ کر جیسے تسلی سی ہو جاتی تھی۔ وہ دو گھڑی اس کے پاس آ بیٹھتی۔ اس

کے دکھ سن لیتی۔ ہمدردی کے دو میٹھے بول سنا جاتی تو ہاجرہ وقتی طور پر بہل جاتی تھی۔ جلے دل کے پھپھولے اس کے سامنے پھوڑ کر وہ دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی۔

حیات اس پر عذاب ہو گئی تھی۔ زندگی مسلسل کرب بن گئی تھی۔ اس کے دکھ کی دوا کسی کے پاس نہیں تھی۔ کسی کے پاس ہمدردی کا ایک لفظ نہیں تھا۔ کوئی دکھ بٹانے والا' غم بانٹنے والا' دلاسا دینے والا نہیں تھا۔ منظور نے اسے بالکل اکیلا کر دیا تھا۔

اس کے میکے میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے پناہ دے دیتا۔ وہ اس دہلیز پر ڈولی سے اتری تھی۔ اسی دہلیز سے اس نے زندگی کی ڈور باندھ لی تھی مگر اس کی مضبوط چھت بھی ڈولنے لگی تھی۔

میلی نظروں نے بند دروازے میں چھید ڈال دیئے تھے۔ بھوکی آنکھیں ہر وقت اس کے در و دیوار کو چاٹتی رہتی تھیں۔ اس کی اجڑی مانگ ہر ایک کیلئے تماشا تھی۔ ماسٹر شکور کی گمشدگی، سجاول کی کم عمری اور لاتعلقی دوسروں کے لئے شہ بن گئی تھی۔ گاؤں کے اوباش اسے دیکھ کر فقرے کستے اور بولیاں مارتے تھے۔ عورتیں کہیں ملتیں تو ان کی مشکوک نظریں معنی خیز سوال کرتیں۔ ہمدردی کا اظہار کرنے کے بہانے وہ فقرے کستیں۔ بھاگ بھری کا ذکر کر کر کے وہ جیسے اسے طعنے دیتیں۔ اسی لئے ہاجرہ نے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ اشد ضرورت کے بغیر وہ کسی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی تھی۔ صرف ایک بیگاں ہی تھی جو اپنوں کی طرح اس کے دکھ سکھ میں شریک رہتی تھی۔

''ہائے نی کڑیئے۔'' بیگاں ہانپتی ہوئی قریب آ گئی۔

''تیرے وہڑے میں تو بڑی چلائی ہے۔ میرے گٹے گوڈے رہ جاتے ہیں۔'' اس نے پیتل کا چمکتا ڈول ہاتھ سے رکھا اور خود کمر پکڑ کر نزدیک ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

ہاجرہ نے دیکھا کہ ڈول لسی سے بھرا ہوا ہے جس پر مکھن تیر رہا ہے۔ ہاجرہ نے گوندھا ہوا آٹا برتن میں ڈالتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''یہ لسی کہاں اٹھائے پھرتی ہے ماسی؟''

''تیرے لئے لائی ہوں دھیئے۔'' اس کا سانس اب بھی تیز چل رہا تھا۔ ''میری تو مت ماری گئی یہ ڈول اٹھا اٹھا کر۔''

''کہاں سے لائی ہے ماسی! میں نے کب تجھے لسی لانے کیلئے کہا تھا۔'' ہاجرہ خفگی سے بولی۔

''مجھے پتہ ہے دھیئے۔ یہ ماسٹر صاحب کا گھر ہے۔ میں جانتی نہیں کہ وہ کیسے آن والے بندے تھے۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ یہ تو چوہدری نواز کی گھر والی نے آپ بھیجی ہے۔'' وہ جیسے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔

''کیوں؟'' ہاجرہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''کیوں۔'' بیگاں نے حیرت سے دہرایا۔

''لے بھلا اپنی عزیز داری میں دیتے لیتے نہیں۔''

''وہ ہمارے کب سے عزیز ہو گئے۔ ان کا کون سا ناطہ ہے ہمارے ساتھ۔'' ہاجرہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''کڑیئے۔ تو تو ایسے ہی لال پیلی ہو رہی ہے۔ چوہدری نواز تو منظور کا یار بیلی ہے۔ دونوں نے پانچ جماعتیں اکٹھی پاس کی تھیں۔ بچارا بہت یاد کرتا ہے منظور کو۔ اسے بڑا دکھ ہے۔ ہاتھ ملتا ہے وہ۔''

منور کے ذکر پر ہاجرہ کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چھلک آئے لیکن وہ ضبط کر گئی اور تلخی سے بولی۔

''اسے دکھ ہے تو کچھ کر کے دکھائے۔ نرے ہاتھ ملنے کا کیا فائدہ۔ وہ منظور کا یار ہے تو آگے کیوں نہیں آتا۔ اس کا دوست ہے تو اس کے قاتلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے آزاد پھرتے کس طرح دیکھ رہا ہے۔ اللہ منظور کے قاتلوں کو خوار کرے۔ وہ کالے منہ والے جس دن پھٹے چڑھیں گے میرے کلیجے میں تو اسی دن ٹھنڈ پڑے گی۔''

بیگاں چارپائی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور بڑی رازداری سے بولی۔

''ہاجراں۔ چوہدری نواز کہتا ہے کہ اگر ہاجراں عدالت میں بیان داخل کر دے تو بڑا کچھ ہو سکتا ہے۔ بڑا کچھ۔''

''ہیں؟'' ہاجراں چونکی۔ ''کس طرح؟'' وہ حیرت اور بے یقینی سے اس کی جانب تکنے لگی۔

بیگاں اس کے اور قریب ہو گئی اور دھیمی آواز میں بولی۔

''چشم دید گواہ تو تو ہی ہے۔ اگر تو ہمت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔''

''اچھا۔ مگر کیسے؟'' ہاجرہ کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ بے قراری سے بولی۔

''ماسی بتا تو سہی۔ یہ سب کس طرح ہو سکتا ہے؟''

بیگاں نے اسے چارپائی پر اپنے قریب بٹھا لیا اور بہت دیر تک اس سے چپکے چپکے باتیں کرتی رہی۔

۞......۞......۞

سجاول نے استاد کے گھر کی دہلیز پار کی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ دور صحن میں کچے چھپر تلے دونوں ہاتھوں میں چھاج لئے وہ اناج پھٹک رہی تھی۔ سجاول کی نگاہ حیرت سے چور چور ہو گئی۔ وہ مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔ وہ صرف نام کی ہی گلابی نہیں تھی۔ اس کا رنگ روپ، اس کی کٹیلی آنکھیں، اس کے رسیلے لب بھی گلابی ہی تھے۔ اس کے دلربا چہرے پر ایسا غرور اور تمکنت تھی جیسے گردوپیش پر اسی کی حکومت ہو۔

اس کی پھولدار اوڑھنی اس کی پشت پر جھول رہی تھی۔ اس کے جادو بھرے پیکر نے اس کی ریشمی قمیص کو آتشی گلابی رنگ دے دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مسلسل حرکت سے اس کی مرمریں کلائیوں میں چوڑیاں بج رہی تھیں وہ شاید کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ اناج پھٹکنے کے شور میں اس کی گنگناہٹ واضح طور پر سنائی تو نہیں دیتی تھی لیکن اس کے گلابی لبوں کی خفیف سی جنبش بڑی دلآویز اور نغماتی تھی۔ سجاول مبہوت سا کھڑا اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

اس نے ڈیرے پر اس کے بہت چرچے سنے تھے لیکن اسے دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے جو کچھ سنا تھا وہ حسن و جمال کی اس مورت کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے حسن میں جو دلکشی اور اس کے سراپے میں جو جادو تھا اسے صرف آنکھوں کے راستے دل میں ہی اتارا جا سکتا تھا۔ اسے لفظوں میں بیان کرنے کا تو حوصلہ ہی نہیں رہتا تھا۔ اس نے چھاج میں سے صاف اناج دوسری طرف پلٹتے ہوئے یونہی ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ صحن میں ڈالی۔ اس کی دلکش آنکھوں کی نرالی چمک سجاول تک آئی۔

''اوئے کون ہے تو؟'' اس نے وہیں سے للکار کر کہا اور تیزی سے اٹھی۔

سجاول بری طرح چونکا۔ غرور حسن سے اٹھتے ہوئے قدموں کی دھمک، جھانجنوں کے ترنم میں گھل مل کر اس کے قریب آ گئی۔

''اوئے کیا الوؤں کی طرح منہ اٹھائے کھڑا ہے؟'' وہ اس کے قریب آ کر اکھڑ پنے سے پوچھنے لگی۔ سجاول نے رعب و جلال سے چمکتے ہوئے خوبصورت چہرے کو اپنے مقابل دیکھا۔ اسے یقین آ گیا کہ ڈیرے کے لوگ سچ کہتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی جو اس سے آنکھ ملا کر بات کر سکتا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔

وہ خاموشی کے اتنے سے وقفے پر جھنجھلا گئی۔

''منہ میں زبان ہے کہ نہیں تیرے۔ بولتا کیوں نہیں۔ کیا لینے آیا ہے؟'' اس نے گھنگھریالے بالوں کی لٹ کو جھٹکتے ہوئے کتنے ہی تیکھے سوال اس کی جانب اچھالے۔

سجاول شپٹا کر عجلت میں بولا۔

''استاد نے مکئی کا آٹا منگوایا ہے۔ پس کر آ گیا ہو تو دے دے۔'' اتنا سا فقرہ کہتے ہوئے اس نے سو بار سوچا کہ کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔

''اچھا۔'' وہ لاپرواہی سے کہہ کر پلٹی۔ تو اس کی جھانجھروں کی رسیلی صدا اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ سجاول نے ہزاروں بار جھانجھروں کی آواز سنی تھی مگر ان میں ایک بے ربط سی چھن چھن کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا لیکن اس بات نے اسے حیران کر دیا تھا کہ گلابی رنگ کے بلوریں پاؤں چوم کر وہ کیسے رس بھرے نغمے گانے لگی تھیں۔ وہ پیروں میں پڑتے سرخ کناری والے ریشمی لاچے کو ذرا سا سنبھال کر اونچے پلنگ پر چڑھی تو اس کی بلوری ایڑیوں پر گرتی ہوئی جھانجھروں نے سجاول کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔

وہ کپڑے میں بندھا ہوا آٹا لے کر پلٹی تو اس کے بوجھ سے لچک رہی تھی۔ اس کی نازک کمر کا حسین خم قیامت ڈھا رہا تھا۔ سجاول نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ گلابی نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''پہلے تو تجھے ابے کے ڈیرے پر نہیں دیکھا۔ کیا نام ہے تیرا؟''

سجاول نے بھی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اوپری ہونٹ پر ہلکا سا پسینہ تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں میں شوخی اور چمک تھی اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پا کر اس نے تیوری چڑھالی اور غرور و بے نیازی سے تھوڑا سا رخ پھیر لیا۔

سجاول نے گلا صاف کر کے کہا۔ ''سجاول۔''

''سجا......ول'' اس نے تمسخر سے اس کا نام بگاڑا اور ہنستے ہوئے بولی۔

''سجاول یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کیا نام ہے بھلا؟''

سجاول اس کے مذاق اڑانے پر جھینپ سا گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے بھی پوچھے کہ بھلا اس کا نام گلابی کیوں ہے۔ یہ بھی کوئی نام ہے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس کا نام تو ٹھیک ہی تھا اس کا گلابی گلابی پیکر پکار پکار کر کہتا تھا کہ اس کا نام گلابی ہی ہونا چاہئے۔

وہ یہ سب کچھ سوچ کر ہی رہ گیا اور بگولے کی طرح دروازے سے باہر نکل گیا۔ گلابی

کی شریر ہنسی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی اس کے پیچھے چلی آتی تھی۔

گلابی ایک نشہ سا بن کر اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ اس کی برہمی، اس کا غصہ اس کی شرارت، اس کی شوخیاں، اس کی بے نیازی، اس کا غرور، اس کا ناز، کبھی کچھ دیکھ کر دل نہیں بھرتا تھا۔ یہ خواہش کسی شریر اور ضدی بچے کی طرح اس کے اندر اس طرح مچلتی تھی کہ وہ اسے دیکھنے' اس سے الجھنے' اس سے باتیں کرنے' استاد کے گھر جانے کے بہانے تلاش کرنے لگتا۔ وہ اس کی اداؤں کو، اس کے ناز و غرور کو۔ اس کے انوکھے پن کو۔ اس کے تیکھے تیوروں کو، اس کے نرالے رنگوں کو من میں بسا لینا چاہتا تھا۔ اس کی کیفیت اس ننھے منے بچے کی سی تھی جو کوئی انوکھی اور نرالی شے دیکھ کر اسے دیکھنے، اسے چھونے اور اسے پا لینے کیلئے مچل اٹھتا ہے۔

ایک روز راہ چلتے رانی نے اسے ٹھہرا لیا تو اس نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کی دلکش آنکھوں کے اداس شکوؤں نے اسے نادم سا کر دیا۔ وہ اس کے قریب یوں چپ چاپ سی کھڑی تھی جیسے اس کے حکم کی منتظر ہو۔ سجاول کو چمکتی ہوئی متحرک گلابی آنکھوں والی گلابی کا خیال آیا جو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

''سجاول!'' رانی نے ہولے سے پکارا تو اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آواز میں لگاؤ تھا۔ اس کی نگاہوں میں واضح محبت تھی۔

سجاول من ہی من میں خجل سا ہو گیا۔ وہ گلابی کے تصور میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ رانی کی سادگی اور معصومیت فراموش ہو گئی تھی۔ رانی جو بڑے یقین سے محبت کا احساس جگاتی تھی اور گلابی جو یہ بھی نہیں جاننے دیتی تھی کہ وہ محبت کرتی ہے یا نفرت۔ وہ چاہتی ہے یا دل لگی کرتی ہے۔ سجاول کو اپنے دل کی بے ایمانی اور نگاہوں کی آوارگی پر پشیمانی ہوئی۔

اسی ندامت کو کم کرنے کیلئے وہ رانی کے چاند چہرے پہ جھکی ہوئی سیاہ لٹ کو محبت سے سنوار کر بولا۔

''ہاں رانی! بتا کیا بات ہے؟''

رانی کی آنکھوں میں ایک دم آنسو جھلملائے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور رازداری سے پوچھنے لگی۔

''سجاول! تو کہاں جاتا ہے۔ روز روز۔''

سجاول چونکا لیکن پھر سنبھل کر بولا۔

''کہیں نہیں۔ میں بھلا کہاں جاؤں گا۔''

''نہیں۔ نہیں چھپا مت۔'' وہ منت کرنے لگی۔ ''مجھے سچ سچ بتا دے۔ دیکھ مجھ سے مت چھپا۔ مجھے پتہ ہے تو ایسا نہیں ہے۔ یہ کمینے گاؤں والے ہی جھوٹ مارتے ہیں۔''

سجاول نے اس کی بات پر غور کیا اور تلخی سے بولا۔

''کیا کہتے ہے گاؤں والے؟''

''وہ کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔'' رانی لمحے بھر کو جھجکی اور اس کے چہرے کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے ناراض ہو جانے سے ڈرتی ہو۔ پھر محتاط سے لہجے میں کہنے لگی۔

''سجاول دیکھ نا۔ گاؤں میں سب کہتے ہیں کہ تو پہلوان کے ڈیرے پر جاتا ہے۔ وہ تو......وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے۔''

''بکتے ہیں گاؤں والے۔ الو کے پٹھے۔'' وہ اکھڑ پنے سے بولا۔

''ان کا جو جی چاہتا ہے بک دیتے ہیں۔ ان کی زبان کون پکڑے۔ ہم کمزور جو ہو گئے ہیں۔ ہماری عزت جو دو کوڑی کی ہو گئی ہے۔ اب ہر کوئی ہم پر ہی انگلیاں اٹھاتا ہے۔''

اس نے منہ ہی منہ میں گالی دی اور غصے سے ہونٹ چبانے لگا۔

رانی کے متفکر چہرے پر رونق سی آ گئی۔ وہ بے ساختہ اس کے بازو سے لگ گئی اور بڑے مان سے بولی۔

''دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ تو ایسا نہیں ہے۔''

......

ہاجرہ بے چینی سے آنگن میں ٹہل رہی تھی۔ وہ کبھی دروازے کی طرف دیکھتی اور کبھی صحن کی دیوار پر سے باہر گلی میں جھانکنے لگتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کبھی پریشانی سے ہاتھ ملتی اور کبھی ہراساں آنکھوں سے یونہی چاروں طرف دیکھتی۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ اس کی پیشانی بار بار پسینے سے بھیگ جاتی تھی۔ وہ ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھتی۔ کسی کو نہ پا کر وہ لمحے بھر کو مطمئن سی ہو جاتی لیکن پھر تفکرات اسے گھیر لیتے۔ بیگاں کو آنا تھا مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ انتظار کے لمحے طویل ہو گئے تھے۔ وہ عجیب شش و پنج کے عالم میں اپنے ہی فیصلے کی شدتوں سے ڈر رہی تھی۔ شدت جذبات میں اس نے بیگاں سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ وہ چوہدری نواز سے ملنے چلے گی لیکن جب وقت سر پر آیا تھا تو وہ ہزاروں اندیشوں اور ڈرا دینے والے وسوسوں میں گلے گلے دھنس گئی تھی۔ اسے تہمتوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے اپنے اجلے آنچل کی فکر ہونے لگی تھی۔

بیگاں نے اسے بہترا یقین دلایا تھا کہ وہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گی۔ اسے صرف ایک بار چوہدری نواز سے مل کر اسے تمام واقعہ سنانا تھا۔ کیونکہ قتل اور اغوا کی چشم دید گواہ وہی تھی۔ اس کے بعد چوہدری نواز تمام معاملہ خود سنبھال لے گا۔ وکیل سے مشورہ کر کے وہ عدالت میں کیس کرے گا۔

مگر ہاجرہ کو حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے بار بار یہ خیال پریشان کر دیتا تھا کہ اگر کسی نے اسے چوہدری نواز کی حویلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تو یہ بات نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گی۔ لیکن جب اسے اپنی سونی کلائیاں اور اجڑی مانگ یاد آتی۔ منظور کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش کا خیال آتا تو اس کے دل سے سارے ڈر خوف نکل جاتے۔ اسے صرف ایک ہی بات یاد رہتی کہ اسے ہر حال میں منظور کے قاتلوں سے انتقام لینا ہے۔ انہیں ان کے انجام تک پہنچانا ہے۔ یہی سوچ کر اس نے بیگاں سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ سجاول کسی کام سے شہر جائے گا تو وہ اس کے ساتھ جا کر چوہدری نواز سے بات کرے گی۔

لیکن آج جب وہ دن آ گیا تھا تو وہ خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف اس کے اندر ہلچل مچا رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ جاتی تھی کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو......؟

ان وسوسوں اور اندیشوں نے اسے چکرا دیا۔ متضاد خیالات نے اسے نڈھال کر دیا۔

ان دیکھے خوف نے اسے اتنا کمزور کر دیا کہ جب بیگاں اسے لینے آئی تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

''ہا۔ ہائے۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

''تو کرتی کیا ہے ہاجراں! پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ میں تو چوہدری نواز سے بات کر کے آئی ہوں۔ وہ اڈیکتا ہو گا۔''

''پر ماسی۔'' ہاجرہ ہچکچائی۔

''جانی ہاجراں! تیرا من بھی کھوٹا ہی ہے۔'' وہ اس کی طرف حقارت سے پورا پنجہ لہرا کر بولی۔ ''تو صرف باتیں ہی کرنے جوگی ہے۔ جب تو منظور کی گھر والی ہو کر آگے نہیں آتی تو دوسروں کو کیا پڑی ہے۔ پرائی مصیبت گلے لگانے کی۔ میری طرف سے نہیں جاتی تو نہ جا۔ پر اتنا سوچ لے کہ آج چوہدری نواز ساتھ دینے پر تیار ہے۔ کل وہ بھی پیچھے ہٹ گیا تو پھر۔''

ہاجرہ سر جھکا کر سوچتی رہی۔ اپنے آپ سے لڑتی رہی۔ خود کو سمجھاتی اور حوصلہ دیتی رہی۔ بہت دیر تک اس نے نہ کچھ کہا نہ جھکا ہوا سر اٹھایا۔ تو بیگاں اکتا کر کھڑی ہوئی۔

''اچھا ہاجراں! تیری مرضی۔ تو نے نہیں چلنا۔ تو ٹھیک ہے۔ میں تو چلوں۔ جا کر چوہدری نواز کو بتا دوں کہ تو کچھ نہیں کرنا چاہتی۔''

ہاجرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ٹھہر جا ماسی!'' اس کے اندر سے جیسے کوئی بے ساختہ بولا۔ اس نے اٹھ کر چادر کی گاڑھی سی بکل ماری اور بیگاں کے ہمراہ ہوئی۔

راستہ بھر بیگاں کی زبان تالو سے نہیں لگی۔ وہ اسے بتاتی رہی کہ چوہدری نواز کتنا شریف اور بھلا آدمی ہے۔ ہاجرہ بظاہر ہوں ہاں کر رہی تھی لیکن حقیقت میں وہ اس کی کوئی بات بھی نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ اسے چوہدری نواز سے کس طرح بات کرنی چاہئے۔ اسے کس طرح مدد پر آمادہ کیا جائے؟ اس نے چوہدری نواز کی حویلی میں آ کر اچھا کیا ہے یا برا۔ اسے اس کا تذکرہ سجاول سے کرنا چاہئے یا نہیں۔

چوہدری نواز بڑے تپاک سے ملا۔ اس کی بیٹھک کی سجاوٹ، اس کی حویلی کی ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنا خوشحال اور آسودہ ہے مگر وہ بالکل بھی مغرور یا تنک چڑھا نہیں تھا۔ وہ بہت نرمی اور شائستگی سے باتیں کر رہا تھا۔

ہاجرہ بے طرح جھجک رہی تھی۔ اس کے پاؤں نرم دبیز قالین میں دھنسے جاتے تھے۔ گرد و پیش کی سجاوٹ اور ماحول نے اسے ششدر سا کر دیا تھا۔ پھر وہ اس جگہ آ کر کسی غیر مرد سے باتیں کرنے کے تصور سے ہی گھبرا رہی تھی۔ اس نے چوہدری نواز کے سوالوں کے جوابات بمشکل ادھورے ادھورے سے دیئے۔ وہ سر جھکائے کٹی ہوئی سی بیٹھی بار بار اپنی اوڑھنی اپنے گرد لپیٹتی رہی۔

چوہدری نواز خود ہی اسے بتاتا رہا کہ منظور اس کا کتنا عزیز دوست تھا۔ دونوں اکٹھے سکول میں پڑھتے رہے تھے جن دنوں منظور کا قتل ہوا وہ بدقسمتی سے گاؤں سے باہر تھا۔ اسی لئے اسے صحیح صورتحال کا علم نہیں ہو سکا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ قانون کی مدد حاصل کرے۔

ہاجرہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی اور اپنی آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو اپنی میلی اوڑھنی میں جذب کرتی رہی۔ چوہدری نواز نے اسے معاملے کی تمام اونچ نیچ سمجھا دی تھی کہ اس نے کیا پروگرام بنایا ہے پولیس کو کیا بیان دیا جائے گا۔ گواہیاں کیونکر تیار ہوں گی۔ عدالت میں معاملہ کس طرح لے جایا جائے گا۔ اور کون سا وکیل کیا جائے گا۔

اس کی باتیں پوری طرح سے ہاجرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن وہ انہیں بڑے غور

سے سن کر یاد رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اسے نئی زندگی دے رہا تھا۔ اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش کو دھیما کر رہا تھا۔ وہ ناامیدی کے بھنور سے نکل کر امید کے ساحلوں کی طرف بڑھ رہی تھی اسے اپنا آپ بڑا اہم محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے سارے جہان کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے ہر شے پر قابو ہے وہ ایک اشارے سے دنیا کو زیر و زبر کر سکتی ہے۔

''کیوں بھئی سجاول۔ تیار ہے نا تو؟'' استاد نے دوٹوک لہجے میں سوال کیا۔

سجاول لمحے بھر کو متذبذب سا ہوا۔ اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے ماسٹر شکور کے شریف خون میں ہچکچاہٹ کی ایک لہر سی اٹھی۔ استاد نے فوراً ہی اس کے تذبذب کو محسوس کر لیا اور کڑے لہجے میں بولا۔

''کیوں یار! ابھی کچھ کسر باقی ہے؟''

سجاول کچھ کہنا ہی چاہتا تھا تو وہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

''سن سجاولا۔ میں نے پہلے ہی دن تجھے سمجھا دیا تھا کہ یہاں آ گیا تو پلٹ کر نہیں دیکھ سکے گا۔ سمجھا؟ اگر تو نے دشمنوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ تو پھر جی دار بن۔ جی دار۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو تو اپنی بہن کو نہیں ڈھونڈ سکتا۔''

بھاگ بھری کے تذکرے نے سجاول کے رگ و پے میں دکھ اور اذیت کی لہر سی دوڑا دی۔ اس کا جی چاہا کہ لمحے بھر میں ساری دنیا کو چٹکی میں مسل دے جس میں اس کی پھولوں ایسی معصوم بہن قدموں تلے روندی گئی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر اٹھایا اور دانت پیس کر بولا۔

''میں تیار ہوں استاد!'' اس کے لفظوں میں شعلے سے لپک رہے تھے۔

استاد نے نظام اور شاہو کو بلوا لیا اور انہیں تمام ضروری تفصیلات سمجھانے لگا۔ سجاول بڑے غور سے اس کی ایک ایک بات سنتا رہا۔ اس کا رواں رواں کچھ کر گزرنے کو بے تاب تھا۔ اسے پل بھر کی تاخیر اور لحہ بھر کا انتظار بھی دوبھر معلوم ہو رہا تھا لیکن رات ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔

سجاول کے رگ و پے میں ایک عجیب بے چینی سی دوڑتی پھرتی تھی۔ آج اس کی آزمائش تھی اور اسے ہر حال میں اس پر پورا اترنا تھا۔ یہیں سے اس کا آغاز ہونا تھا جو اس کو اپنی منزل تک لے جانے والا تھا۔ وہ تصور ہی تصور میں خود کو اس واردات کے تمام مراحل طے

کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مگر وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ ٹہلتا رہا۔ ادھر ادھر وقت گزارتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر استاد کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

استاد اس پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ وہ کسی کام سے گھر بھیجتا تو صرف اسی کو۔ سجاول بھی اس انتظار میں رہتا کہ استاد کسی کام سے اسے گھر بھیجے اور وہ گلابی کے نرالے روپ کے طلسمات میں کھو کر رہ جائے۔ گلابی کے خیال سے اس کے من میں کیف و نشاط کی ننھی منی کلیاں سی چٹکنے لگیں۔ اس کی بے چینی میں کمی سی ہو گئی اور وہ پہلے کی نسبت خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔

وہ اطلاعاً کھنکار کر اندر داخل ہوا تو گلابی نے پلٹ کر دیکھا۔ شفاف پیشانی پہ ناز سے بل ڈال کر وہ اٹھی اور ایک عجیب شان دلربائی سے سج سج پاؤں دھرتی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ اس کی جھانجھنیں ایک بار زور سے بج کر خاموش ہو گئیں۔ اس نے اکھڑ پنے سے سوال کیا۔

''کیا بات ہے؟ جب دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔''

سجاول نے اپنے روبرو اس کے سنہری چہرے کو دیکھا اور محویت سے تکتا رہا۔ اس کا سانچے میں ڈھلا جسم، اس کی غرور سے اٹھی ہوئی گردن، اس کی ٹھوڑی کا حسین خم اور ترشے ہوئے گلابی لب۔ وہ دیکھتا ہی رہا۔

گلابی نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا اور تڑاخ سے بولی۔

''اوئے۔ کیا دیکھ رہا ہے۔ الوؤں کی طرح۔''

سجاول کی محویت ٹوٹ گئی۔ وہ چونکا لیکن اس کے دلکش چہرے سے نگاہ نہیں ہٹائی اور ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''تجھے دیکھ رہا ہوں۔ تجھے۔''

اس نے ہلکی سی تیوری چڑھائی اور شان دلربائی سے پوچھنے لگی۔

''کیوں؟''

اس کے سوال میں ایک ایسا والہانہ اشتیاق تھا جیسے جی بھر کر سنگھار کرنے کے بعد کوئی دوشیزہ آئینہ دیکھنا چاہے۔

سجاول مسکرایا اور اسے چھیڑنے کو بولا۔

''اس لئے کہ تیری شکل میری بکری سے بہت ملتی ہے۔ کل بیچاری ہیضے سے مرگئی۔''

"کیا......؟" اس نے بے یقینی سے کہا اور اس کی بات کا مطلب سمجھ کر غصے میں آپے سے باہر ہوگئی۔

"بکری ہوگی تیری ماں۔ تیری بہن۔ تیری کوئی اور ہوتی سوتی۔ تیری کچھ لگتی۔" وہ طیش میں آکر زور سے چلائی۔

سجاول ٹھٹک گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا چھوٹا سا مذاق ایسی صورت اختیار کر جائے گا۔ وہ غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہتی جا رہی تھی۔ جلدی میں سجاول کو کچھ اور نہیں سوجھا تو اس نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑی اور زور سے جھٹکا دے کر بولا۔

"ماں بہن کا نام نہ لینا سمجھی۔" اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ گلابی یک لخت چپ ہو کر قدرے حیرت سے اس کی جانب تکنے لگی۔

"زبان کھینچ لوں گا۔ یاد رکھنا۔ اگر اب جو بک بک کی تو۔" وہ دانت پیس کر بولا اور اس کا بازو چھوڑ کر جلدی سے دروازے میں سے نکل گیا۔ گلابی وہیں مبہوت سی کھڑی ہلتے ہوئے ٹاٹ کے پردے کو دیکھتی رہی۔

......

ہاجرہ نے چند دن میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ چوہدری نواز اس کا ہمدرد اور منظور کا سچا دوست ہے۔ وہ دوستی کا حق نبھانے کو ساری بات اپنے سر لے رہا تھا۔ وہ جتنی بار اس سے ملی تھی وہ بڑی عزت سے پیش آیا تھا اور اسے تسلی دیتا رہا تھا۔ اس نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی ڈھارس ہی بندھاتا رہا تھا۔

چوہدری نواز نے اسے کچھ بیان بھی یاد کرائے تھے جو اسے پولیس کے روبرو دینے تھے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہی بیانات مقدمہ پیش ہونے پر عدالت میں دیئے جائیں گے۔ ہاجرہ نے انہیں خوب اچھی طرح سے یاد کر لیا تھا۔ وہ ہر وقت خود کو تھانیدار کے روبرو محسوس کرتی اور دل ہی دل میں ان بیانات کو دہراتی رہتی۔

سجاول اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ کر کئی بار اس سے کہتا کہ کیا وہ خود سے باتیں کرنے لگی ہے۔ تو وہ چڑ کر جواب دیتی وہ تو کچھ کرتا کراتا نہیں اس لئے وہ منظور کے قاتلوں کو پکڑوانے کیلئے وظیفہ پڑھ رہی ہے۔"

چوہدری نواز نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ اسے بیانات خوب یاد ہو گئے ہیں تو اسے بتایا کہ وہ عنقریب اسے قریبی تھانے لے جائے گا۔ جہاں یہی بیانات اسے تھانیدار کے

سامنے دوہرانے ہوں گے۔

تھانے کا نام سن کر ایک بار پھر ہاجرہ کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ اس نے گھبرا کر چوہدری نواز سے کہا کہ وہ تھانیدار کو اس کی طرف سے بیان لکھوا دے۔ وہ اس کی سادگی پر ہنس پڑا اور اسے سمجھانے لگا کہ اس کی موجودگی وہاں کیوں ضروری ہے اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنا تانگہ تیار رکھے گا اور اسے اور بیگاں کو پکی سڑک پر سے اپنے تانگے میں بٹھا لے گا۔

پکی سڑک تک اسے پیدل آنا ہوگا تاکہ گاؤں میں کسی کو شک نہ ہو۔ دو ڈیڑھ گھنٹے میں وہ اس کا بیان لکھوا کر اسے واپس لے آئے گا۔ اس طرح کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ ہاجرہ پھر بھی گھبراتی رہی۔ بیگاں نے بھی سمجھایا کہ اب آخری مرحلے پر اسے ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں اب اس کی منزل چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی لیکن ہاجرہ کا دل ڈرتا ہی رہا۔ وہ اس بات کو مختلف انداز سے، ہزاروں پہلوؤں سے دیکھتی رہی۔ کبھی پریشان ہو جاتی۔ کبھی خود کو تسلی دیتی۔ کبھی ڈر جاتی اور کبھی دل کو مضبوط کر لیتی۔ کبھی خوفزدہ ہو جاتی کبھی خود اپنی ڈھارس بندھانے لگتی۔

وسوسوں اور اندیشوں سے بھری رات کے بعد اس کے امتحان کی صبح طلوع ہوئی تو اس کے دل میں متضاد جذبات نے کھد بدی مچا رکھی تھی۔ آج اس کی آخری آزمائش تھی۔ اگر وہ اس مرحلے سے گزر گئی تو منظور کے قاتلوں کی زندگی کے دن تھوڑے رہ جائیں گے۔ شاید سہاگ بھری کا کوئی سراغ مل سکے۔

اس نے جلد ہی گھر کا کام سمیٹ دیا اور بیگاں کے ساتھ لوگوں کی نگاہ بچاتی گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر پکی سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں جا کھڑی ہوئی۔ گھبراہٹ سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور حلق خشک ہوا جاتا تھا۔ اس نے آج تک کبھی تھانے کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ تھانے کے خیال سے ہی اس کا دل گھٹ جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ جاتے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تھانیدار کے سامنے جا کر سب کچھ بھول جائے گی۔

انتظار کا ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا۔ تفکرات کا بوجھ ناقابل برداشت تھا۔ ان دیکھے اندیشے اسے ڈراتے تھے۔ کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ وہ گاڑھے کی چادر کو بار بار اپنے گرد لپیٹ کر خود کو جیسے محفوظ ہونے کا یقین دلاتی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر انہیں تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بیگاں حسب عادت دنیا جہان کی باتیں کر رہی تھی مگر ہاجرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کچے راستے کی طرف بے قراری سے دیکھ رہی تھی جس طرف سے چوہدری نواز نے آنا تھا۔

دور سے تانگے کی آواز سنائی دی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بیگاں نے خوش ہو کر کہا کہ یہ آواز چوہدری نواز کے تانگے کی ہے۔ آواز قریب آتی گئی۔ اس کا سفید شاندار گھوڑا نظر آیا تو ہاجرہ کی جان میں جان آئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اچھی طرح سے چادر کی بکل مارتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں سے باہر نکل آئی۔ چوہدری نواز نے قریب آ کر تانگا روکا ان کا حال چال پوچھا اور انہیں تانگے میں سوار کرا لیا۔

بلند قامت سفید گھوڑا دلکی چال چلنے لگا۔ چوہدری نواز ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا لیکن ہاجرہ اپنی الجھن سے باہر نہیں نکل سکی اس کی باتوں کے جواب زیادہ تر بیگاں نے ہی دیئے۔ ہاجرہ بے چینی سے پہلو بدلتی رہی۔ اسے انتظار کا ایک لمحہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہ مرحلہ طے کر لینا چاہتی تھی لیکن وہ لمحہ ہاتھ آنے میں دیر تھی۔

خدا خدا کر کے تانگہ ایک جگہ رکا۔ چوہدری نواز چھلانگ لگا کر اترا اور انہیں بھی نیچے اترنے کیلئے کہا۔ ہاجرہ نے دیکھا وہ ایک شاندار حویلی نما عمارت تھی۔ اس نے کبھی تھانے کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ تھانہ کیسا ہوتا ہے۔

"میں نے سوچا کہ تو تھانے جا کر کہیں پریشان نہ ہو اس لئے میں نے تھانیدار کو اپنی حویلی ہی بلا لیا ہے۔" چوہدری نواز نے بتایا۔

یہ سن کر حاجرہ کی جان میں جان آئی۔ تھانے کے خیال سے ہی وہ لرز رہی تھی مگر اب اسے اطمینان ہو گیا تھا۔ کوئی ملازم دوڑا ہوا آیا اور اس نے چوہدری نواز کا استقبال کر کے گھوڑے کی باگ تھام لی۔

"کیوں اوئے ماجھے۔ تھانیدار پہنچا ہے یا نہیں؟" چوہدری نواز نے پوچھا۔

"مائی باپ اندر بیٹھک میں بیٹھا ہے۔ انتظار کر رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کوئی چاہ پانی پوچھا ہے اس کو؟"

"چاہ پانی۔" ماجھے نے دانت نکالے۔

"وہ تو اندر بیٹھا مرغے کھا رہا ہے۔"

ہاجرہ نے تھوک نگل کر حلق تر کیا اور دل ہی دل میں اپنے بیانات دوہراتی بیگاں کے

ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ڈیوڑھی سے اگلے دروازے پر چوہدری نواز رک گیا اور بیگاں سے بولا۔

"بیگاں تو یہاں ڈیوڑھی میں بیٹھ۔ ہاجرہ ابھی تھانیدار کے سامنے بیان دے کر آ جاتی ہے۔ پھر ماجھا تمہیں چھوڑ آئے گا۔ مجھے شہر کچھ کام ہے۔"

ہاجرہ نے پریشان ہو کر بیگاں کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں نہیں۔ بیگاں تم بھی میرے ساتھ چلو۔ مجھے اکیلے ڈر آئے گا۔"

"ڈر کس بات کا ہے میں جو تیرے ساتھ ہوں۔ تھانیدار میرا دوست ہے۔ تو بالکل مت گھبرا۔" چوہدری نواز نے تسلی دی۔

"اور ہاں تجھے تیرا بیان تو اچھی طرح یاد ہے نا۔ بس دس پندرہ منٹ کی بات ہے ساری۔ تو گھبرانا مت۔ بس جو وہ پوچھے اس کا جواب دے دینا۔"

ہاجرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں ڈری ڈری سی تھیں۔ بیگاں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

"تو گھبرا مت دھیئے میں یہیں باہر بیٹھی ہوں۔"

ہاجرہ نے پھر سہمے ہوئے انداز میں سر ہلایا اور چوہدری نواز کے پیچھے پیچھے حویلی کے اندر داخل ہو گئی۔

......

سجاول اندھیرا جھکنے سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ اس نے صحن میں ہاجرہ کو چولہے کے پاس سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔ اس نے سلام کیا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس بات پر ناراض رہتی تھی کہ وہ منظور کے خون کا بدلہ کیوں نہیں لیتا۔

وہ ایک پیڑھی گھسیٹ کر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور ہولے سے بولا۔

"بھرجائی۔ روٹی دے دے۔ آج تو بہت بھوک لگی ہے۔"

ہاجرہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اسی طرح گم صم سی بیٹھی رہی۔ سجاول نے پھر اسے مخاطب کیا۔

"بھرجائی! روٹی دے۔"

ہاجرہ نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اب بھی اس کی بات سمجھ نہ پائی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ سجاول کو اس کا دلکش

چہرہ اترا اترا ہوا سا محسوس ہوا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں کے درمیان چمکتی ہوئی لمبی باریک مانگ میں راکھ پڑی ہوئی تھی۔

سجاول دکھی سا ہو گیا۔ اسے وہ ہاجرہ یاد آئی جو رنگوں، خوشبوؤں اور پھولوں میں لدی ان کی چوکھٹ پر اتری تھی۔ تو اس کا گھونگھٹ میں چھپا چہرہ بھی گلاب کا سرخ پھول معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب اس پر سرسوں کی زردیاں کھنڈی تھیں۔ سجاول نے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹالی اس کی بھوک مر گئی تھی۔ اس کے اندر جیسے لاوا سا ابلنے لگا تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انتقام کے اس راستے پر نکل جانا چاہتا تھا جو اس مظلوم عورت کی چھن جانے والی خوشیوں کا ازالہ کر سکے جو اس کے زخمی دل پر تسکین کا پھاہا رکھ سکے۔

ہاجرہ نے اس کے سامنے روٹی اور دال رکھ دی اور خود پھر کسی گہری سوچ میں اتر گئی۔

سجاول کو بھوک نہیں رہی تھی۔ لیکن اس نے یونہی عادتاً ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا۔ دال پھیکی اور کچی تھی۔ روٹی بھی جگہ جگہ سے جلی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور بغیر کچھ کہے اٹھ گیا۔

''سجاول!'' ہاجرہ نے اسے اٹھتے دیکھ کر پکارا۔

''کیا بات ہے بھرجائی؟'' وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

''سجاول! اگر میں مر جاؤں نا تو مجھے اپنے بھائی کے ساتھ نہ دفنانا۔'' اس نے اچانک اجنبی لہجے میں کہا۔

سجاول نے دکھ اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پھر اپنی بات دوہرائی۔

''اچھا سجاول! میری بات یاد رکھنا۔ مجھے منظور کے ساتھ نہ دفنانا۔ میری قبر اس کے ساتھ نہ بنانا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہے تو بھرجائی!'' سجاول نے دکھی لہجے میں کہا۔

''تجھے میرا ذرا خیال نہیں۔ تیرے سوا میرا اس دنیا میں ہے ہی کون۔ ایک تیرے دم سے تو یہ گھر کھلا ہے۔''

ہاجرہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اس کے کملائے ہوئے رخسار آنسوؤں میں بھیگنے لگے۔

سجاول کا دل کٹ گیا۔ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نہ رو بھرجائی! دل تھوڑا نہ کر۔ ہم ان دنوں سے گھبرا کر مریں گے نہیں۔ ہم زندہ رہیں گے اور ایک ایک سے ایسا بدلہ لیں گے کہ ان کی نسلیں یاد رکھیں گی۔''

ہاجرہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر سسکیوں کے درمیان بولی۔

''پتہ نہیں ان کالے منہ والوں کو بدلہ کب ملے گا۔ ہم ہی مر کھپ جائیں گے۔ انہیں تو کچھ نہیں ہو گا۔ یہ سب کے سب ایک جیسے ہیں۔ ایک جیسے۔'' اس کے لفظوں میں دکھ اور اذیت تھی۔

سجاول کا سارا وجود جیسے درد و غم سے سلگنے لگا۔ اس نے برداشت کرنے کو ہونٹ کاٹے۔ لیکن اس کی تسلی کیلئے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس مرحلے کو کب اور کیسے طے کر سکے گا۔ چوہدری کی اونچی حویلی کی دیواروں کو کب ڈھا سکے گا۔ وہ ضبط کی کوشش میں مٹھیاں بھینچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاجرہ نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اس کی سسکیاں بڑی دلدوز تھیں۔ اس کے آنسوؤں میں غم سلگ رہے تھے۔ سجاول دکھ کے گہرے پانیوں میں ڈوب گیا۔ وہ سوچتا ہی رہا کہ اس کے دکھوں کا مداوا کس طرح کرے۔ اسے کس طرح اذیت کی قید سے رہائی دلائے۔ اس کی زندگی کے پر بہار روز و شب کیوں کر لوٹائے۔

اس نے کچھ جھجک کر اپنا ہاتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ اس کے کھلے ہوئے سر پر رکھا اور چپکے سے آ کر اپنی کوٹھڑی میں لیٹ رہا۔ لیکن دل بہت بے چین تھا۔ اس کی روح پر ایک بوجھ سا آن گرا تھا۔ وہ خود کو ہاجرہ کی روتی ہوئی آنکھوں کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی جل تھل آنکھیں کیا تقاضا کرتی ہیں۔ اس کے سلگتے آنسوؤں کی خاموش زبان کیا کہتی ہے۔ اس کی سسکیوں اور آہوں کا مداوا کیا ہے۔ لیکن شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی جل تھل آنکھوں کے تقاضے پورے کر سکتا۔ اس کے آنسوؤں کے مطالبوں کے لئے کچھ کر سکتا۔ اس کے بے بس آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ اس کی دلدوز ہچکیاں اس کی روح میں گونج رہی تھیں۔ وہ بہت دیر تک کڑھتا رہا۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ پریشان ہوتا رہا۔ دل ہی دل میں اپنے منصوبوں کے تانے بانے بنتا۔ آنکھیں بھینچ کر سونے کی کوشش کرتا رہا۔

پھر نہ جانے وہ سو گیا یا جاگتا رہا اسے صحیح اندازہ نہیں ہوا کہ تاریکی میں اچانک لالٹین کی زرد میلی میلی سی روشنی نظر آئی۔ پھر ہاجرہ کا سوگوار چہرہ نمودار ہوا اور اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سجاول! چوہدری نواز کا نام یاد رکھنا۔ اسے نہ چھوڑنا۔ اس نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ کہیں کا نہیں رکھا۔ چوہدری نواز کا نام یاد رکھنا۔ اچھا چوہدری نواز کو یاد رکھنا۔" اس کا لہجہ زخمی زخمی اور سرد تھا۔ اس کی آوازیوں ڈوب رہی تھی۔ جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔

سجاول کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ عالم بیداری میں ہے یا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ زرد میلی روشنی کے ساتھ ہاجرہ کا بیمار دھول میں اٹا ہوا چہرہ بھی غائب ہو گیا۔ کمرے میں پھر تاریکی پھیل گئی اور سب کچھ ایک خواب کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سونے جاگنے کی دھندلی سی کیفیت میں سجاول سوچتا رہا کہ اس نے خواب دیکھا ہے یا ہاجرہ واقعی اس کی کوٹھڑی میں آئی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور تکیئے سے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کالی سیاہ رات چھائی ہوئی تھی اور ہاجرہ کا کہیں کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔

وہ غنودگی میں بڑبڑایا اور نیم خوابیدہ سی کیفیت میں اس نے لمحے بھر کو یہی سوچا کہ شاید اس نے خواب ہی دیکھا ہے۔

رات وہ ہاجرہ کے بارے میں ہی سوچتا ہوا سویا تھا۔ اس کی باتیں اس کے ذہن پر اس قدر طاری تھیں کہ اسے خواب میں بھی وہی سب کچھ نظر آیا تھا۔ پھر اس کا دل چاہا کہ اٹھ کر ہاجرہ کو دیکھ آئے۔ مگر اس نے خود ہی بات ذہن سے جھٹک دی کہ اگر یہ سب خواب ہوا تو ہاجرہ مفت میں پریشان ہو گی۔ جو بات بھی ہوئی وہ اس سے صبح ہی معلوم کر لے گا۔ اس نے کروٹ بدلی اور یہی کچھ سوچتے سوچتے بے خبر ہو گیا۔

غیر مانوس سا شور سن کر اس کی آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر ادھر ادھر دیکھا۔ آج تو ہاجرہ نے بھی اسے نہیں جگایا تھا۔ حالانکہ دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ صحن میں سے بہت سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کچھ حیران ہوا۔ یہ صبح صبح ان کے گھر کون آ گیا تھا۔ پھر کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔

"سجاول! او سجاول!"

وہ چونکا اور اس نے پوری طرح آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔

"سجاول۔ سجاول!..... او سجاول!"

باہر سے پھر کوئی پکارا تو وہ ہاتھ سے بال برابر کرتا چپلیں گھسیٹتا تیزی سے اٹھ کر باہر نکلا۔ سامنے ہی ہمسایوں کی چند عورتیں فق چہرے لئے پریشان کھڑی تھیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں دھائی دی۔

"ہائے وے سجاول تیری بھرجائی کنوئیں میں ڈوب گئی۔"

سجاول دھک سے رہ گیا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ مردوں میں سے کسی نے عورتوں کو ڈانٹا کہ انہوں نے اچانک اس کو یہ خبر کیوں سنا دی ہے۔ پھر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بہت آہستگی سے بولا۔

"سن یار سجاول! تیری بھرجائی ہاجرہ کی لاش کنوئیں میں پڑی تھی۔ شاید بچاری کا پاؤں پھسل گیا۔ کوئی قریب نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ ہمیں تو عورتوں نے صبح خبر کی ہے تو سب نے مل کر اسے کنوئیں سے نکالا ہے۔ حکیم صاحب کو بھی دکھا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اسے فوت ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔"

سجاول کا ذہن ماؤف سا ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آسمان اس پر ٹوٹ پڑا ہے۔ زمین اس کے پاؤں تلے نہیں ٹھہرتی۔ اردگرد کھڑے لوگ افسوس کرنے لگے۔ کچھ

عورتیں رونے اور بلند آواز میں بین کرنے لگیں لیکن وہ بالکل چپ کھڑا رہا۔ گرد و پیش سے بے خبر۔ صدمے سے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

کسی ہمسائے نے اس کا بازو پکڑا اور صحن کے اس گوشے میں لے آیا۔ جہاں ہاجرہ کی لاش پڑی تھی۔ کسی نے اس کے چہرے سے کپڑا اٹھایا کوئی عورت بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"لے پتر۔ بھرجائی کا منہ دیکھ لے۔"

اس نے ایک نگاہ ہاجرہ کے بے جان چہرے پر ڈالی اور یکلخت گھٹنوں کے بل یوں جھک گیا جیسے گر پڑا ہو۔ ایک عجیب سی حسرت سے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں نہ جانے کیا بڑبڑایا اور سر اس کی چارپائی کی پٹی پہ رکھ دیا۔ کوئی کہتا تھا کہ ہاجرہ غلطی سے کنویں میں گر پڑی تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ کسی نے اسے دھکا دے دیا ہے۔ مگر اندر ہی اندر سب کا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ وہ نہ لوگوں کے منہ بند کر سکتا تھا۔ نہ ہاجرہ کے نام پر لگی ہوئی تہمت مٹا سکتا تھا۔ اسے خود بھی وہ رات یاد تھی جب ہاجرہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور جسے وہ خواب سمجھتا رہا تھا۔

لیکن وہ حقیقت تھی۔ ایک تڑپا دینے والی ظالم حقیقت جس میں چوہدری نواز کا نام آتا تھا۔ پردے ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے۔ اسے ہاجرہ کی سب باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی جا رہی تھیں۔ اس کا جھکا ہوا سر۔ اس کی روتی آنکھیں۔ اس کی پچھتاوے کی سی کیفیت۔ اس کا بار بار موت کا ذکر کرنا اور اپنی قبر منظور کے ساتھ نہ بنانے کی تاکید کرنا۔ ہر بات میں وہی ایک راز تھا جو گاؤں میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔ مگر یہ صرف سجاول ہی جانتا تھا کہ اس راز میں چوہدری نواز کا نام بھی آتا تھا۔

گاؤں کے بزرگوں نے مل جل کر ہاجرہ کے کفن دفن کا انتظام کر دیا تھا اور بات پولیس تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر لوگوں کی زبانیں بند نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اپنے اپنے اندازے لگانے سے نہیں چوکتے تھے۔ کوئی طنز سے اس کا ذکر کرتا تو کوئی ہمدردی سے اظہار افسوس کرتا۔ کوئی ترس کھا کر بار بار اس کا تذکرہ کرتا تو کوئی مشکوک لہجے میں سارا واقعہ دوہرانے لگتا۔ ہاجرہ کا ذکر۔ اس کی موت۔ سارے گاؤں میں کسی نہ کسی طرح گردش کرتی پھرتی تھی جس نے سجاول کو پاگل کر دیا تھا۔ لوگوں کی مشکوک نظریں اسے چبھنے لگی تھیں۔ دل جلانے والے تذکرے اسے غیرت سے مارے دیتے تھے۔ ابھی بھاگ بھری کا نام گاؤں والوں کی یادداشت سے محو نہیں ہوا تھا کہ ہاجرہ ایک نیا باب کھول گئی تھی۔

سجاول پر ہر وقت ایک وحشت سی سوار رہنے لگی تھی۔ ماضی کے جن زخموں پر اس نے مصلحت کی مرہم رکھ دیا تھا وہ اسے پھر بیکل کرنے لگے تھے۔ یہ خیال بار بار اسے کچوکے لگاتا تھا کہ اس نے ہاجرہ سے پوچھا کیوں نہیں تھا کہ وہ چوہدری نواز کا نام کیوں لیتی تھی؟

وہ اس کے بارے میں کوئی گری ہوئی بات نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ مگر اس حقیقت کا کیا کرتا جو بے رحمی سے منہ کھولے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے تصور سے ہی اس کا سینہ سلگنے لگتا تھا۔ اس کے اندر غم و غصے کا جوالا مکھی لاوا اگلنے لگتا تھا جو اسے تمام مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر قانون ہاتھ میں لینے پر مجبور کر رہا تھا۔

۞......۞......۞

اس نے کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ نہ ہی کسی کو اپنے ساتھ شریک کیا ایک جنون بگولے کی طرح اس کے روئیں روئیں میں اٹھا اور وہ اندھا دھند آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسے اپنے کئے پر کوئی افسوس یا پشیمانی نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے دل میں کوئی خوف یا اندیشہ تھا۔ اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مار کر اس کی تپش میں کمی کر دی تھی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کے وجود پر لگے ہوئے زخموں میں سے ایک زخم مندمل ہو گیا تھا۔ علاقے میں بہت بھگدڑ مچی۔ پولیس آتی جاتی رہی۔ پکڑ دھکڑ ہوئی مگر وہ اپنے آپ میں مگن رہا۔ اس نے استاد سے بہت سے گر سیکھے تھے۔ پولیس والوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ استاد کا بندہ ہے اس لئے اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

ویسے بھی وہ دشمن دار آدمی تھا۔ جاگیرداروں کے ساتھ اس کے بہت سے مقدمے عدالت میں تھے۔ اس لئے پولیس کی تفتیش کا رخ اسی جانب تھا۔ مگر جاگیرداروں کا اثر و رسوخ ان پر کھلے بندوں ہاتھ نہیں ڈالنے دیتا تھا۔

سجاول اب اپنے گھر کم ہی آتا جاتا تھا۔ یہاں اس کے لئے رہا ہی کیا تھا جس کی طلب اسے یہاں آنے پر مجبور کرتی۔ رشتوں سے خالی ہو کر وہ کچا خستہ حال مکان ہی تو رہ گیا تھا اسے گھر کہتے ہوئے بھی دل ہولتا تھا۔

ویرانی اور سناٹے نے چاروں جانب اس میں ڈیرے لگا رکھے تھے۔ اس کے ذرے ذرے سے بھاگ بھری کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کے در و دیوار سے ہاجرہ کی روتی ہوئی آنکھیں جھانکتی تھیں۔ اس کا کچا صحن منظور کے خون میں لتھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ سجاول اس جگہ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہاں آ کر اس کا دل ہول جاتا تھا۔ اسی لئے وہ زیادہ تر

استاد کے ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار حالات جاننے کے لئے یہاں کا چکر لگا لیتا تھا۔

ایک جھلستی ہوئی دوپہر کو وہ اپنے گھر آیا تو اس کی اداسی اور بے سروسامانی اس کے اندر کھب گئی۔ گھر میں خاک اڑ رہی تھی۔ ٹوٹے ہوئے برتن یہاں وہاں بکھرے پڑے تھے۔ سوکھے ہوئے زرد پتے مٹی میں رل رہے تھے۔ وہ ان پتوں پر چلتا نیم کے گھنے پیڑ تلے جا کھڑا ہوا۔ اس کے ٹھنڈے سائے نے جیسے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ فضا کی حدت جو اس کے اندر کی تپش سے مل کر اس کے رگ و پے میں بے چینی سی بن کر دوڑ رہی تھی‘ اس کی شدت میں کمی ہونے لگی اس نے تھکے تھکے سے انداز میں درخت کے تنے سے پشت لگالی۔

یہ پیڑ تو ویسا ہی گھنا تھا۔ اس کا سایہ ویسا ہی خنک اور شاداب تھا مگر اس کے اردگرد کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ اس کی چھاؤں کا سہاگ لٹ گیا تھا۔ اس کی رونقیں چھن گئی تھیں۔ اس کے سائے میں منظور اور ہاجرہ نے ہنس ہنس کر باتیں کی تھیں۔ ماں نے چرخا کاتا تھا۔ بابا حقہ گڑگڑاتا رہا تھا اور وہ خود بچپن کے معصوم معصوم کھیل کھیلتا رہا تھا۔ یہاں بھاگ بھری بھی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں چہکتی رہی تھی لیکن اب تو یہاں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ یہ ساری قربتیں، تمام چاہتیں ایک ایک کر کے چھن گئی تھیں۔ چپ چاپ ہمیشہ کیلئے زندگی سے نکل گئی تھیں۔ اسے تنہا چھوڑ کر...... اکیلے پن کے صحرا کے حوالے کر کے۔

”سجاول......!“ ایک پہچانی ہوئی سی آواز بہت قریب سے آئی۔

سجاول کو یہ بھی ایک دھوکا ہی لگا۔ اس نے آواز کی سمت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور اسی طرح چپ اور اداس کھڑا رہا۔

”سجاول!“ پھر اسی آواز نے پکارا اور پکار کر رو پڑی۔

سجاول نے نگاہ اٹھائی۔ رانی کا دلنشیں چہرہ اس کے مقابل تھا جس کی بادامی آنکھوں سے آنسو رخساروں پر بہہ گئے تھے۔ وہ اجنبی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے دکھے ہوئے دل میں کوئی لطیف جذبہ بیدار نہیں ہوا۔

”تو یہاں کیوں آگئی ہے؟“ وہ لاتعلقی سے بولا۔

رانی بے ساختہ سسکیوں سے رو پڑی۔

”سجاول...... تو کہاں چلا گیا تھا؟“ اس کے اندر کی لاانتہا محبت اس کے لہجے کی بے قراریوں میں امنڈ امنڈ کر سجاول کے پتھر دل میں گداز پیدا کرنے لگی۔

”سجاول...... تو کہاں چلا گیا تھا؟“ اس کی آنسو بھری آنکھوں، اس کے بھیگے ہوئے

رخساروں، اس کی رندھی ہوئی آواز نے ایک زخمی سا شکوہ کیا۔

سجاول نے اذیت سے ہونٹ کاٹے۔ وہ اسے کس طرح بتائے کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ وہ کن راہوں پر بہت دور نکل گیا ہے۔ اس نے کون سا راستہ چن لیا ہے۔ وہ لفظ ہی ڈھونڈتا رہا کہ اس کے سوال کا کیا جواب دے۔ جو اس کے قریب کھڑی اپنا حق سمجھ کر بڑے مان سے پوچھ رہی ہے کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ اسے کچھ اور نہیں سوجھا تو رکے سے لہجے میں بولا۔

”رانی! بس اب میں چلا ہی جاؤں گا۔ یہاں میرا ہے ہی کون؟“

رانی بھونچکی سی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تیزی کے ساتھ بہنے لگے۔ وہ بار بار شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے مضبوطی سے اس کی آستین تھام لی اور منت کرنے لگی۔

”ہائے سجاول! تجھے قسم ہے تو کہیں مت جانا۔ کہیں مت جانا۔ یہیں رہنا۔ میری آنکھوں کے سامنے۔“

سجاول کا دل اس کی طرف کھنچنے لگا۔ وہ خود کو اس کے سامنے بے بس سا محسوس کرنے لگا۔ اس کی روتی ہوئی آنکھیں۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو اسے کمزور کرنے لگے۔ مگر اس کے پاس آس کی کوئی جوت نہیں تھی جو اس کے دامن میں ڈال دیتا۔ اس نے بڑے ضبط کے ساتھ آستین اس کے ہاتھ سے چھڑا لی اور مضبوط لہجے میں بولا۔

”رانی!...... میں اپنے ساتھ تیری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔“

”اس طرح نہ کہہ سجاول؟“ رانی نے بے قراری سے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو پھر کس طرح سمجھاؤں تجھے؟“ وہ چڑچڑے پن سے کہنے لگا۔

”تجھے کیا پتہ میں کن حالات میں پھنسا ہوا ہوں۔ تو نہیں سمجھ سکتی کچھ نہیں سمجھ سکتی۔“

”سمجھ سکتی ہوں۔ سمجھ کیوں نہیں سکتی۔“ وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ”تو سمجھائے گا تو سمجھوں گی نا۔ تو بتاتا تو سہی۔ بتایا کیوں نہیں؟“

”کیا مصیبت ہے۔ اب میں ہر بات تجھے نہیں بتا سکتا۔“ وہ بے حد روکھے لہجے میں بولا۔

اسے رانی کی آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں کا سامنا کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی وحشت سر اٹھا رہی تھی۔ وہ پریشانی سے سر جھٹک کر بولا۔

”بس اب تو گھر جا۔ چل یہاں نہ آیا کرتو۔ جا شاباش اپنے گھر چلی جا۔“ وہ اس کا بازو تھپتھپا کر بولا۔

رانی نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کے بازو سے لگ گئی۔

”سجاول! سجاول! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو کتنا بدل گیا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تو آ جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پر تجھے تو میری پروا ہی نہیں۔ یہ دن آنے سے پہلے تو میں مر جاتی تو اچھا تھا۔ میں مر جاؤں گی سجاول۔ تم دیکھنا میں مر جاؤں گی۔ پر کسی اور کی ڈولی میں نہیں بیٹھوں گی۔ تم دیکھنا۔ میں جان دے دوں گی۔ میں مر جاؤں گی۔“ وہ اس کا بازو جھنجھوڑ کر بے ربط جملے کہتی چلی گئی۔

سجاول کے روئیں روئیں میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ رانی کی شوریدہ سر محبت جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنے دل اور روح کی گہرائیوں میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ ایک دم کسی طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بے تاب ہو کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور جلتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔ تو کسی کی ڈولی میں نہیں بیٹھے گی۔“

رانی نے ایک خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اس کے سینے سے اپنی پیشانی رگڑتی ہوئی بولی۔

”سجاول! سجاول! مجھے پتہ تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ تو آ جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ۔“ اس کا دلکش چہرہ اس کے اجلے رنگوں سے جھلملا رہا تھا۔

سجاول نے لمحے بھر کو اپنی ٹھوڑی اس کے گھنگھریالے بالوں پہ ٹکا دی۔ یہ لمحہ کتنا عزیز' کتنا خوبصورت اور دل نواز تھا۔ لیکن یہ اس کی تمام زندگی پر محیط نہیں ہو سکتا تھا۔ رانی اس کی بانہوں میں آسودہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کا راستہ تو کانٹوں سے بھرا تھا۔ اس کے راستوں میں تو کوئی جنت ایسا گھر اور محفوظ چھت نہیں تھی۔ جو وہ رانی کو اس کی بیش بہا محبت کے عوض دے سکتا۔ اس کے پاس اعتبار نہیں تھا۔ اس کے پاس یقین نہیں تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں آن پڑیں گی۔ کب وہ تختہ دار پر جا کھڑا ہو گا۔ اس سوچ نے اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس نے ہولے سے اسے آزاد کر دیا اور بجھے ہوئے لہجے میں رک رک کر کہنے لگا۔

”رانی! میرے پاس تجھے دینے کیلئے کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔“

رانی نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے اسے جھنجھوڑ دیا۔

”سجاول اس طرح کیوں کہتا ہے۔ بتا۔ تو کیوں کہتا ہے اس طرح۔ تجھے میرا خیال نہیں آتا۔“

اس کے انداز میں اتنے شکوے گھلے ہوئے تھے کہ سجاول اس سے نگاہیں چار کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔ اس نے رانی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ چوپٹ کھول کر گاؤں کے کتنے ہی لوگ اندر گھس آئے۔ ان میں سب سے آگے رانی کا باپ غصے سے سرخ چہرہ لئے چلا آتا تھا۔

رانی کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کا باپ غصے میں اس کی طرف بڑھا تو سجاول نے راستہ روک لیا اور بڑے تحمل سے بولا۔

”چاچا کیا بات ہے؟“

”واہ بھئی۔ تجھے ابھی پتہ ہی نہیں کہ کیا بات ہے؟“ کوئی طنزیہ لہجے میں بولا۔

”خبردار۔ بے گناہ لڑکی پر تہمت نہ لگانا۔“ سجاول نے ڈپٹ کر کہا۔ پھر رانی کے باپ سے مخاطب ہوا۔

”چاچا مہر! ان لوگوں کے کہے میں آ کر اپنی لڑکی کو بدنام نہ کر۔ تجھے پتہ ہے کہ میں تو یہاں ہوتا ہی نہیں ہوں۔ آج آیا ہوں تو یہ میری بھرجائی ہاجراں کی ایک امانت مجھے دینے آئی ہے اور بس۔ اتنی سی بات ہے۔ جس کو تم لوگ پتہ نہیں کیا سے کیا بنا رہے ہو۔“ سجاول نے یہ بات اتنے وثوق اور اعتماد سے رانی کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہی کہ وہ بھی متذبذب سا ہو کر اس کے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے معاملے کی اصلیت جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

مجمعے میں سے کچھ لوگ باتیں بنانے لگے مگر سجاول نے خود کو کمزور نہیں پڑنے دیا۔ اس نے بڑی جرأت سے رانی کے باپ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

”چاچا تو لوگوں کی طرف نہ دیکھ۔ مجھے بتا۔ تجھے اب بھی شک ہے تو میں تسلی کرا دیتا ہوں۔“

رانی کا باپ گومگو کی سی کیفیت میں کھڑا سر کو بے معنی سی جنبش دیتا رہا۔ سجاول نے زور دے کر کہا۔

''دیکھ چاچا! لڑکی بے قصور ہے۔ اسے کچھ مت کہنا۔ اب جا اسے اپنے ساتھ گھر لے جا۔'' وہ اتنا کہہ کر رہائش کی طرف مڑ گیا۔

رانی ہلدی ایسا زرد چہرہ لئے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ دوسرے لوگ اب بھی چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ رانی کا باپ سر جھٹک کر آگے بڑھا اور سہمی ہوئی رانی کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

......

سجاول نے سارے گھر پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی۔ یادوں کا ایک ہجوم سا اسے اپنی جانب ہمکتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ وہ جھنجھوڑ دینے والی یادوں میں زندہ چنا جانے لگا۔ اس نے گھبرا کر بلند اٹھتی دیواروں کو ڈھایا اور دروازے کو یونہی کھلا چھوڑ کر بغیر پلٹ کر دیکھے اکھڑتے ہوئے قدم لیتا بلا ارادہ ایک جانب چل پڑا۔

وہ چلتا رہا۔ کبھی تیز۔ کبھی مدھم۔ کبھی لڑکھڑاتا ہوا اور کبھی خود کو گھسیٹتا۔ خاموش، رنجور اور دل گرفتہ۔ نہ جانے وہ کب تک چلتا رہا۔ کسی سمت کا تعین کئے بغیر۔ کسی منزل کو نگاہ میں رکھے بغیر۔ نہ جانے کن سوچوں میں الجھا ہوا۔ تھکن سے چور چور۔ ٹوٹے ہوئے جوڑ بند کے ساتھ۔

دروازے کے قریب بھنگ کے نشے میں دھت پڑے ہوئے سائیں نے ادھر ادھر جھولتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نشے کی جھونک میں خود ہی ایک جانب لڑھک گیا۔

سجاول نے دروازہ دھکیلا اور استاد کی چارپائی پر پڑ رہا۔

وہ کتنی ہی دیر چت لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ اسے رانی کا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ اپنے قریب ہی کہیں محسوس ہوا۔ اس کی سسکیوں کی آواز اسے بار بار سنائی دیتی رہی۔ اس کی گرم سانس اس کو چھوتی رہی۔ اس نے دکھ اور محرومی کے کاٹ دینے والے احساس سے بیکل ہو کر آنکھیں میچ لیں اور تصورات میں جھلکتی اس کی واضح تصویر پر سے نگاہ ہٹا لینی چاہی لیکن اس کے رنگ اور شوخ اور واضح ہو گئے۔ وہ اس سے اور قریب آ گئی۔ اور قریب۔ بے حد قریب۔ اس کے پاس۔ اس کا سارا وجود اسے پکارنے لگا۔ اس کی طلب اسے کچوکے دینے لگی۔ اس کا بے چین دل اس کی آرزو میں مچلنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم قطرے بہہ بہہ کر تکئے میں جذب ہونے لگے۔

استاد نے اسے جگایا تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ استاد

کے گھر سے گرم گرم ناشتہ آ گیا تھا۔ گاڑھی لسی، پراٹھے، ساگ اور مکھن دیکھ کر اسے بھی کچھ بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ استاد نے مہربان نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔

''آ پتر۔ بسم اللہ کر۔''

وہ بغیر کچھ کہے اٹھا اور بے دلی سے تھوڑا سا کھا کر ایک طرف بیٹھا رہا۔ طبیعت پژمردہ سی ہو رہی تھی۔ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دنیا اجڑی اجڑی سی محسوس ہوتی تھی۔ گرد و پیش جیسے سناٹا سا چھا گیا تھا کسی طرف بھی دیکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

استاد کی تجربہ کار نگاہوں نے اس کی غیر معمولی خاموشی اور افسردگی کو محسوس کر لیا لیکن اس نے خود کچھ نہیں پوچھا۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف وقفے وقفے سے یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے دل کی کیفیات سے واقف ہو جیسے اس کے غمگین چہرے پر لکھی افسردہ تحریروں کو صاف صاف پڑھ رہا ہو۔ جیسے اس کی اداسی کا سبب جانتا ہو۔

اس نے اس روز اس کے ساتھ معمول سے زیادہ محبت اور اپنائیت کا برتاؤ کیا۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مختلف کاموں میں اس سے اس طرح مشورہ کرتا رہا جیسے ساری ذمہ داری اسی پر ہو جیسے اس پر بے پناہ اعتماد ہو۔

جب ذرا دن ڈھلا تو استاد نے اسے قریب بٹھا کر رازداری سے پوچھا کہ وہ آج رات کی واردات کیلئے تیار ہے یا نہیں۔ سجاول ابھی خاموش ہی تھا کہ وہ بڑی ملائمت سے بولا۔

''دیکھ پتر۔ اگر آج تیرا دل نہیں تو نہ سہی۔''

سجاول نے لمحے بھر کو سوچا۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

''دل کیوں نہیں استاد! آج ہی تو دل سے جاؤں گا۔''

اب بھلا اسے پروا ہی کس کی تھی۔ رانی اس کی زندگی سے جیسے چپکے سے نکل گئی تھی۔ سارے رشتے ایک ایک کر کے چھن گئے تھے۔ تو اب اسے کسی کیلئے نہیں رکنا تھا۔ اُسے کسی کا خیال نہیں رکھنا تھا۔ اسے مڑ کر نہیں دیکھنا تھا۔ اس کے اندر ایک پیکار سی جاری تھی۔ اس کے اندر کوئی بیٹھا اسے کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ اس کے روئیں روئیں میں الاؤ سے جلتے رہتے تھے۔ وہ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ میں گرد و پیش کی ہر شے کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور رات کیلئے تیاریاں کرنے لگا۔

* * *

زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل نکلی۔ حالات نے اسے ایک نیا روپ دے دیا تھا۔ وقت نے اسے ایک نیا انسان بنا دیا تھا جو اس سجاول سے بالکل مختلف تھا جو ماسٹر شکور کا بیٹا تھا جس نے اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ جو گاؤں کے گلی کوچوں میں سر جھکا کر گزرتا تھا۔ وہ اب ایک نیا سجاول تھا۔ جس کے دل میں بھری ہوئی نفرت قہر بن کر ٹوٹتی تھی۔ جس کے اندر انتقام کی آگ جوالا مکھی بن کر پھوٹتی تھی۔ جو سارے جہاں سے برگشتہ تھا۔ جو ہر کسی سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

استاد کہتا تھا کہ وہ قسمت کا دھنی ہے جس طرف جاتا ہے کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ جلد ہی وہ استاد کے نائب کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ اس پر اتنا اعتماد کرنے لگا تھا کہ اس نے سارا کام اس کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ اب ڈیرے کی بیٹھک میں بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دیتا اور حکم چلاتا۔

سجاول نے ڈیرے کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ اس نے بیٹھک کو نئے انداز میں آراستہ کیا۔ چارپائیاں نکلوا کر میز کرسیاں ڈلوائیں۔ اس کی صفائی ستھرائی کا انتظام کیا۔ بھنگی چرسی اور دوسرے نشہ باز جو ہر وقت وہاں جمگھٹا کئے ادھر ادھر رینگتے رہتے تھے انہیں نکال باہر کیا۔ پولیس والوں سے بھی اس نے اچھے مراسم پیدا کر لئے تھے۔ علاقے کے بارسوخ لوگوں سے بھی اس نے بنا کر رکھی تھی۔ اس نے استاد کے کام کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اس نے صرف قابل اعتماد لوگوں کو ہی اپنے ساتھ رکھا تھا اور بڑی ہوشیاری اور رازداری سے کام کرتا تھا۔

اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ نہ کسی کا خوف تھا۔ وہ ماضی کے رستے ہوئے زخموں کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اجڑے ہوئے گھر کے بدلے ساری دنیا کو اجاڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے چوہدری اور جاگیرداروں کے نام اپنے دل پر کھود لئے تھے۔ وہ ان سے ملتی جلتی صورتوں کو بھی مسخ کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سلگتے من کو تسکین دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اندر بھڑکتی آگ کو بجھانا چاہتا تھا۔ وہ انتقام کے راستے پر بہت دور تک نکل جانا چاہتا تھا۔

* * *

ایک عرصے بعد اس کا استاد کے گھر جانا ہوا تو گلابی کا دلکش چہرہ دیکھنا بہت اچھا لگا۔ وہ الھڑ پنے سے پاؤں دھرتی، چھاجھیں بجاتی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی اور ایک ناز آفریں غرور سے پوچھنے لگی۔

''تو کہاں تھا سجاول؟ بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے؟''

اس کے انداز کا تحکم نہ جانے کیوں سجاول کو برا سا لگا۔ اسے رانی کی ملائمت یاد آ گئی تھی۔ وہ کتنے پیار سے شکوہ کرتی تھی۔ وہ کیسے ڈر ڈر کر شکایت کرتی تھی۔ اسے خفا ہونا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اس کے خفا ہو جانے سے ڈرتی رہتی تھی۔

اور ایک یہ گلابی تھی جس کے ہر انداز میں تحکم اور سرکشی تھی۔ وہ بات کرتی تھی تو معلوم ہوتا تھا جیسے سر پھاڑ دے گی۔ اس کا جی چاہا کہ زور سے اس کے بال کھسوٹ ڈالے۔ بھلا وہ کون ہوتی تھی اس سے پوچھ گچھ کرنے والی۔

اس نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور چڑچڑے پن سے بولا۔

''میں تیری طرح فارغ بیٹھا مکھیاں نہیں مارتا۔ ہزار بکھیڑے ہیں میرے دیکھنے کے۔''

گلابی کا دلکش گلابی چہرہ تمتما سا گیا۔

''اچھا۔ میں مکھیاں مارتی ہوں۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''اور گھر کا سارا کام تیرا پیو کرتا ہے آ کر۔''

سجاول کو اور غصہ آ گیا۔

''باپ کا نام نہ لینا۔ سمجھی۔''

''کیوں؟'' گلابی نے بے ساختہ گالی بکی۔

''کیا کر لے گا تو میرا؟''

سجاول نے گالی کے جواب میں گالی ہونٹوں پر ہی روک لی اور کرختگی سے بولا۔

''میں تیری یہ گز بھر کی زبان کھینچ لوں گا۔''

''یہ رعب کسی اور کو دے جا کر کمینے۔'' وہ آگ بگولا ہو کر پے در پے کئی گالیاں بک گئی۔

سجاول نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور اسے بل دے کر اس کی کمر کے پیچھے لے گیا۔ گلابی دوہری ہو گئی لیکن نہ جانے کیوں چپ ہو گئی اور حیران آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔

سجاول نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر قہر آلود لہجے میں کہا۔

''اگر اب گالی بکی ناں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' ایک جھٹکے سے اس نے اس کا

بازو چھوڑا اور اسے ساکت سی کھڑی چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

...

اسے گلابی کے حسن، اس کی شوخیوں اور اس کے اغماض میں چھپے التفات سے کیا لینا تھا۔ اسے زندگی کی کوئی کشش، کوئی رعنائی اپنی جانب نہیں کھینچتی تھی۔ جینا اس کے لئے ایک عذاب اور سانس لینا ایک تہمت تھی۔ جب تک وہ اپنے گھر کی عزت اپنی بہن کا پتہ نہیں چلا لیتا تھا۔ وہ دن رات اسی خیال میں سرگرداں رہتا تھا اسی جستجو میں پاگلوں کی طرح یہاں وہاں دیکھتا پھرتا تھا۔

پھر اڑتی اڑتی سی خبر اسے یہ ملی تھی کہ بھاگ بھری کو نمبردار جیون کے آگے جوئے میں ہار دیا گیا تھا۔ اس بات نے سجاول کو پاگل سا کر دیا تھا کہ اس کی بہن کو تاش کا پتہ بنا دیا گیا تھا۔ اس نے جاگیردار کو خون میں نہلا دینا چاہا۔ وہ نمبردار کا منہ نوچ لینا چاہتا تھا۔ وہ اذیت دے دے کر اسے کتے کی موت مارنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بھرے بازار میں سنگسار کرنا چاہتا تھا۔

نمبردار نے اس کی آنکھ میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹتے دیکھ لی تھیں۔ اس کے انداز، اس کے لہجے میں اسے خنجر کی سی کاٹ نظر آئی تھی۔ وہ کچھ سنبھل گیا اور گھور کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اکھڑ پنے سے بولا۔

"کیوں اوئے۔ تو کن چکروں میں ہے جوان؟"

سجاول نے بمشکل خود پر قابو پایا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"مجھے کسی لڑکی کے وارثوں نے بھیجا ہے۔ اس کی ماں اس کے غم میں مر گئی ہے۔ اس کا باپ اسے ڈھونڈنے نکلا تھا آج تک واپس نہیں آیا۔ پتہ نہیں مر کھپ گیا یا عزت کے خوف سے کہیں منہ چھپا کر بیٹھا ہے۔ تم بس اتنا بتا دو کہ وہ لڑکی ہے کہاں؟"

"اوئے یارا!" وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"تو کیا گڑھے مردے اکھاڑنے آ گیا ہے۔ ہم کوئی حساب رکھتے ہیں کہ کون کہاں سے آئی ہے اور کدھر گئی ہے۔ یہاں تو کتنی آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔"

سجاول نے اذیت سے ہونٹ کاٹ کر پوچھا۔

"پھر بھی کوئی اتہ پتہ؟"

"کیا اتہ پتہ؟" وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"جوئے کا مال کتنے دنوں ہاتھ تلے رہتا ہے؟ جس طرح آتا ہے اسی طرح چلا جاتا

ہے۔"

سجاول اپنی جگہ بیٹھا نہ رہ سکا۔ مٹھیاں بھینچتا اور ہونٹ چباتا وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ نمبردار بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب آ کر نپے تلے لہجے میں بولا۔

"دیکھ یارا صاف صاف بات ہے۔ اگر تو جگہ جگہ کھجل خراب نہیں ہونا چاہتا تو جا کر کسی کوٹھے شوٹھے پر پتہ کر۔ ایسی عورتوں کو کوئی گھر تو نہیں ڈال سکتا۔ ہر پھر کر وہیں پہنچ جاتی ہیں۔"

سجاول کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے بغیر کچھ سوچے بپھرے ہوئے شیر کی طرح پلٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"کیا بکواس کر رہا ہے تو؟" وہ دانت کچکچا کر کئی گالیاں بک گیا۔

"ارمان سے کاکا! ارمان سے۔" نمبردار نے بغیر کسی گھبراہٹ کے اپنا گریبان کھسوٹتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تجھے جان سلامت چاہئے کہ نہیں؟" اس کے انداز میں گہرائی اور تجربہ تھا۔ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ شکرے کی طرح ہوشیار تھا۔

سجاول نے خود پر قابو پا لیا۔ اسے تو بہت دور تک جانا تھا۔ وہ نمبردار سے الجھ کر اپنی راہ کھوٹی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک بار نمبردار کی چمکتی ہوئی متحرک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کڑے لہجے میں لفظ چبا چبا کر کہا۔

"اچھا۔ زندگی رہی تو کبھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالیں گے۔" اور ایک جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

...

بالا خانے کی چھوٹی چھوٹی چند سیڑھیاں چڑھنے ہی میں وہ ہانپ گیا۔ اس کے اعصاب جیسے اس کے قابو میں نہیں تھے۔ اس کے سر پر وحشت سوار تھی۔ موسیقی کی تیز آواز گھنگھروؤں کے ملے جلے شور کے ساتھ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہی تھی۔ اس کے سارے جسم کا خون اس کے چہرے پر جمع ہونے لگا تھا۔

اسے پتہ چلا تھا کہ اس کوٹھے پر جو لڑکی رقص کرتی ہے۔ پہلے اس کا نام بھاگ بھری تھا۔ لیکن اب اس نے اپنا نام بدل کر ستارہ رکھ لیا ہے۔ یہ سن کر ہی اس پر قیامت گزر گئی تھی۔ اس نے مجنونانہ کیفیت میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی عزت کے ماتھے سے یہ داغ مٹا کر رہے

گا۔ وہ اپنے خاندان کو یوں سربازار رسوا نہیں ہونے دے گا۔ اگر وہ اس کی بہن بھاگ بھری ہے تو یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

اسے بھاگ بھری کے خدوخال صحیح طور پر یاد نہیں رہے تھے۔ وہ اس کا تصور کرتا تھا تو سوائے اس کی روتی ہوئی آنکھوں کے کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ جس حال میں بھی ہوئی وہ اس کو پہچان لے گا۔

تیز چمکتی ہوئی روشنیوں میں جیسے وہ اندھا سا ہو گیا تھا۔ اس کا سارا وجود جھنجھنا اٹھا تھا۔ اس کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے ہجوم کی آنکھیں اسی پر لگی ہوئی ہیں۔ طنز بھری، تمسخر اڑاتی حقارت لئے ہوئے دل و جان میں نشتر بن کر اتر جانے والی نگاہیں۔ اپنی ہی نگاہوں میں ہیچ کر دینے والی نظریں۔ سب اسی کی جانب تک رہی تھیں۔ یوں جیسے جانتی ہوں کہ بھری محفل میں ناچتی ہوئی، ادائیں بیچتی عورت اس کی ماں جائی، اس کا خون اور اس کے خاندان کی عزت ہے۔

سجاول کی پیشانی پسینے سے بھیگنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والی بیکلی اس کے وجود کو ڈھانے لگی۔ گھنگھروؤں کی چھنک اور اٹھتے ہوئے قدموں کی دھمک اس کے دل پر پڑنے لگی۔ بھڑکیلے کپڑوں میں لپٹی دائرے میں گھومتی ہوئی عورت کے ساتھ ہر شے گھومنے لگی۔ سجاول کو چکر آنے لگے۔ اس نے دل پر جبر کر کے کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ غزل کے کسی شوخ مصرعے کے ساتھ اپنی نازک گردن کو بار بار جنبش دے رہی تھی۔ اس کا رخ کئی بار سجاول کی جانب ہوا۔ لیکن بے تحاشہ میک اپ سے چمکتے ہوئے چہرے پر کوئی نقش ایسا نہیں تھا جو سجاول سے پہچانا جا سکتا۔ اس کا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے میک اپ اور چمک دمک کی وجہ سے اسے نہیں پہچان پا رہا یا وہ واقعی بھاگ بھری نہیں ہے۔

اس نے قریب بیٹھے ہوئے ایک تماش بین کا زانو دبایا۔ ”ناچنے والی کا کیا نام ہے؟“

وہ اس کی اداؤں میں اتنا محو تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔ سجاول نے زور سے اسے ٹہوکا دیا اور اپنا سوال دہرایا۔ ”ناچنے والی کا نام بتاؤ۔“

اس نے جھوم کر سر دھنا اور پان چباتا ہوا بولا۔ ”ہمیں نام سے کیا لینا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ کم بخت ناچتی ہے کہ غضب ڈھاتی ہے۔“ وہ اتنا کہ کر پھر محفل میں گم ہو گیا۔

سجاول کے دل پر قیامت گزر گئی۔ ساری محفل کی آنکھیں اس کے تھرکتے ہوئے جسم پر تھیں۔ جو نہ جانے کس کے گھر کی عزت تھی۔ لوگ جھوم رہے تھے۔ نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سجاول کا سارا جسم جیسے انگاروں سے داغا جانے لگا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ گیا۔ چاروں طرف دیکھتا ہوا وہ بظاہر دروازے کی طرف چلا۔ وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا۔ جو اس بازار کی جنس بن جانے والی تمام عورتوں سے واقف ہو۔ جو اسے ان کے اصلی نام بتا سکے۔

وہ ابھی اسی کوشش میں تھا کہ داد و عیش کے شور میں رقص ختم ہو گیا۔ رقاصہ گھنگھرو بجاتی، جھک جھک کر سلام کرتی۔ قریب ہی ایک دروازے کی چلمن اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔ تماشائیوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ ستارہ کا نام ایک گونج سی بن کر چاروں طرف پھیل گیا۔ سجاول ٹھٹک کر رک گیا۔ اور غور سے دیکھنے لگا تو گویا ناچنے والی کا نام ستارہ نہیں تھا۔

ستارہ! تو گویا ستارہ کوئی اور تھی۔ سجاول ایک بار پھر سولی پر چڑھ گیا۔ وہ ستارہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ جیسے جیسے تماشائی اس کا نام لے کر آہیں بھرتے اور اسے بلانے کا تقاضا کرتے تھے ویسے ویسے سجاول جیسے قتل ہو رہا تھا۔

سامنے قطار میں بنے ہوئے کمروں میں سے ایک کی چلمن ہٹی اور ایک سیاہ فام ہٹا کٹا آدمی باہر نکلا اور نائیکہ کے کان میں کچھ پھونک کر پھر چلمن کے پیچھے غائب ہو گیا۔

نائیکہ معذرت کرنے لگی کہ آج ستارہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے وہ محفل نہیں سجا سکے گی۔ تماشائیوں کے چہروں پر مایوسی کی گرد چھا گئی۔ کچھ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ وہیں بیٹھے حجت کرنے لگے کہ اگر ستارہ رقص نہیں کرنا چاہتی تو گانا ہی سنا دے۔ یہ بھی نہیں تو دیدار ہی کرا دے۔

نائیکہ پہلے تو ہنس ہنس کر انکار کرتی رہی پھر اس کے تیور بدلے اور وہ سختی سے بات کرنے لگی۔ چند ایک جو نشے کی ترنگ میں اس کمرے کی جانب بڑھنا چاہتے تھے۔ جہاں ستارہ تھی انہیں اپنے آدمیوں سے اٹھوا کر باہر پھنکوانے لگی۔

سجاول کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے آیا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کہیں وہ بھاگ بھری تو نہیں تھی؟ جو اسے پہچان کر اس کے سامنے آنے سے کترا رہی تھی۔ اس لرزا دینے والے خیال کے آتے ہی اسے کسی کی پروا نہیں رہی۔ وہ دیوانہ سا ہو آیا۔ اس پر ایک دھن سوار ہو گئی۔ اس کے سر میں ایک ہی سودا سما گیا کہ اسے کسی نہ کسی طرح

ستارہ تک پہنچنا ہے۔ یہ جاننے کیلئے کہ کہیں وہ بھاگ بھری تو نہیں۔

ہجوم چھٹنے سے پہلے ہی وہ دوسروں کی نظر بچا کر ایک نسبتاً تاریک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اسباب کی بہتات اور بے ترتیبی سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کمرہ سٹور یا گودام کا کام دیتا تھا۔ وہ سانس روکے وہیں ایک طرف چھپا ہوا بیٹھا رہا۔

ایک ایک لمحہ ایک ٹیس سی بن کر اس پر ٹوٹتا رہا۔ اسے اپنے پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن اس احساس نے اس پر جانکنی کی سی کیفیت طاری کر رکھی تھی کہ ستارہ اس کی بہن بھاگ بھری ہے۔ وہ سزائے موت کے مجرم کی طرح اس کال کوٹھڑی میں بیٹھا نہ جانے کب تک جان لیوا لمحوں کا زہر قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارتا رہا۔ اور یہ اندازہ لگاتا رہا کہ کب باہر کی جاگتی فضا کی رونقیں اونگھنے لگتی ہیں۔ کب نغموں کے چراغ گل ہوتے ہیں۔ کب گھنگھروؤں کی صدا ڈوبتی ہے۔

آہستہ آہستہ شور کم ہوا۔ روشنیاں گل ہونے لگیں۔ کمروں کی طرف جاتے ہوئے قدموں کی چاپ، دروازوں کے بند ہونے کی آوازیں اور دبی دبی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ دروازے کے قریب آ کر ہوا کو سونگھتا رہا۔ آوازوں کو سنتا اور فاصلوں کا اندازہ لگاتا رہا۔ پھر اپنا اطمینان کر کے محتاط قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

اندھیری راہداری میں سے ہوتا ہوا کمروں کی اس قطار کی طرف بڑھا۔ جہاں چلمنوں کے پیچھے چراغ ٹمٹمارہے تھے۔ روشنیاں جلتی بجھتی تھیں۔ کھنکتی ہوئی ہنسی اور قہقہے لپکتے تھے۔ برآمدے میں سے کسی کے حقہ گڑگڑانے اور کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب نامانوس سی بو رچی ہوئی تھی۔ ماحول میں اکتا دینے والا بوجھل پن اور حبس تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا بچتا بچاتا اس کمرے کی طرف بڑھا۔ جسے لوگ ستارہ کا کمرہ کہہ رہے تھے۔ اسے ایک لمحے کو یہ خیال بھی آیا کہ ستارہ کمرے میں تنہا نہیں ہوگی۔ مگر اسے کسی خطرے کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر قیمت پر یہ پتہ چلانا چاہتا تھا کہ اس کے خاندان کی عزت اس نیلام گھر کی زینت تو نہیں۔

وہ دبے پیروں کھڑکی کے قریب پہنچا اور بڑی احتیاط سے سانس روک کر اندر جھانکا۔ پردے کی کھلی درزوں میں سے وہ اندر بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی اور تنہا معلوم ہوتی تھی۔ سجاول نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے چاقو کو ٹٹولا اور چپکے سے کمرے میں اتر گیا۔ وہ رخ پھیرے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ شاید کسی خیال میں گم تھی۔ جب ہی وہ اس کی آہٹ سے چونکی تک نہیں۔

سجاول نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا اور پورے زور سے اسے اپنی جانب گھما کر بولا۔ ''بھاگ بھری...... یہ تو نے کیا کیا۔''

سجاول کی نگاہ اس کی خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے ملی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بھاگ بھری کی آنکھیں نہیں تھیں۔ مایوسی نے اسے بیدم سا کر دیا۔ اس نے غصہ سے اسے وہیں چھوڑ دیا اور خود پلٹ کر کھڑکی کی طرف چلا۔

''ٹھہرو۔ ذرا ایک منٹ رکو۔'' اس نے عقب سے پکارا۔

سجاول نے مڑ کر دیکھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی قریب آئی اور بولی۔ ''کاش میں وہ بھاگ بھری ہوتی جس کی تلاش میں تم آئے ہو۔''

سجاول نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ پوچھنے لگی۔

''بھاگ بھری تمہاری کیا لگتی ہے۔''

سجاول کا دم الجھنے لگا۔ عزتوں کے اس نیلام گھر میں کھڑے ہو کر وہ کس طرح اقرار کرتا کہ یہاں وہ اپنی بہن کو تلاش کرنے آیا ہے۔ اس نے ضبط کی کوشش میں ہونٹ کاٹے اور چلنے کے ارادے سے پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آئی اور پر تجسس لہجے میں بولی۔ ''یوں لگتا ہے جیسے بھاگ بھری تمہاری بہن ہے۔''

سجاول گڑبڑایا۔ لمحے بھر کو رکا مگر بولا کچھ نہیں۔ وہ اور قریب آ گئی اور بڑی حسرت سے بولی۔

''اگر میرا بھائی بھی تیرے جیسا ہوتا۔ تو میں اس عذاب میں دن رات نہ جلتی لیکن وہ تو کسی چنڈو خانے میں نشے میں دھت پڑا ہوگا۔ اسے تو شاید یہ بھی خبر نہیں کہ اس کی بہن کس جہنم کا ایندھن بن گئی ہے۔''

سجاول نے تصدیق کرنے کو اس کی طرف دیکھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا مکر کر رہی ہے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر سچ کی اذیت تھی۔ اس کی اداس آنکھوں میں حقیقت کے کربناک آنسو تھے۔ اس کی کٹیلی آنکھوں میں سجا ہوا کاجل پھیل رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی اس کے مقابل آ گئی اور آنچل سے اپنی نم آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ مجھ جیسی مجبور عورت کے دکھوں کے دن کٹنے والے ہیں۔ تم اسے اسی طرح تلاش کرتے رہے تو ایک روز ضرور اسے اس جہنم سے چھٹکارا دلا دو گے۔''

سجاول کو اس سے کوئی ہمدردی تو نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اسے ایک نا قابل فہم دکھ کا احساس ہوا۔ جو اس کے دل کی گہرائیوں میں سے ہولے ہولے پھوٹنے لگا۔ اس نے پھر ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر ہنس رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں تک آ گئے تھے۔ سجاول کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے قدرے ملائمت سے کہا۔ ''تو یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتی؟''

''بھاگ کر کس کے پاس جاؤں۔ میرا تو کوئی نہیں۔'' اس نے پھیلے ہوئے کاجل والی آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''کہیں بھی چلی جا۔ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال۔ عزت کی روکھی سوکھی اس روز روز کے گناہ سے بہتر ہے۔''

''اس کوٹھے سے باہر ہمارا ٹھکانہ کہیں نہیں ہے۔'' وہ آہ سی بھر کر بولی۔

سجاول بھنا گیا۔ ''یوں کیوں نہیں کہتی الو کی پٹھی کہ منہ کو حرام لگ گیا ہے۔''

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''حرام کا نوالہ جلدی حلق سے اترتا ہے نا۔''

سجاول کو بہت برا لگا۔ اس نے گھور کر ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ ہنستے ہنستے یکدم خاموش ہو گئی اور ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''یہاں سے بھاگ کر بھی دیکھ لیا ہے۔ شریفوں کی بستی میں ہمارے لئے کہیں پناہ نہیں ہے۔ وہاں تو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی اور کرنا یہی کچھ پڑتا ہے۔'' اس نے سر جھٹکا اور تلخی سے بولی۔

''اس جہنم سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

سجاول کو ایک نا قابل برداشت گھٹن کا احساس ہوا۔ بھاگ بھری کے خیال نے اسے تڑپا دیا۔ ستارہ کے لہجے کا دکھ، اس کے چہرے کا کرب، اس کی آنکھوں کی محرومی، اس کے شب و روز کی اذیت اسے یہ سب کچھ بھاگ بھری پر بیتتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ تصور اسے بے کل کر دینے کیلئے کافی تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کی تلاش میں نکل جانا چاہتا تھا تاکہ اسے جہنم کے اس دکھ سے نجات دلا سکے۔ وہ بغیر کچھ کہے جانے کے لئے پلٹا۔ لیکن ستارہ اس کے راستے میں آ گئی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میری آن، میرا اعتبار، میرا سب کچھ اس بازار میں نیلام ہو گیا ہے۔ میرے پلے تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اگر میں ایک بات کہوں تو کیا تم یقین کر لو گے۔''

''ہاں...... کہو۔'' سجاول نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ہولے سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ میں تمہیں کہہ سکوں کہ پھر بھی یہاں آنا۔ میں پاک دامن بھی نہیں ہوں جو تمہیں کہوں کہ مجھے یاد کر لینا۔ میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟ تمہارے دل میں کیا ہے؟ اگر تم یقین کرو تو میں تمہیں اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ میری روح اب بھی اس معصوم لڑکی کی روح ہے جس کا نام اس کے ماں باپ نے بڑے چاؤ سے بھاگ بھری رکھا تھا۔ اس روح کا ستارہ کے گناہگار جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی واسطہ نہیں۔ یہ معصوم روح ہمیشہ تمہیں یاد رکھے گی۔''

سجاول نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بات کو وہ صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔ وہ اسے سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کی دراز پلکوں پر جو آنسو لٹکے تھے۔ وہ جیسے اسے بھاگ بھری کی تصویر دکھا رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں بھاگ بھری کا روتا ہوا عکس ڈوب رہا تھا۔ وہ دکھ اور اذیت کی نا قابل بیان کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے پاس کہنے کیلئے ایک لفظ بھی نہیں رہا۔ وہ نہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ نہ سننا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف اور صرف بھاگ بھری تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا اور ہونٹ چباتا ہوا جس راستے سے آیا تھا اسی سے باہر نکل گیا۔

وہ دیوانوں کی طرح بھاگ بھری کو جگہ جگہ ڈھونڈتا پھرا۔ یہاں، وہاں دور و نزدیک۔ ہر جگہ۔ چپے چپے میں، قریہ قریہ۔ اس کی تلاش میں اس نے دن رات ایک کر دیئے۔ لیکن ناکامی جیسے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ مسلسل تلاش کا حل کچھ بھی نہیں تھا۔ کہیں کوئی کھوج نہیں ملتا تھا۔ کوئی امید نہیں بندھتی تھی۔ ہر روز آس کا دیا جلتا اور بجھ کر اندھیرے کا احساس بڑھا دیتا۔ زندگی ایک مسلسل تلاش بن گئی تھی۔

وہ صبح کہیں ہوتا اور شام کہیں۔ رشتوں کی کسک اسے دوڑائے لئے جاتی تھی۔ اس کے چہرے پر نامرادیوں کی گرم راکھ ہر لحظہ بکھرتی رہتی تھی۔ اسے کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خلاف برسرپیکار نظر آتا تھا۔ کامیابی کی کوئی راہ نہیں سوجھتی تھی۔

اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بھاگ بھری کی تلاش میں دنیا کے آخری کونے تک جانا چاہتا تھا۔ وہ ہر قدم پر چاروں طرف دیکھتا ہوا چلتا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک جاتا اور ٹھٹک کر دیکھتا شاید کہیں بھاگ بھری کا کوئی اتہ پتہ مل جائے۔ کہیں اس کی جھلک نظر آ جائے۔ اس کی کوئی نشانی مل جائے۔

ڈیرے سے وہ تقریباً لاتعلق ہو گیا تھا۔ وہ وہاں بہت کم نکلتا تھا۔ اکثر کئی کئی روز غائب رہتا تھا۔ استاد اس کی اس عدم دلچسپی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ استاد اس کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اب اسے نئے سرے سے کام سنبھالنا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

ڈیرے کے دوسرے لڑکے کہتے تھے کہ اسے بازار حسن کا چسکا پڑ گیا ہے۔ وہ صبح ایک کوٹھے پر ہوتا ہے تو شام دوسرے پر۔ رنڈیوں پر دولت اجاڑنے کے سوا اسے کوئی اور کام نہیں۔ اس بات نے استاد کو اور بھی زیادہ فکرمند کر دیا تھا۔ وہ تو اس پر بھروسہ کر کے غافل ہو چلا تھا۔ اپنی تمام تر ذمہ داریاں اس پر ڈال کر اسی پر انحصار کرنے لگا تھا۔ وہ پرانا گھاگ اور مردم شناس تھا۔ اسے بندہ پرکھنے میں کبھی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن سجاول کے معاملے میں

اسے خود پر شک ہونے لگا تھا۔

سجاول کی وجہ سے ڈیرے کے دوسرے لڑکے بھی پر پرزے نکالنے لگے تھے۔ استاد اتنے عرصے سے قائم کیا ہوا اقتدار اپنے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سجاول سے براہ راست بات کرنے کی ٹھانی۔ ایک روز جب سجاول خلاف توقع شام کو ہی ڈیرے پر آ گیا تو استاد نے بظاہر بڑی نرمی اور مفاہمت کے لہجے میں اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ آج کل کہاں رہتا ہے؟ دوسرے لڑکے بھی چوکنے ہو گئے اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

سجاول نے ایک بار سر اٹھا کر استاد کی طرف دیکھا اور خاموش ہی رہا۔ یوں جیسے بات کرنے کو جی نہ چاہتا ہو۔ اس کے سارے وجود پر جیسے تھکاوٹ اور اضمحلال کی گرد سی پڑی ہوئی تھی۔

''اپنا تو خیال ہے سجاول کسی لمبی مار پر ہے۔'' شاہو نے دوسروں کو آنکھ مار کر کہا۔

''بھئی واہ۔ پھر تو ہمارا حصہ بھی ہو گا۔'' مستانے نے تمسخر سے کہا۔

''بادشاہو! تھوڑا راشن پانی ہمیں بھی دینا۔'' کسی نے لقمہ دیا۔

''یاروں کا بھی دھیان رکھنا پاء جی۔'' کوئی اور بولا۔

سجاول نے گھور کر سب کی طرف دیکھا اور استاد کو تلخی سے مخاطب کیا۔

''استاد جی! یہ ان شہدوں کی رسیاں کس نے ڈھیلی کر دی ہیں۔''

مستانہ بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور پھنکارتا ہوا بولا۔

''استاد تیرا خیال نہ ہو تو قسم اللہ پاک کی ابھی اس کی گردن مل دوں۔''

سجاول نے تیوری چڑھائی۔ ''میں تم جیسوں کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو استاد کرے۔ تم میں سے کسی نے کوئی بکواس کی تو میں زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔''

سارے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ شکرا دانت پیس کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد نے گالی دے کر اسے خاموش کروا دیا اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''تو چھوڑ ان کو یار...... تو اپنی سنا کہ آج کل کہاں غائب رہتا ہے۔ کم از کم ہمیں کچھ پتہ ٹھکانہ تو معلوم ہونا چاہیے۔''

''بس استاد۔'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سب تقدیر کے چکر ہیں۔ مقدر کی ٹھوکریں ہیں جس طرف لے جاتی ہیں چل پڑتے ہیں۔"

استاد کو اس کے شکستہ لہجے اور دکھی چہرے نے سب کچھ سمجھایا۔ لیکن اس کے دل سے شبہات نہیں نکلے۔ وہ ایک ایک لفظ تول کر بولا۔

"دیکھ کاکا! تو ہمارے ڈیرے کا بندہ ہے۔ تیری ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہم تیرے بھلے کو ہی کہتے ہیں۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے اور تو رنڈیوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ یہ بے وفا مخلوق بھلا کب کسی کی ہوئی ہے۔"

"رنڈیوں کی ایسی تیسی۔" سجاول نے گالی دے کر کہا۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں ان الو کی پٹھیوں پر۔ میں وہاں جاتا ہوں تو کسی اور مقصد سے۔ کسی اور وجہ سے۔ میں وہاں عیاشی کرنے نہیں جاتا۔ وہاں پیسہ نہیں اجاڑتا۔ لیکن تجھ سے جنہوں نے یہ چغلیاں لگائی ہیں کبھی ان کا بھی حساب کتاب لیا ہے تو نے یا میں بتا دوں۔"

مستانے اور شکرے نے سانس روک کر ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کئے۔ ان کے دوسرے ساتھی نگاہیں چرانے لگے۔ استاد نے گھور کر ان کی طرف دیکھا اور ان کے جھکے ہوئے سر دیکھ کر وہ غصے سے پھنکارا۔

سجاول نے اس کے کچھ کہنے کا انتظار نہیں کیا۔ اور ان سب کے کچے چٹھے کھولنے لگا۔ وہ تعجب اور حیرت سے گنگ ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سجاول ان کے تمام رازوں سے اس حد تک واقف ہے۔ استاد سے رہا نہیں گیا۔ وہ کڑے لہجے میں بولا۔

"کیوں اوئے۔ وڈے شریف زادیو! اب بولو۔ کچھ کہو۔"

خجالت سے ان کی گردنیں جھک گئیں۔ وہ چپکے چپکے ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر اور زانو دبا کر استاد کی بات کا جواب دینے پر اکسانے لگے۔ آخر شکرے نے ہمت کی اور تھوک سے حلق تر کر کے بولا۔

"استاد جی۔ ہم کوئی صوفی تو نہیں۔ دو گھڑی کہیں دل خوش کر لیتے ہیں تو کسی کے کلیجے میں کیوں پیڑ اٹھتی ہے۔ جان ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں۔ کیا خبر کب پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں اور جیلوں میں چکیاں پیستے پھریں۔ ایک آدھ دن موج کر لیتے ہیں تو کسی کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔"

استاد نے دانت پیس کر حد درجہ رکیک گالی بکی۔ جسے برداشت کرنے کو شکرے نے

بھی خاصے ضبط سے کام لیا۔

"بات کرنی آتی نہیں اور ماں کے بدمعاش بنے پھرتے ہیں۔ اس ڈیرے پر آج تک کوئی چھاپہ نہیں پڑا اوئے تو کس لئے...... کوئی ہماری طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ تو کیوں؟ پولیس والے میرے مامے تو نہیں لگتے۔ اس ڈیرے کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔ اس لئے کہ میں نے کبھی تمہاری طرح آوارگیاں نہیں کیں۔ چار پیسے دیکھ کر مجھے رنڈیوں کے خواب نہیں آتے۔ آج میرا ہاتھ تمہارے سر پر نہ ہو تو پولیس تمہاری کھال کھینچ دے۔"

سبھی نے سر جھکا لئے۔ استاد کی گالیوں کے جواب میں وہ بظاہر خاموش رہے۔ لیکن بار بار سرکشی کے ساتھ ترچھی نگاہوں سے یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے جیسے آپس میں کچھ طے کر رہے ہیں۔ سجاول ان سب پر ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈال کر بیزاری سے اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

گھنگھروؤں کی صدا مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ گانے والی کی آواز نامانوس تھی۔ لیکن اس میں بلا کا سوز اور رس تھا۔ اس کی لے میں ایسا گداز تھا جو دل میں مسرت کا احساس جگانے کے بجائے ایک چرکا سا لگا دیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سر نہیں لگا رہی آنسو بانٹ رہی ہے۔

بختاور کافی دیر سے اس کی آواز سن رہی تھی۔ اس کے دل کی اداسیاں گھنگھور ہو رہی تھیں۔ درد میں رچی ہوئی لے اس کے انگ انگ میں ٹیسیں سی جگا رہی تھی۔ گھنگھروؤں کا شور، سازوں کی آواز، طبلے کی سنگت اور تماشائیوں کی داد و تحسین جیسے اس آواز کے تقدس اور حسن کو زخمی کئے دیتی تھی۔ اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے کئی بار سوچی ہوئی بات کو پھر افسردگی سے سوچا۔ من کو چھلنی کر دینے والے سوال کو خود سے پھر پوچھا۔ یہ اس کے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ اس ساری فضا کا حصہ کیوں ہے؟ وہ اس متعفن ماحول میں سانس لینے پر کیوں مجبور ہے۔

ثریا کمرے میں داخل ہوئی اور بخت آور سے بولی۔ "بختو!...... اماں پوچھ رہی ہے کہ تم نے چلنے کی تیاری کر لی ہے؟"

بخت آور متوجہ نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح مغموم سی بیٹھی گانے والی کی آواز سنتی رہی۔ ثریا نے کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ اس کی بات ان سنی

کرتے ہوئے بولی۔

"ثریا! یہ باہر کون گا رہا ہے؟"

"یہ زینت ہے۔" وہ بولی۔ "کل رات ہی زمان پور سے آئی ہے۔ گلے میں خدا نے نور دیا ہے۔ ناچ میں ذرا مات کھاتی ہے۔ مگر گاتی خوب ہے۔ اماں کہتی ہے چل جائے گی۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گی۔" وہ مسرت سے چہچہاتے ہوئے بولی۔

"پتہ ہے بڑے ٹھاٹھ کا مجرا ہوگا۔ مزہ آجائے گا۔ سنا ہے دور دور سے بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے آئیں گے۔ پھر اماں دیکھنا کیا کمال دکھاتی ہے۔"

بخت آور نے بیزاری سے اس کے لبوں سے یہ تذکرہ سنا اور سوچنے لگی کہ ثریا نے اسی گھنگھروؤں سے گونجتی چار دیواری میں آنکھ کھولی ہے۔ اسے اتنا شعور بھی نہیں کہ اس سے تقدس کے سارے رشتے چھین کر اسے ہوس کے مکروہ بندھن میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ نائیکہ کی بیٹی تھی۔ یہیں پلی بڑھی تھی۔ شاید وہ یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ اس چار دیواری کے باہر زندگی کسی اور طرح سے بہتی ہے۔

ثریا چند لمحے اسے یوں افسردہ اور کسی سوچ میں گم دیکھتی رہی۔ جب وہ کافی دیر متوجہ نہیں ہوئی تو وہ ناگواری سے بولی۔

"بختو! یہ تجھے کیا ہو جاتا ہے۔ کبھی تو بات دھیان سے سن لیا کرو۔ اماں کہہ رہی ہے کہ تیاری وقت پر کر لینا۔ درزی کو نئے کپڑوں کا ماپ دے آنا۔ کوئی زیور کم ہے تو بنوا لینا۔ عین وقت پر کوئی بات نہ یاد آئے۔ اچھا۔"

بخت آور نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سر کو بے معنی سی جنبش دی۔

ثریا جانے کے خیال سے اٹھی۔ لیکن ابھی وہ دروازے تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ اچانک باہر شور سا مچ گیا۔ چیزیں ٹوٹنے اور مار پیٹ کی آوازوں کے ساتھ مغلظات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ثریا لپک کر چلمن میں سے جھانکنے لگی۔ بخت آور وہیں بیٹھی رہی۔ یہ تو یہاں اکثر ہوتا ہی رہتا تھا۔

کبھی پیسوں پر، کبھی لین دین پر، کبھی کسی اور بات پر یہاں جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے۔ گالیوں کا طوفان بپا ہوتا ہی رہتا تھا۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور تیزی سے چلمن ہٹا کر گھنگھرو چھنکاتی لڑکی اندر گھس آئی۔ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور دروازے سے پشت لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ وہ بے حد خوفزدہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی

پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی۔

بخت آور کو اس کی صورت کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہو رہی تھی۔ مگر یاد نہیں آتا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ اس نے بھی دراز پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ چند لمحے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ پھر چند قدم اس کی طرف بڑھی اور سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"ہائے مر جاؤں۔ تو کہیں بھاگ بھری تو نہیں؟"

بخت آور گھبرا کر پیچھے ہٹی اور بھونچکی سی ہو کر اس کی جانب تکنے لگی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ زینت نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"بتا کہیں تو بھاگ بھری تو نہیں۔ اللہ نہ کرے۔ کہیں تو بھاگ بھری تو نہیں؟"

دو شفاف آنسو بخت آور کی خوبصورت آنکھوں سے بہہ کر رخساروں تک آ گئے۔ وہ انکار یا اقرار میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ گناہ کے اس بازار میں شناسائی کا یہ لمحہ بڑا جان لیوا تھا۔ زینت کے ہونٹوں کو چھوتا ہوا یہ نام اس جگہ کی گندگی کے احساس کو اور بڑھا رہا تھا۔ زینت کا چہرہ کسی اور چہرے کی یاد دلاتا تھا۔ مگر یاد نہیں آتا تھا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔

بخت آور نے بجھے ہوئے سے لہجے میں پوچھا۔

"تو کون ہے؟ میں نے پہچانا نہیں؟" زینت نے یکبارگی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیوں کے درمیان اپنے گاؤں کی مخصوص زبان میں بولی۔

"ہائے بھاگ بھری تو نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔ میں نصیبوں جلی زیبو ہوں زیبو۔"

بخت آور کے اندر جیسے بھونچال سا آ گیا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔ وہ آگے بڑھ کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

زیبو جس کا گھر بسانے کی خاطر اس کے بھائی منظور نے اپنا بھرا گھر اجاڑ دیا تھا۔ وہ اس بازار میں اجڑی ہوئی مانگ لئے اس کے گلے سے لگی تھی۔ بین کے ٹوٹتے ہوئے بے ربط لفظوں میں آنسو ہی آنسو تھے۔ وہ رندھے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ہائے نی بھاگ بھریئے! میں نے تو پا منظور سے کہا تھا کہ مجھے ملنے آئے گا تو بھاگ بھری کو بھی لے کر آنا۔ مگر یہ تقدیر نے ہمیں کہاں لا ملایا ہے۔ بھاگ بھری میں اور شریف

دوڑتے ہی رہے۔ اس امید پر کہ ہم چوہدریوں کی پہنچ سے دور نکل جائیں گے لیکن...... لیکن۔ انہوں نے شریف کو میرے سامنے گولی ماری اور مجھے...... مجھے......"

ہچکیوں نے اس کے گلے میں پھندا سا ڈال دیا۔ بخت آور کو اور کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ یہ اس کی اپنی کہانی ہی تو تھی۔ انہوں نے بھی تو اس کے بھائی منظور کو اس کی آنکھوں کے سامنے گولی ماری تھی اور اسے...... اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ جانتی تھی۔ وہ سب اس نے ننگے پنڈے پر سہا تھا۔ وہ بھاگ بھری سے بخت آور بننے میں جن دکھوں کو جھولی میں ڈالتی آئی تھی۔ زینت کے دکھ بھی اس کے دکھوں جیسے ہی تھے۔ جو وہ زیبو سے زینت بننے میں سہتی رہی تھی۔

زینت نے بیدردی سے ہونٹ چبائے اور آنسوؤں سے بوجھل لہجے میں بولی۔

"بھاگ بھری جب شریف ہی نہیں رہا تو میں جی کر کیا کروں گی۔ میں جینا نہیں چاہتی۔ مگر، مگر یہ لوگ۔ یہ لوگ......!"

بخت آور آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اس کے من کا درد ناقابل برداشت ہو گیا۔ وہ بے دم سی ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور آنچل سے منہ ڈھانک کر روتی رہی۔ اس کے پاس کہنے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ خود کو سمجھانے کیلئے اس کے پاس کوئی عذر، کوئی بہانہ نہیں تھا۔

زینت اس کے قریب بیٹھ گئی اور ہولے سے اس کا شانہ ہلا کر بولی۔

"بھاگ بھریئے! اب ہم ایک نہیں دو ہیں۔ اب ہم اور ظلم نہیں سہیں گے۔ اب ہم نہیں بکیں گے۔ وہ اس کے قریب ہوئی اور رازداری سے بولی۔

"بھاگ بھری تو سن لے اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہرگز نہیں۔"

......

استاد کے گھر کی طرف جاتے ہوئے سجاول سوچ رہا تھا کہ گلابی نے اسے کیوں بلایا تھا۔ آمنا سامنا ہونے پر تو وہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ اس نے اپنے گھریلو ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ وہ آ کر اسے مل جائے۔ سجاول نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ لیکن وہ ٹھیک طرح سے بتا نہیں سکا تھا۔

الجھی ہوئی زندگی کی تھکا دینے والی مصروفیات میں گلابی سے شاذ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ظالم وقت کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دیتا تھا کہ لطافت کے اس حسین پیکر کا تصور بھی کیا جا سکے۔ گلابی کی دہلیز سے باہر سو دکھ، سو جھمیلے تھے۔ جو اس طرح باندھے رکھتے تھے کہ ادھر کا رخ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اب اس کا پیغام ملا تھا تو اس نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح وقت

نکال کر اس سے مل ہی آئے۔ شاید اسے کوئی ضروری کام ہو۔ ابھی اس نے دروازے کا پردہ ہی اٹھایا تھا کہ گلابی پر نظر پڑ گئی۔ اسے دیکھ کر گلابی کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات گڈمڈ ہو گئے۔ سجاول اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ پریشان ہے یا کسی وجہ سے گھبرائی ہوئی ہے۔

اس کی اداسی اور چپ نئی نئی سی تھی جس نے اسے یکسر بدل دیا تھا۔ وہ ہنستی، مسکراتی، ناز و ادا، دکھلاتی، الجھتی، تیوریاں چڑھاتی ہوئی گلابی معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی گلابی رنگت بھی کچھ پھیکی پھیکی سی تھی۔ اس کے بال سنورے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی شوخ نہیں تھا۔ اس کی اوڑھنی ملگجی سی ہو رہی تھی۔ سجاول نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ اسے یک بیک کیا ہوا تھا کہ اس نے سنورنا چھوڑ دیا تھا۔

اس نے نرمی سے سوال کیا۔

"کیوں گلابی! خیریت تو ہے تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

گلابی خلاف معمول چپ رہی۔ اس نے ایک بار نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی اداس آنکھوں نے کوئی بات کی۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کو لرزے۔ لیکن اس نے انہیں موتی ایسے دانتوں تلے دبا لیا۔ وہ دو قدم آگے چلی۔ اس کی جھانجیں کچھ بولیں لیکن پھر اسی کی طرح خاموش ہو گئیں۔

سجاول کے لئے اس کا یہ عجیب رویہ ناقابل فہم تھا۔ وہ دو قدم چل کر اس کے برابر آ گیا اور بڑی تشویش سے بولا۔

"گلابی! خیر تو ہے۔ بولتی کیوں نہیں۔ مجھے کیوں بلایا ہے تو نے؟"

گلابی نے ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اچانک بولی۔

"سجاول! ابا میرا بیاہ کر رہا ہے۔" اس کے انداز میں ایک للکار تھی۔ اس کی جادو بھری آنکھوں میں ایک انوکھا سوال تھا۔

سجاول ان مسحور کر دینے والی خوبصورت آنکھوں سے نگاہیں چرا کر بے ضرر سے لہجے میں بولا۔

"کس کے ساتھ؟"

گلابی نے غصے سے سر جھٹکا اور تڑخ سے بولی۔

"مجھے کیا پتہ۔ کس کمینے منحوس کے ساتھ۔" اس کی شفاف پیشانی پر شکنیں تھیں اور اس کے سارے وجود میں جیسے کوئی زخمی ناگن پھنکار رہی تھی۔

سجاول کچھ گھبرایا' کچھ جھجکا' کچھ متذبذب ہوا اور خود کو اس بے حد مشکل لمحے سے نکالنے کے لئے بڑی بردباری سے ہمت کر کے بولا۔

''گلابی پریشان کیوں ہوتی ہے۔ اگر تجھے یہ رشتہ پسند نہیں تو مجھے بتا۔ میں استاد سے آپ بات کرلوں گا۔''

''کیا بات کرے گا تو ابے سے؟'' اس نے تیکھے تیوروں سے پوچھا۔

''یہی کہ تجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔'' وہ گلا صاف کر کے بولا۔

''اور؟'' وہ کڑے لہجے میں بولی۔

''اور یہ کہ جہاں تو چاہتی ہے وہاں تیرا ساکھ جوڑے۔'' سجاول نے جیسے رٹا ہوا سبق سنایا۔

''اور؟'' اس نے جیسے غصے سے کھولتے ہوئے پھر پوچھا۔

''اور کیا؟'' سجاول بھی الجھا۔ ''اور تو بتا دے۔ جو کہنا ہے وہ کہہ دوں گا۔''

گلابی کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے گھور کر سجاول کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے مغلظات کا فوارہ سا ابل پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان کھسوٹتی ہوئی چلائی۔

''اور یہ کہ تو دفع ہو جا۔ دور ہو جا میری نظروں سے موت جوگے۔ کمینے۔ تو چلا جا۔ جا کہیں اور جا کر مر۔ میری جوتی کو بھی تیری پروا نہیں۔ تو......''

سجاول اس کے اس طرح غصے میں آ جانے پر لمحے بھر کو بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھڑانا چاہا۔ لیکن گلابی کی گرفت مضبوط تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہیں۔ وہ پاگلوں کی طرح گالیاں بکتی اسے کوستی جا رہی تھی۔

سجاول نے پریشان ہو کر اس کے دونوں بازو پکڑ کر اسے ایک زوردار جھٹکا دیا۔

''انسان کی بچی بن۔ بند کر یہ بکواس۔''

گلابی کا وجود سارے کا سارا لچک گیا۔ وہ جھول کر اس کے اوپر آ رہی۔ سجاول اسے سنبھال کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک کڑکتی ہوئی آواز نے اسے ساکت سا کر دیا۔ وہ گلابی کو چھوڑ کر پلٹا اور لمحے بھر کو اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔

استاد شکرے اور مستانے کے ساتھ کھڑا قہر آلود نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

''سجاول! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ تو میرے ہی گھر میں میری عزت کا بیری ہو جائے گا۔''

گلابی اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک کا چہرہ تک رہی تھی۔

سجاول بلاوجہ چور سا بن گیا اور کچھ اکھڑے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

''استاد تو یونہی ان شہدوں کی بات میں آ گیا ہے۔ تجھے میرا اعتبار نہیں۔ تو آپ اپنی لڑکی سے پوچھ لے......وہ۔''

''بکواس نہ کراوئے۔'' شکرے نے کرختگی سے اس کی بات کاٹی۔

''تو نے لڑکی کو اس قابل چھوڑا ہی کب ہے؟''

سجاول غصے سے کھول اٹھا۔ اسے ضبط کرنا محال ہو گیا۔ اس نے بپھر کر شکرے کی گردن دبوچ لی۔ استاد اور مستانہ دیکھتے ہی رہ گئے اور شکرے کی آنکھیں ابل آئیں۔ وہ سجاول کے ہاتھوں میں جھولنے لگا۔ استاد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کی تو شکرا تیورا کر زمین پر آ رہا اور بے سدھ ہو گیا۔

یہ سب کچھ لمحے بھر میں اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ سب کے سب حواس باختہ ہو گئے۔ خود سجاول کو بھی اس وقت ہوش آیا جب شکرا کٹے ہوئے درخت کی طرح بھدی آواز کے ساتھ زمین پر آ رہا۔ اس کی نیت اسے جان سے مار دینے کی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا وہ غیر ارادی طور پر چشم زدن میں ہو گیا۔ حالات سراسر اس کے خلاف جاتے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی شور مچاتا سجاول نے عجلت میں استاد سے کہا۔

''استاد تجھے اعتبار آئے نہ آئے۔ گلابی میرے لئے بہنوں جیسی ہے۔ میرا جو حساب تیری طرف نکلتا ہے وہ گلابی کو شادی پر دے دینا۔ میرے ساتھ بس اتنا بھلا کر کہ مجھے یہاں سے نکل جانے دے۔''

استاد ابھی صحیح طور پر اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ بجلی کی سی سرعت سے تقریباً دوڑتا ہوا صحن سے باہر نکل گیا۔

0......0......0

وہ دوڑتا ہی رہا۔ آگے ہی آگے۔ بہت آگے۔ اس نے دنوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کیا۔ لمحوں کو فاصلوں میں بدل دیا۔ وقت کی رفتار جیسے اس کے اپنے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ ایک ایک لمحہ اسے اس فضا سے، اس ہوا سے، اس مقام سے کوسوں دور لے جا رہا تھا۔ جس نے اسے قاتل بنا دیا تھا۔ جس کا ذرہ ذرہ اس کا دشمن تھا۔ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید ہونے سے پہلے، پھانسی کے تختے پر قدم دھرنے سے پہلے وہ اپنے حصے کا کام ختم کر لینا چاہتا

تھا۔

ریل میں چڑھتے، اترتے، سٹیشن پر ہجوم میں چلتے پھرتے، بھیڑ میں الجھتے اس نے کچھ جیبوں پر ہاتھ صاف کئے اور اپنی گزر اوقات کرنے لگا۔ اس کی زندگی مسلسل حرکت، مسلسل گردش میں بدل گئی تھی۔ وہ اپنی پہچان گنوا چکا تھا۔ اسے اپنی شناخت کرانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر دیکھتا کہ وہ پہچانا تو نہیں جاتا۔ اس نے اپنے بال اور مونچھیں خوب بڑھا لی تھیں۔ وہ ٹوپی اور مفلر ہر وقت پہنے رہتا جس میں اس کے چہرے کا بیشتر حصہ ضرور چھپ جاتا۔

وہ اونچا، لمبا، کھلے ہاتھ پیر کا وجیہہ جوان تھا۔ لیکن اسے اپنی وجاہت کا احساس نہیں تھا۔ اس کی زندگی ماں اور بہن کے وجود اور محبت سے خالی تھی جو اس کی بلائیں لیتیں۔ اس پر واری صدقے جاتیں، جنہیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

وہ آٹھ جماعت تک پڑھا ہوا تھا۔ سلیقے سے بات کر سکتا تھا۔ لیکن وقت کی ستم رانیوں اور ناموافق ماحول نے اسے اکھڑ اور تندخو بنا دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور زمانے کے سرد و گرم چکھے ہوئے تھا۔ وہ ہر طرح کے حالات سے نباہ کرنا سیکھ گیا تھا۔

اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ ریل گاڑیوں میں واردات کرنا آسان ہے۔ لوگوں کے ہجوم، افراتفری، سامان کی فراوانی، قلیوں کی دھکم پیل، گاڑی چھوٹ جانے کے خوف اور گھر پہنچنے کی جلدی میں مبتلا لوگوں کے درمیان وہ کھو جاتا تھا۔ ایسے میں وہ ایک آدھ جیب پر ہاتھ صاف کر کے چند دن کیلئے واردات کرنے سے غافل ہو جاتا تھا۔ ریل گاڑیاں اسے نت نئے شہروں میں لے جاتی تھیں جہاں وہ ایک ایک چہرہ پڑھتا، ایک ایک کو تکتا اور ہر ایک سے پہلو بچا کر نکل جاتا۔

وہ جگہ جگہ بھاگ بھری کی بو سونگھتا، رک رک کر بابا کو تکتا تھا جو پلٹ کر گھر نہیں آیا تھا۔ لوگ تو یہی کہتے تھے کہ وہ اسی روز غیرت سے مر گیا تھا جب بھاگ بھری اغوا ہوئی تھی۔ لیکن سجاول کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ وہ بھاگ بھری کو ڈھونڈے بغیر کس طرح مر سکتا تھا۔ سجاول کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بابا زندہ ہے۔ اور اسی کی طرح بھاگ بھری کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پر اچانک اس سے سامنا ہو جائے گا۔ اور وہ دونوں بھاگ بھری کو ڈھونڈتے ہوئے کہیں مل جائیں گے۔

زندگی آوارگی کا دوسرا نام ہو گئی تھی۔ اس کے شب و روز میں سے قرار کا لفظ مٹ گیا

تھا۔ بے چینی، خوف اور تلاش کے سوا اس کی زندگی میں کچھ نہیں رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ استاد اسے کبھی معاف نہیں کرے گا اور مستانہ اسے اور بھڑکا رہا ہو گا۔ وہ اس سے انتقام لئے بغیر نہیں رہے گا۔ یہی خوف اسے دوڑائے لئے جاتا تھا کہ کہیں وہ بھاگ بھری کو تلاش کئے بغیر جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ چلا جائے۔ وہ اس بھری دنیا میں کسی پرندے کی طرح آزاد رہنا چاہتا تھا۔ تاکہ چپے چپے پر نگاہ ڈال سکے۔ ہر جگہ دیکھ سکے اور ہر طرف آ جا سکے۔

سٹیشن پر گاڑی رکتے ہی مسافروں کا سیلاب سا امنڈ کر گاڑی میں سوار ہونے کے لئے دھکم پیل کرنے لگا جن کو اترنا تھا وہ اس افراتفری میں پس کر رہ گئے۔ ثریا، بخت آور، زینت، ستارہ اور فردوس نے بڑی مشکل سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کیا اور کھلی فضا میں آ کر اطمینان کا سانس لیا۔

بھاری بھرکم نائیکہ کو ایک سازندے نے بڑی مشکل سے ہاتھ پکڑ کر ریل کے ڈبے میں سے باہر نکالا۔ وہ ہجوم اور گرمی کی وجہ سے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ لیکن اس کی عقابی نظریں ان سب پر جمی ہوئی تھیں جنہیں وہ بکاؤ مال بنا کر اس بڑے جشن میں شرکت کیلئے لائی تھی۔

"سب آ گئی ہیں نا۔ کوئی پیچھے گاڑی میں تو نہیں رہ گئی۔" اس نے ناہموار سانسوں کے درمیان ہٹے کٹے محافظوں سے پوچھا۔

انہوں نے مونچھوں کو تاؤ دے کر سرخ آنکھوں سے ان سب کی طرف دیکھا۔ ستارہ نے نقاب سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"فکر نہ کر آپا۔ سب تیرے ہاتھ تلے ہیں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا اور سازندوں میں سے کسی کو کہنے لگی۔

"جاؤ جا کے پتہ کرو۔ مرو کہ زمیندار صاحب نے کسی کو لینے بھیجا ہے یا نہیں۔"

"تم سٹیشن سے تو باہر نکلو۔ پھر آگے چل کر دیکھتے ہیں۔" وہ آگے نکلتا ہوا بولا۔

زینت نے بخت آور کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہولے سے بولی۔

"بھاگ بھری ہوشیار رہنا جیسے ہی کوئی موقع ملا نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

"ان مشٹنڈوں کا کیا ہو گا؟ زیبو! ان کی آنکھیں تو ہم سب پر لگی ہیں۔" بخت آور نے دانت بھینچ کر دبی زبان میں جواب دیا۔

''دیکھی جائے گی۔'' وہ لاپرواہی سے بولی اور اچک کر نائیکہ کو دیکھنے لگی۔

مسافران کے دائیں بائیں سامان اٹھائے تیزی سے گزر رہے تھے۔ قلی ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے کہ اچانک سامنے سے آتا ہوا ایک نوجوان بخت آور کے ساتھ بڑے زور سے ٹکرایا۔ وہ بے خیالی میں گرتے گرتے بچی۔ زینت کے ہاتھ میں ہاتھ ہونے کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی۔ وہ نوجوان بھی بوکھلا کر معذرت کرنے لگا۔

ان کی نگرانی کرنے والے دو محافظ لپک کر سامنے آگئے۔ ایک نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ دوسرے نے گھونسا اس کے جبڑے پر دیا اور بدتمیزی سے بولا۔

''اوئے۔ اندھا ہے تو۔ آنکھیں ہیں کہ بٹن۔''

وہ اس اچانک حملے سے چکرا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر ایک جھٹکے میں اپنا گریبان چھڑا لیا اور کرخت آواز میں بولا۔

''بکواس نہ کرالو کے پٹھے۔ مجھ سے پیٹ نہ کھلوا لینا۔''

بخت آور اور زینت نے قدرے حیرت سے اس کی اس جرأت کو دیکھا۔ دونوں محافظ بھی قدرے ٹھٹکے۔ انہیں شاید اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ مقابلے پر اتر آئے گا۔ وہ بھنا کر پھر اس پر جھپٹنا ہی چاہتے تھے کہ ستارہ درمیان میں آگئی اور ڈپٹ کر بولی۔

''خوامخواہ بات نہ بڑھاؤ۔ یہاں تماشہ لگاؤ گے کیا؟ چلو آگے۔''

اردگرد سے گزرنے والے لوگ متوجہ ہونے لگے تھے۔ کچھ ٹھہر کر دلچسپی سے دیکھنے لگے تھے۔ کچھ سازندوں کی طرف معنی خیز اشارے کر رہے تھے۔ ستارہ رسوخ والی عورت تھی۔ نائیکہ کے بعد اسی کی بات سنی جاتی تھی۔ اس کا کہا ٹالا نہیں جاتا تھا۔ اس نے درشتی کے ساتھ محافظوں کو آگے بڑھنے کیلئے کہا تو وہ اس نوجوان کو گھور گھور کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

بخت آور اور زینت ابھی تک اسی نوجوان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی دلیری نے انہیں متاثر کیا تھا۔ وہ خوش شکل اور دراز قد تھا۔ اس کی ٹوپی اس کی پیشانی پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی گھنی مونچھوں میں اس کا اوپر کا ہونٹ چھپ گیا تھا۔ گھنگھریالے بالوں نے اس کی گردن کا کچھ حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتا محافظوں کو جاتا ہوا دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر اس نے بھی چلنے کی ٹھانی لیکن ستارہ نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''ذرا ٹھہرو تو سہی۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔''

وہ بری طرح سٹپٹایا اور عجلت میں اپنے بازو سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چلنے لگا۔

''مجھے پہچانا نہیں تم نے؟ میں ستارہ ہوں۔ ستارہ۔'' ستارہ نے برقعے کی سیاہ نقاب کو چہرے سے ہٹا دیا۔

اس نے الجھ کر ستارہ کی طرف دیکھا اور پیشانی پر بل ڈال کر اکھڑ پنے سے بولا۔

''میں تجھے نہیں جانتا۔''

وہ آگے بڑھ گیا اور ستارہ وہیں کھوئی کھوئی سی کھڑی اسے ہجوم میں گم ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔

بخت آور کو حیرت ہوئی۔ وہ تو اچھے اچھوں کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ لیکن یہ نوجوان نہ جانے کون تھا جسے دیکھ کر اس کا خوبصورت چہرہ کھلا کھلا سا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے لبوں سے چھونے والے لفظوں میں شیرینی گھل گئی تھی۔ لیکن اس کے جاتے ہی اس کے لبوں کی مسکان مغموم ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ملال جھلکنے لگا تھا۔ وہ برقع کا فیتہ ہونٹوں میں دبائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

اس کے دل میں کھدبدی ہونے لگی کہ ستارہ سے معلوم کرے کہ وہ کون تھا۔ جس کے لئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ موقع ملتے ہی اس نے ستارہ کو گھیر لیا اور اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔ وہ پھر کچھ اداس سی ہوگئی اور ایک مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''میں تمہیں کیا بتاؤں؟ میں تو خود کچھ نہیں جانتی۔''

''لو۔ بھلا تم نے خود اس سے نہیں کہا تھا کہ تم نے اسے پہچان لیا ہے۔'' زینت نے بھی اصرار کیا۔

''ویسے مجھے بھی وہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا تھا یا پتہ نہیں اس کی شکل کسی سے ملتی ہے۔ کچھ یاد نہیں آرہا۔ الجھن سی ہو رہی ہے خوامخواہ ہی۔ ستارہ تم بتاؤ تو سہی۔ وہ کون تھا؟'' بخت آور نے زور دے کر کہا۔

''میں کیا بتاؤں؟'' ستارہ ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''مجھے واقعی کچھ پتہ نہیں کہ وہ کون ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟ وہ کہاں رہتا ہے؟ وہ تو ہوا کے جھونکے کی طرح ہے۔ جو پورے وجود کو چھو کر گزر جاتا ہے۔ لیکن پتہ نہیں چلتا کہ کدھر گیا۔''

''واہ۔ تم تو شاعری کرنے لگیں۔'' بخت آور نے ہنس کر کہا۔

''چلو اب بتا ہی دو کہ تم اسے کس طرح جانتی ہو۔'' فردوس نے لقمہ دیا۔

"وہ ایک رات آیا تھا۔" ستارہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بولی۔

"گاہک بن کر نہیں۔ قاتل بن کر۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ میں ڈر گئی تھی۔ مجھے یاد ہے اس نے کہا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اس نے کس طرح اذیت میں ڈوب کر کہا تھا۔" بھاگ بھری! یہ تو نے کیا کیا؟"

بخت آور نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ستارہ کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے لفظ انگاروں کی طرح اس کے سارے وجود کو داغ گئے تھے۔ وہ سانس روک کر بولی۔

"ستارہ تجھے ٹھیک طرح یاد ہے نا۔ اس نے بھاگ بھری ہی کہا تھا؟ بھاگ بھری؟ ہیں؟ اس نے بھاگ بھری ہی کہا تھا؟"

"ہاں!" ستارہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"وہ اسی نام کی تلاش میں آیا تھا بخت آور۔ یہاں اس نے کسی سے سنا تھا کہ پہلے میرا نام بھاگ بھری تھا۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ بہت مایوس ہوا۔ وہ جس بھاگ بھری کو ڈھونڈتا تھا۔ وہ میں نہیں تھی۔"

بخت آور دکھ اور اذیت میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے بولی۔

"ستارہ! اس کا کیا نام تھا؟ تم نے اس سے اس کا نام نہیں پوچھا تھا؟"

"نہیں۔ نہیں...... میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ شاید اگر میں اس سے پوچھ لیتی تو بھی وہ نہ بتاتا۔" ستارہ نے غور سے بخت آور کے متغیر چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"وہ سجاول ہی تھا۔ ہاں وہ سجاول ہی تھا۔"

"کون سجاول؟" ستارہ نے سوال کیا۔

بخت آور کا پیمانہ صبر جیسے لبریز ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

"ہائے میں مر جاؤں۔ وہ مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اف خدایا میں اسے کس منہ سے بتاؤں کہ میں یہاں ہوں۔" وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ اس کے سسکیوں میں ڈوبے ہوئے لفظ کچھ ستارہ اور زینت کی سمجھ میں آ رہے تھے اور کچھ نہیں۔ البتہ سجاول کے نام پر زیبو کو وہ نوخیز لڑکا یاد آ گیا تھا جس کی شرارتوں سے گھر بھر کی ناک میں دم رہتا تھا۔ جو چھپ چھپ کر غلیل سے ان کے بھرے ہوئے گھڑوں کا نشانہ لیا کرتا تھا۔

ستارہ بھی جیسے سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے بخت آور کا شانہ تھپتھپا کر آہستگی سے پوچھا۔

"بخت آور تجھے یقین ہے وہ تیرا ہی بھائی تھا۔"

بخت آور نے تڑپ کر سر اٹھایا اور بہتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ وہ سجاول ہی تھا۔ میرا دل کہتا ہے وہ سجاول ہی تھا۔ وہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔ سارا پاء منظور پر گیا ہے۔ ماشاء اللہ کتنا اونچا لمبا ہو گیا ہے۔ ہائے میں مر جاؤں۔ وہ مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اسے کس طرح بتاؤں۔"

ستارہ خاموش بیٹھی رہی۔ بخت آور کے دل کی کیفیت اس پر بھی گزر رہی تھی۔ بخت آور جس سانحے سے دوچار تھی وہ اس کے لہو میں بھی ٹیس سی بن کر دوڑ رہا تھا۔ اس جگہ کی گندگی کا احساس ایک بار پھر سارے وجود پر مسلط ہو گیا تھا۔ تینوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بے بس اور بے قرار آنسو جو روح کی خلش نہیں مٹا سکتے تھے۔ جو دامن کے دھبوں کو نہیں دھو سکتے تھے جو ان کی روح کی پاکیزگی کے گواہ نہیں بن سکتے تھے۔

رات جوان اور جادو بھری تھی۔ امنڈتے ہوئے شباب کی طرح پر بہار۔ رنگ اور خوشبو میں بسی ہوئی الھڑ مٹیار کی طرح شوخ، چنچل اور منہ زور فضا میں رس، رنگ اور نغمے تھے۔ گھنگروؤں کی جھنکار سے در و دیوار گونج رہے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین چہرہ، ایک سے ایک بڑھ کر دلربا شباب۔ ہر طرف حسن اور ادائیں بکھری ہوئی تھیں۔ خوشبوؤں سے معطر سراپے مہک سی بن کر دلوں میں کلیاں کھلا رہے تھے۔ ناچتے ہوئے حسین پیکر دلوں میں ارمان جگا رہے تھے۔

زمیندار اور اس کے اونچے شملوں والے مہمان چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھے جھوم رہے تھے۔ فضا کی ترنگ، نغموں کی شوخی، رقص کی دلآویزی اور شباب کے زاویے نشے کو دو آتشہ کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ کہنیوں سے ٹھوکے دیتے اور آنکھوں سے معنی خیز اشارے کرتے۔ وہ کرنسی نوٹ اچھال رہے تھے۔

بخت آور کا دل بیٹھا جاتا تھا جیسے جیسے محفل رنگ پر آتی تھی گھورتی ہوئی مشتاق آنکھوں میں ہوس جاگتی تھی۔ معنی خیز اشاروں میں بے باکی بڑھتی تھی۔ داد و تحسین کے شوخ انداز وجود کو چھیدنے لگتے تھے۔ گستاخیاں قریب آتی تھیں۔ وہ سمٹ سمٹ جاتی تھیں۔ اس کے نغموں کی لے پھیکی پڑنے لگتی تھی۔ وہ چہروں کے ہجوم میں گھری اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کرتی اور روشنیوں سے بھاگتی تھی۔ اسے یہ تصور چین نہیں لینے دیتا تھا کہ ان بے شمار آنکھوں میں کہیں سجاول کی آنکھیں نہ ہوں۔ ان ان گنت چہروں میں کہیں سجاول کا چہرہ نہ ہو جو خاندان کی عزت کو یوں تماشہ بنے دیکھ کر نہ جانے کیا کر دے۔

اس بات نے اس کے دل میں ایک ڈر سا بٹھا دیا تھا کہ اس کا بھائی اسے تلاش کر رہا ہے۔ اس کا ایک ایک سانس اذیت سے بے حال ہو گیا تھا۔ وہ سجاول کی پناہ میں آنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے مضبوط سہارے کی متلاشی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے سجاول اسے تمام

مصیبتوں سے نجات دلا دے گا۔ اس کی ساری مشکلوں کا خاتمہ کر دے گا۔ وہ جیسے سارے جہاں سے بیگانہ ہو کر صرف سجاول کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ وہ اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے اپنے سارے زخم دکھانا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بہت کچھ سنانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سب کتنا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ سجاول نہ جانے کہاں تھا؟ شاید کہیں بہت قریب تھا یا کہیں بہت دور۔ اس کی دسترس سے کوسوں دور۔ اس کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ نامعلوم وہ پھر کبھی اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ یا شاید اچانک ہی اس سے آمنا سامنا ہو جائے گا تو وہ کس طرح اس کا سامنا کرے گی۔ کس طرح اس کے سامنے نگاہیں اٹھائے گی۔ کس طرح اسے بھائی کہہ کر مخاطب کر سکے گی۔ کس طرح اس کے سامنے اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کر سکے گی۔

محفل میں ہوتے ہوئے بھی وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ اس کی سوچیں کہیں اور سفر کر رہی تھیں۔

زمیندار اور اس کے مہمان سرور و بے خودی میں ڈوب چکے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور جذبے جوان ہو رہے تھے۔ ستاروں کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور فضائیں بیدار ہو رہی تھیں۔ وہ رقص کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔ نغموں کی لے چور چور ہو گئی تھی۔ مگر سننے اور دیکھنے والے نہیں تھکے تھے۔ چاروں طرف برستے ہن نے نائیکہ کو خوشی سے پاگل کر دیا تھا۔ وہ فضا میں اڑتے ہوئے سرخ، سبز ٹکڑے سمیٹتی پھر رہی تھی۔ محفل شباب پر تھی کہ زمیندار کے مہمانوں میں سے ایک بے خودی میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس نے ستارہ کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''اوئے میری بیٹھک کس طرف ہے۔ کوئی میرے ساتھ چلو۔''

اردگرد بیٹھے ہوئے باقی مہمانوں نے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔ بخت آور گاتے گاتے خاموش ہو گئی۔ باقی لڑکیاں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ ستارہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنا بازو چھڑانا چاہا مگر اس نے نہیں چھوڑا اور اس کی جانب جھک کر جھومتا ہوا بولا۔

''نہ سوہنیو! ہم بازو پکڑ لیں تو چھوڑتے نہیں۔ نہ بالکل نہیں۔''

ستارہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی مگر اپنا بازو اس سے نہیں چھڑا پائی۔ دوسرے مہمان ہنس ہنس کر یہ تماشہ دیکھنے لگے۔ زمیندار نے مونچھوں کو بل دے کر اپنے کسی ملازم کو آواز دی۔

''اوئے رحما...... جا چودھری صاحب کو ان کی بیٹھک میں چھوڑ آ۔''

"نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" نائکہ کی پاٹ دار آواز گونجی اور وہ اپنا بے ہنگم جسم سنبھالتی درمیان میں آگئی۔

"چوہدری صاحب! یہ بات غلط ہے۔ وعدہ صرف مجرے کا ہوا تھا۔ کوئی لڑکی کسی کے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"اوئے مائی۔ ہٹ پرے۔" چوہدری نے سرخ آنکھیں نکال کر نائکہ کو زور سے دھکا دیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ مگر ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی اور کرختگی سے بولی۔

"یہ رعب کسی اور کو دینا چوہدری۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ جتنے کا وعدہ ہوا تھا بس اتنے تک ہی بات ہوگی۔"

"او۔ جا مائی۔ ٹرٹر نہ کر۔ تیرے خاندان کی ایسی کی تیسی۔"

وہ حقارت سے بولا اور بازو چھڑاتی ہوئی ستارہ کو اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ اس کے اوپر ہی آ رہی۔ اس نے اپنا مضبوط بازو اس کے گرد لپیٹ دیا۔ مہمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ سازندوں نے ساز چھوڑ دیئے۔ ساتھ آئے ہوئے ان کے محافظ بپھر کر آگے بڑھے۔

زمیندار نے غصے سے اپنے ملازموں کو پکارا۔ نائکہ بلند آواز میں انہیں کوسنے لگی۔

ایک محافظ نے دوڑ کر ستارہ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ چوہدری کے ملازموں میں سے کسی نے اس کے کالر میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ مہمان بھی بیچ بچاؤ کرانے اٹھ کھڑے ہوئے۔

زینت نے بخت آور کے شانے کو ہولے سے چھوا۔ بخت آور نے چونک کر دیکھا۔ اس نے آنکھ سے ایک چھپا ہوا سا اشارہ کیا۔ تو بخت آور کی ساری حسیں جیسے بیدار ہوگئیں۔ اس نے ایک نگاہ سارے مجمعے پر ڈالی۔

زیادہ تر مہمان نائکہ اور اس کے محافظوں کی نوک جھونک کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ معاملہ رفع دفع کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ نشے میں بے سدھ اول فول بک رہے تھے اور ان کے محافظ غنڈے ہاتھا پائی میں الجھے ہوئے تھے۔

وہ ہولے ہولے۔ سب کی نظر بچا کر دروازے تک پہنچیں اور چپ چاپ موقع دیکھ کر باہر نکل گئیں۔

0......0......0

بخت آور کو ہوش آیا تو اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس کے لئے اپنی جگہ سے

حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔ روئیں روئیں سے ایک ناقابل برداشت ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔ خوف کی برف نے اسے منجمد کر دیا تھا۔ وہ چاروں طرف دیکھتی تھی مگر جیسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن بول نہیں پاتی تھی۔ اٹھنا چاہتی تھی مگر حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لئے سانس لینا بھی دشوار تھا۔ پلک تک جھپکنا مشکل تھا۔

گزرتے ہوئے لمحے کسی خوفناک ڈراؤنے خواب کی طرح اب تک اس کے دماغ پر مسلط تھے۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ ہر طرف وحشت برستی تھی۔ نیم تاریک بدبودار کوٹھڑی میں چاروں طرف سے خوفناک ہیولے جیسے ہر آن اس پر یلغار کرتے رہتے تھے۔ اس کے حواسوں پر ابھی تک ان لمحوں کا قہر ٹوٹتا تھا۔

لمبا' انجان' خوف سے بھرا ہوا راستہ۔ پیروں کے چھالے اور تعاقب کرنے والوں کا ہر آن دھڑکا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی دہلا دینے والی آوازیں۔ کوڑوں کی ضربیں۔ زینت کی لرزہ خیز چیخیں۔ گھوڑوں کے سموں تلے کچلا ہوا داغ داغ جسم۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ جیتی اور مرتی رہی تھی۔ کبھی بے ہوش ہو جاتی۔ تو کبھی ہوش میں آجاتی۔ گرد و پیش ہلکی سی آہٹ بھی ہوتی تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھتا۔ اس کا سارا وجود بیدار ہو جاتا۔ ننگے پنڈے پر اذیتوں کے زخم دکھنے لگتے۔ درندگی کا عذاب سہنے والا بدن فریاد کرنے لگتا۔ وہ کوئی نیا ستم سہنے کے خیال سے کانپ اٹھتی۔

وہ لمحہ لمحہ دلدل میں دھنستی جاتی تھی۔ نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہ جیا جاتا تھا۔ نہ کوئی مرنے دیتا تھا۔ وہ تاریک کمرہ جیسے اس کی قبر بن گیا تھا جہاں چاروں طرف وحشت و بربریت رقص کرتی تھی۔ اس کا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ اس میں اذیتیں برداشت کرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ وہ سب کچھ سر جھکا کر مان لینے کے لئے مجبور ہوگئی تھی۔

0......0......0

گاڑی تاریکی میں بے ہنگم شور مچاتی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ سجاول نے دروازے کے راڈ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازے کو دھکا دیا۔ دوسرے ہاتھ میں لمانی دار چاقو تولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوگیا۔ وہ کافی دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ اس ڈبے میں صرف ایک لڑکی تھی۔

اونگھتی ہوئی لڑکی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ

عجلت میں اٹھ کر زنجیر کی طرف بڑھی مگر راستے میں سجاول آ گیا۔ خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے اس کی جانب تکتی ہوئی وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور ڈبے کی دیوار سے جا لگی۔

سجاول نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چاقو کو لہرایا اور دبنگ لہجے میں بولا۔

"تیرے پاس جو کچھ ہے وہ چپ چاپ نکال دے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔"

وہ کانپ گئی اور خشک ہونٹوں کے ساتھ سہم کر بولی۔

"میرے پاس تو صرف تیس روپے ہیں۔"

سجاول کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے خوامخواہ ہی یہ خطرہ مول لیا تھا۔ وہ ابھی کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ لڑکی نے اپنا پرس اس کی طرف بڑھایا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"لو۔ تم خود دیکھ لو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرے پاس صرف تیس روپے ہیں۔"

سجاول نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ سوغات تم اپنے پاس ہی رکھو۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے چپ ہو کر خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سجاول کو اس کے اس رویئے پر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ وہ ڈپٹ کر بولا۔

"یہ تیرے دانت کس خوشی میں نکل رہے ہیں۔ کم ذات۔"

لڑکی نے سہم کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا اور مجرموں کی طرح شانے سکیڑ لئے۔ اس کا گلابی چہرہ بے حد نکھرا ہوا اور معصوم تھا۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں سے جھلکتے خوف نے اس کی دلکش آنکھوں کو ایک ڈرے ہوئے معصوم بچے کی آنکھیں بنا دیا تھا۔ سجاول نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ چپ رہی تو وہ اس سے بات کرنے کی خاطر بولا۔

"بولتی کیوں نہیں الو کی پٹھی۔ تو کیوں ہنسی تھی۔ مذاق اڑاتی ہے میرا؟"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے ہنسنا نہیں چاہئے تھا۔"

سجاول نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے جانے کیلئے مڑا لیکن اسے رک جانا پڑا۔ لڑکی کی ملائم آواز نے اسے روک لیا۔ وہ اس کے عقب میں کہہ رہی تھی۔

"بات سنو۔ تم مجھے چور نہیں لگتے۔"

سجاول ٹھٹک گیا۔ اسے یہ بات بے حد عجیب اور انوکھی معلوم ہوئی۔ اس نے حیران ہو

کر سوچا کہ وہ لڑکی اس طرح کیوں کہہ رہی تھی۔ مگر اس کی اس بات نے اس کے غصے کو کم اور جھنجلاہٹ کو ہلکا کر دیا تھا۔ اس کی یہ بات اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ غیر ارادی طور پر پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

اسے مڑ کر دیکھتے ہوئے پایا تو لڑکی پھر سہم گئی اور دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی اور بڑی سادگی سے جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

"میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے۔ تم۔ تم تو شریف آدمی لگتے ہو۔ تم چور نہیں لگتے۔ شاید شاید کوئی مجبوری تمہیں اس راستے پر لے آئی ہے۔"

سجاول نے حیرت سے اس کی بات سنی۔ اس کے لفظوں سے جیسے اس کے اندر مسرت کا ایک ہلکا سا احساس پھوٹا جس نے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی کرختگی کو قدرے کم کر دیا۔

لڑکی نے بھی شاید اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور وہ ڈرتے ڈرتے محتاط سے لہجے میں بولی۔

"یہ کام تو اچھا نہیں ہے۔ مردوں کو اپنے ہاتھ سے کما کر کھانا چاہئے۔"

سجاول نے پھر غور سے اس کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ ضرورت سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش تو نہیں کر رہی اور وہ سختی سے بولا۔

"اپنے ہاتھوں ہی سے تو کما کر کھاتا ہوں۔ تجھے معلوم ہے یہ کام کتنا مشکل ہے؟"

"مگر کوئی اچھا کام تو نہیں ہے نا۔" وہ زرد چہرے کے ساتھ جھجکتی ہوئی بولی۔ اس طرح تو تم پکڑے بھی جا سکتے ہو۔ تمہاری چھوٹی سی غلطی تمہاری زندگی کو خراب کر سکتی ہے۔ تمہارے خاندان کو بدنام کر سکتی ہے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میرا کوئی خاندان نہیں۔" سجاول نے بے حد کڑے لہجے میں کہا۔

"اوہو۔" لڑکی نے افسردگی سے سر ہلایا۔

"تمہارا کوئی بھی نہیں؟"

سجاول نے اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ چند لمحے شاید اس کے جواب کے انتظار میں خاموش رہی۔ پھر متاسفانہ انداز میں بولی۔

"تمہارا کوئی نہیں ہے نا اسی لئے شاید تمہیں کسی نے نہیں ٹوکا۔ شاید تمہیں کسی نے نہیں

بتایا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ تم نے جو راستہ چنا ہے وہ اچھی زندگی کی طرف نہیں جاتا۔'' اس کے انداز میں بے ریا خلوص اور ہمدردی تھی۔ وہ یوں بات کرتی تھی جیسے پھوار سی پڑ رہی ہو۔

سجاول کا شک اب بھی دور نہیں ہوا۔ وہ حالت خوف میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے ہر لمحہ پکڑے جانے، پہچان لئے جانے اور شناخت کر لئے جانے کا دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ اسے ہر چہرہ دشمن کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ اسے اس لڑکی پر بھی شک ہو رہا تھا کہ وہ ایک غیر شخص میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی تھی۔ جبکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تو وہ اپنے اس رویئے سے کیا ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کا بازو سختی سے پکڑ لیا۔

''سچ سچ بتا تو کیا چاہتی ہے؟'' وہ غرایا۔

لڑکی کا چہرہ دفعتاً سپید پڑ گیا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹی اور اپنا بازو چھڑاتے ہوئے خوف سے گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''نہیں۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتی۔ چھوڑ دو۔ میرا بازو چھوڑ دو۔''

''تو پھر مجھے سبق کیوں پڑھا رہی ہے۔ بتا؟'' سجاول نے ڈپٹ کر کہا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔

وہ سمٹ کر پیچھے ہٹی۔ اس نے شاکی نظروں سے سجاول کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر اپنا بازو سہلانے لگی۔ سجاول کو وہ اچھی لگی۔ اس نے اپنا لہجہ نرم کر دیا۔

''بولتی کیوں نہیں۔ بتا؟''

وہ کچھ خفا سی ہو گئی تھی اور خوفزدہ بھی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ ناراضی سے بولی۔

''اگر میں کچھ کہوں گی تو تمہیں برا لگے گا۔''

سجاول کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنے درشت لہجے کو بہت نرم کر دیا۔

''نہیں تو بتا تو سہی۔ میں برا نہیں مانوں گا۔''

لڑکی نے تنقیدی نگاہوں سے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟ پھر ہولے سے گنگنائی۔

''میں...... میں استانی ہوں۔ مجھے ان بچوں کو دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے جو تعلیم سے

محروم رہتے ہیں۔ جن کو برا بھلا کوئی نہیں سمجھاتا۔ جب وہ برے بن جاتے ہیں تو لوگ ان پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ انہیں سزا دیتے ہیں۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں نا۔''

اس نے ایک دزدیدہ نگاہ سجاول پر ڈالی۔ یوں جیسے سوچ رہی ہو کہ اسے اپنی بات جاری رکھنی چاہئے یا نہیں۔ پھر محتاط سے لہجے میں بولی۔

''مجھے لگتا ہے تم بھی ایسے ہی بچے ہو جسے کوئی استاد نہیں ملا۔ جسے کوئی سکھانے والا نہیں ملا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ تمہاری اتنی عمر تو نہیں ہے۔''

سجاول نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے کی شفقت اس کے لفظوں کی ہمدردی، اس کے دلکش چہرے پر بھی تھی۔ لمحے اس لڑکی کی معصومیت پر ہنسی آئی۔ وہ اسے ... ہوا لاوارث بچہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا بھرا پرا گھر کس طرح لوٹ لیا گیا تھا۔ اسے کس بے دردی کے ساتھ محبتوں، رشتوں اور چاہتوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ وہ اسے جتانے کو بولا۔

''میرا باپ بھی سکول میں ماسٹر تھا۔ سات آٹھ جماعتیں میں نے بھی پڑھی ہیں۔ بھلے برے کا فرق بھی بتایا گیا تھا۔ لیکن میں اس فرق کو یاد نہیں رکھ سکا۔ میں نے خود اپنی مرضی سے یہ راستہ چنا ہے۔ سمجھی تو استانی؟''

''کیوں؟'' اس نے حیرت آمیز تجسس سے پوچھا۔ ''آخر تم نے کیوں یہ راستہ چنا ہے۔ تمہارے گھر والوں کو کتنا افسوس ہوتا ہوگا۔ تم نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔''

''میرا گھر خالی ہے۔'' سجاول نے درشتی سے کہا۔ ''میرا کوئی نہیں ہے۔ کسی کو مجھ سے کوئی امید نہیں ہے۔''

''لیکن تم انسان تو ہو نا۔ دوسرے انسانوں سے تمہارا انسانیت کا رشتہ ہے۔ انہیں تو تم سے اچھے کی امید ہے نا۔'' وہ مدھم سے لہجے میں بولی۔

''اونہہ۔ اچھے کی امید۔'' سجاول نے غصے سے دوہرایا۔

''دوسرے انسانوں نے میرے ساتھ کیا اچھا کیا ہے جو میں کسی کے ساتھ اچھا ... تو نے ابھی دنیا نہیں دیکھی۔ تو نے صرف بچوں کے قاعدے پڑھے ہیں استانی! تجھے ... کہ انسان کیا ہے؟ ابھی تجھے کسی کے ہاتھ نہیں لگے۔ تب ہی تو یہ بڑی بڑی باتیں کرتی ... ہونٹ بھینچ کر بولا اور دفعتاً دو قدم آگے بڑھ کر اس کی چادر کا کونہ اس طرح زور سے ... لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ ایک ہی جھٹکے میں چادر کے

ساتھ کھینچتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

اس نے بدحواسی میں چادر خود سے علیحدہ کر کے دور ہٹ جانا چاہا۔ لیکن سجاول نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس کا بازو پکڑ کر اس نے بالکل اس کے کان میں کہا۔

"اگر تو کہے تو ابھی بتا دوں کہ انسان......"

اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ کر اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتے ہوئے خشک ہونٹوں کے ساتھ بولی۔

"چھوڑو۔ چھوڑو۔ خدا کیلئے مجھے چھوڑ دو۔"

اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر سجاول کو ہنسی آ گئی۔

"مری کیوں جاتی ہے استانی! اب کرنا بڑی بڑی باتیں کہ انسان یہ ہے۔ انسان و ہے۔"

اپنا بازو چھڑانے کی کوشش میں وہ ہانپ گئی۔ سجاول نے خود ہی اسے آزاد کر دیا ا دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چادر سنبھالتی ہوئی پیچھے ہٹی اور خوف سے پھیلی ہ آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

سجاول کو اس پر بہت ترس آیا۔ وہ بھولی بھالی سی ناتجربے کار لڑکی تھی۔ اس نے ا کچھ زیادہ ہی ڈرا دیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح ہراساں نظروں سے یوں ادھر ادھر د رہی تھی جیسے جائے پناہ کی تلاش میں ہو۔ وہ اسے ڈری ڈری، سہمی ہوئی سی، سمٹی سمٹی بہت ا لگ رہی تھی۔ اس کے ارادے برے نہیں تھے۔ لیکن وہ اسے چھیڑنے سے باز نہ رہ سکا۔ ہ میں پکڑا ہوا چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولا۔

"بس اتنی ہی ہمت تھی۔"

وہ لرز کر پیچھے ہٹ گئی اور برا مانتے ہوئے بولی۔

"اس میں ہمت کی کیا بات ہے؟ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تمہاری بھی یہی حا ہوتی۔"

اس کی یہ سادہ سی بات سجاول کے دل کو لگی۔ اس نے مسکرا کر چاقو بند کر دیا او سے بولا۔

"ڈرو مت۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تو بہت ناتجربے کار ہے۔ تو نے ابھی

دیکھا ہی نہیں۔ میں تو تجھے صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ انسان کتنا بے اعتبارا ہے۔ ایک پل میں وہ کیا سے کیا بن جاتا ہے۔"

لڑکی نے جیسے اطمینان کا سانس لیا اور یوں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی جیسے بہت تھک گئی ہو۔ وہ ابھی تک بات کرنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سانس ناہموار تھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ وہ بار بار اپنی بادامی چادر کو اپنے گرد لپیٹتی۔ یوں بے اعتباری سے چاروں طرف دیکھتی تھی جیسے اپنے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہو۔ سجاول ایک بار پھر ہنس پڑا۔

"دیکھا ٹکے ٹکے کی باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ خود پر پڑے تو پتہ چلتا ہے۔ اب بتا۔ کیا کہتی ہے تو استانی۔"

وہ ایک جھرجھری سی لیکر بولی۔

"تم بھی ٹھیک کہتے ہو اور میں بھی۔"

"کیا مطلب؟" وہ اس الجھی ہوئی بات پر الجھا۔

وہ اٹکی۔ "تم کہتے ہو کہ انسان بے اعتبارا ہے۔"

"ہاں۔" سجاول نے ہنکارا بھرا۔

"میں کہتی ہوں کہ اس بے اعتبارے انسان کے اندر ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔ اگر تمہارے اندر ایک اچھا انسان نہ ہوتا تو تم کب میرا لحاظ کرتے۔ میں اکیلی لڑکی۔" وہ ہونٹ دانتوں میں داب کر خاموش ہو گئی۔

سجاول نے پیشانی پر بل ڈالے۔

"میری جگہ کوئی اور ہوتا نا تو تم دیکھتیں۔" اس نے بھی دانت بھینچ کر بات اس طرح ادھوری چھوڑ دی کہ مطلب کی سنگینی اور واضح ہو گئی۔

"اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا۔" لڑکی کے گلابی لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔

"اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اسے بھی انسانیت کا کوئی رشتہ یاد آ جاتا۔ اس کے اندر کے اچھے انسان کو مجھ اکیلی لڑکی پر تمہاری ہی طرح رحم آ جاتا۔ میں تمہیں یہی تو سمجھانا چاہ رہی تھی کہ بس اتنی سی بات' چھوٹا سا یہ لحاظ ہی تو انسان کا انسان سے تعلق اور رشتہ ہے۔"

سجاول نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی خوبصورت باتیں کرتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ سجاول کو اس کی باتوں سے اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اس کی آواز کی مٹھاس، اس کی باتوں کی مہک، اس کے لہجے کی شائستگی، اس کا سادہ سا انداز بہت

اپنا اپنا سا تھا۔ سجاول نے زندگی میں وہ پہلی لڑکی دیکھی تھی جس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ جو اتنے خوبصورت لفظ استعمال کرتی تھی۔ جو دل میں گھر کر لیتے تھے۔ جو اتنی ملائم باتیں کرتی تھی کہ اس کی آواز پر نغمے کا گمان ہوتا تھا۔

وہ اکھڑ اور کھردری زبان کا عادی تھا۔ اس نے ہمیشہ چبھتے ہوئے درشت لفظ ہی سنے تھے۔ اپنے گرد و پیش رہنے والی عورتوں کے ہونٹوں سے گالیاں ہی ابلتی دیکھی تھیں۔ شاید اسی لئے اس لڑکی کی نرم و ملائم باتوں نے اس کے اعصاب کو ایک ناقابل بیان سکون بخش دیا۔ اس کی سماعت میں رس گھلنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی طرح دھیمے دھیمے بولتی رہے۔ گلابی نازک ہونٹوں کو جنبش دیتی رہے۔ اس کے رخسار پر ایک ننھا سا حسین گڑھا بنتا اور مٹتا رہے۔ وہ اس کے مقابل بیٹھ جانے اور چپ چاپ اس کی باتیں سننے کی خواہش کو نہ روک سکا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اسی کی تلاش میں تھا۔ اسے ہی ڈھونڈتا پھرتا تھا اسی کیلئے سرگرداں تھا۔ اسے ہی چاہتا تھا کہ وہ کہیں ملے۔ کہیں نظر آئے۔ کہیں اسی سے سامنا ہو تو اسے اپنا زخمی دل بھی دکھائے۔ اپنا فگار سینہ اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ وہ ساری باتیں جو اس کے اندر کھولتی رہتی تھیں انہیں اس کے سامنے اگل دے۔

اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزرا اور ریل کتنا سفر طے کر آئی۔ وہ کہاں سے کہاں نکل آیا۔ وہ لڑکی بڑی ہمدردی سے اس کی روداد سنتی رہی۔ بڑی اپنائیت سے اس سے ایک ایک بات پوچھتی رہی۔ وہ یوں اس کی طرف متوجہ رہی جیسے اس کی باتوں سے زیادہ اہم کوئی اور بات نہ ہو۔

ریلوے لائن کے قریب ہی بنی ہوئی کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی تو وہ چونک گیا۔ رات تو ایک پل کی ہو گئی تھی۔ لڑکی نے چادر سے سر ڈھک لیا اور زیر لب کچھ پڑھنے لگی۔ سجاول یوں اذان کی آواز میں کھو گیا جیسے اس نے اذان پہلی مرتبہ سنی ہو۔ اس کے دل پر ایک ناقابل بیان ہیبت سی چھا گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا ذہن خالی اور دل پرسکون تھا۔

چھوٹے سے گھر کی فضا ایسی گرم اور مانوس تھی جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ پرسکون اپنائیت سے بھرا ہوا۔ سجاول نیچی چھت والے سادہ سے کمرے میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں چلا آیا ہے۔ چپ چاپ اپنی مرضی سے، بڑی رغبت کے ساتھ۔ جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ کسی بڑے کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ چل پڑے۔

یہاں تحفظ کا ایسا نرم گرم احساس فضا میں بکھرا ہوا تھا کہ دل سے سارے خوف تمام تلخیاں مٹ گئی تھیں۔ وہ لڑکی کتنی مہربان اور اچھی تھی۔ اسے دیکھ کر دل پاکیزگی سے بھر جاتا تھا۔ نگاہوں میں عقیدت اتر آتی تھی۔ اس کی ہمدردی پا کر دل ہر شے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

سجاول نے نہ جانے کیوں اسے کوئی ایسی بات نہیں بتائی تھی جو اسے بدگمان کر دے۔ جو اسے اس کی نظروں سے گرا دے۔ جو اس کا التفات چھین لے جو اس کی مہربانیوں کو کم کر دے۔ جو اس کے خلوص کا رخ پھیر دے۔ جو اس کی ہمدردیوں کی سمت بدل دے۔

سجاول نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ قاتل ہے اور پولیس سے چھپتا پھرتا ہے۔ اس نے کتنے ہی ڈاکے مارے تھے اور اپنے دشمنوں سے گن گن کر بدلے لئے تھے۔ اس نے خود کو مظلوم اور ستم رسیدہ بنا کر پیش کیا تھا۔ زمانے بھر کی شکایتوں کے دفتر اس کے سامنے کھول دیئے تھے۔ وہ اس کی ہمدردی، اس کی توجہ اور اس کے التفات سے جھولی بھر لینا چاہتا تھا۔ وہ اس میں کمی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لڑکی کا سٹیشن آ گیا تو سجاول نے اس کا سامان اٹھا لیا اور اس کے ساتھ سٹیشن کے باہر تک آ گیا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ چلنے کیلئے کہا تو وہ بلا عذر اس کے ساتھ ہو لیا اور اب اس کے گھر میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیوں چلا آیا تھا۔ وہ تو اس کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی تو وہ کس ناطے سے اس کے گھر چلا آیا تھا۔ اس نے تو یہ بھی خیال نہیں کیا تھا کہ اس کے گھر میں اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور وہ نہ جانے کیسے ہوں اور اسے کس نظر سے دیکھیں۔

''لو چائے پیو۔'' اس کی آواز سن کر وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

اسی ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے فوراً یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ وہ ایک مجرم تھا۔ اسے ایک شریف گھر پر اپنا سایہ نہیں ڈالنا چاہئے تھا۔ اس نے عجلت میں لڑکی سے کہا۔

''نہیں۔ نہیں۔ بس اب میں جا رہا ہوں۔ میں تو تمہیں گھر تک پہنچانے آ گیا تھا۔''

''تمہیں ایسی بھی کیا جلدی ہے؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''چائے وغیرہ پی کر چلے جانا اور اطمینان سے کوئی اچھا کام تلاش کرنا۔''

وہ اس کی اپنائیت کے جواب میں کوئی عذر نہ پیش کر سکا اور پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''گل! گل!'' کسی نے پکارا۔

وہ لڑکی جواب میں جی کہتی ہوئی اٹھ کر چل دی۔ تو سجاول کو علم ہوا کہ اس پھول جیسے شاداب چہرے والی لڑکی کا نام گل ہے۔ اسے یہ نام بہت اچھا لگا۔ اس نے زیرِ لب اسے کئی بار دوہرایا تو اسے ایک انجانی سی مہک اپنے چاروں جانب پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کا نام اسی کی طرح خوبصورت اور دلکش ہے۔

اسی وقت گل ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ کمرے میں آئی۔ سجاول گڑبڑا سا گیا۔ اس نے جلدی سے چائے کا پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور اٹھ کر اسے سلام کیا۔

''ماسی یہ سجاول ہے۔ گاؤں سے آیا ہے۔ کام کی تلاش ہے۔ میں اسے ساتھ لے آئی ہوں۔ سکول میں سفیدیاں کردے گا۔ چھٹیاں بھی تو ختم ہونے والی ہیں۔''

سجاول ایک خوشگوار حیرت میں ڈوب گیا۔ اسے گل کا اس طرح کہنا بہت اچھا لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ گل اس کے لئے اس گھر میں جگہ بنانا چاہتی ہے۔ لیکن ماسی اس سے مطمئن نہیں تھی۔ اس کی نگاہوں کا انداز تنقیدی تھا۔ اور وہ مدھم لہجے میں گل سے کچھ کہہ رہی تھی جو یقیناً اسی کے بارے میں تھا۔

وہ خود کو بہت سبک سا محسوس کرنے لگا۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے اس کے گھر کیوں چلا آیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ماسی کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے کہیں دور چلا جائے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جھٹ پٹ گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ گل اسے پکار رہی ہے۔ مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وہ سیدھا بازار گیا۔ اس کی جیب میں کچھ پیسے تھے۔ اس نے سفیدی کرنے کا سامان خریدا اور پھر اسی گلی میں چلا آیا جو اسے بہت جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ صدیوں سے اس کے ساتھ مانوس تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو گل کا پھول سا چہرہ نظر آیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران سی ہو گئی۔ شاید وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ چلا گیا ہے۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ سجی۔

''ارے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم چلے گئے ہو۔''

''نہیں۔'' سجاول نے سامان ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک تمہاری بات کو سچ نہ کرلوں۔''

''کون سی بات۔'' اس نے پوچھا۔

''میں سکول میں سفیدیاں کروں گا۔ تم نے ماسی سے جو کہا ہے۔'' وہ بولا۔

''اچھا۔'' وہ خوشگوار سی حیرت کے ساتھ کہنے لگی۔

''تم نے کبھی یہ کام کیا بھی ہے؟''

''نہیں کیا تو اب کرلوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے سکول کو شیشے کی طرح چمکا دوں گا۔'' اس نے بڑے فطری انداز میں کہا۔

''گل! گل......!'' ماسی کی آواز دور سے سنائی دی۔

''اوہو۔ میں ادھر آ کر باتوں میں لگ گئی ہوں۔ ماسی بے چاری ناشتے کے لئے بلا رہی ہے۔'' گل نے تیزی سے کہا۔ پھر اس سے بولی۔

''تم پہلے ناشتہ کرلو۔ پھر کوئی کام شروع کرنا۔'' وہ اتنا کہہ کر ''جی آئی ماسی!'' کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

سجاول نے نگاہ اٹھائی۔ کھڑکی میں سے صحن کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ ماسی چولہے کے قریب بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ اسے ماں کا بھولا ہوا مہربان چہرہ یاد آیا۔ یہ چھوٹا سا آنگن، گرم چولہا، دھوئیں کی سرمئی لکیر اور روٹی پکاتی ہوئی ماسی۔ اسے یہ سب کچھ اپنے گھر جیسا معلوم ہوا۔ اس کے دل کی دنیا میں کرب والم کے جھکڑ سے چلنے لگے۔ اس کی کیفیت اس ترسے ہوئے بچے کی سی ہو گئی۔ جو ماں کی گود میں آنے کے لئے لپک رہا ہو۔ اپنے بے تاب دل کو ایک بہلاوا دینے کے لئے وہ اٹھ کر دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ گل دوسرے کمرے سے باہر آئی تو اس نے ہمت کر کے جھجکتے ہوئے اسے پکار لیا۔

''بات سنو!''

وہ قریب آ گئی اور نرمی سے بولی۔

''ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟''

''اگر تم برا نہ مانو تو میں وہاں بیٹھ کر ناشتہ کرلوں جہاں ماسی بیٹھی ہے۔ ادھر ماسی کے پاس۔''

''ہاں آ جاؤ۔ کوئی حرج تو نہیں۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولی اور اس کے آگے آگے چل پڑی۔ سجاول سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔

ماسی نے اسے گھر میں یوں بے تکلفی سے چلتے پھرتے دیکھ کر کڑے تیوروں سے گل کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز میں ناپسندیدگی تھی۔ سجاول کا دل بجھ سا گیا۔ وہ جو اپنے گھر

کے بھولے ہوئے تصور اور بچھڑی ہوئی ماں کی یاد کو اپنے دل میں زندہ کرنا چاہتا تھا ملول سا ہو گیا۔ اس نے کھچڑی بالوں والی اس عورت کے چہرے پر شفقت تلاش کرنے کی کوشش کی جو ماں جیسی نظر آتی تھی۔ لیکن جس کی ممتا اس کے لئے نہیں تھی۔ وہ بے دلی سے اس کے قریب ہی ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا اور رسان سے بولا۔

"ماسی! میں تمہیں ماں سمجھ کر تمہارے پاس آ بیٹھا ہوں۔ تم برا نہ ماننا۔ تم میری ماں جیسی لگتی ہو۔"

ماسی نے حیرت سے اس کی بات سنی اور غور سے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی بات کی گہرائی کو جانچ سکے۔ وہ اپنے اندر امنڈتے ہوئے پیاسے جذبوں کو دبا نہ سکا اور خود کلامی کی سی کیفیت سے بولا۔

"مجھے ماں یاد آ رہی ہے۔"

ماسی نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا اور اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"پتر! میں بھی تیری ماں جیسی ہوں۔ تجھے ماں یاد آ رہی ہے تو مجھے اپنی ماں سمجھ لے۔ تجھے پتہ ہے سب مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔" وہ محبت سے اس کے سامنے دودھ اور پراٹھے رکھنے لگی۔

سجاول کو محسوس ہوا جیسے ماسی کا سنگین چہرہ ماں کے مہربان چہرے میں بدل گیا ہے۔ وہ ناشتے کا خیال بھول کر اس کے مہربان چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

گل کا سکول کیا تھا دو کمروں پر مشتمل گھر ہی کا ایک حصہ تھا۔ جس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سے فرش بیٹھ گیا تھا۔ عرصہ ہوا یہاں سفیدی بھی نہیں ہوئی تھی۔ گل نے بتایا تھا کہ وہ فیس برائے نام لیتی ہے۔ اکثر غریب بچے مفت ہی پڑھتے ہیں۔ اس لئے اتنی آمدنی نہیں ہوتی کہ سکول کی عمارت پر توجہ دی جا سکے۔

سجاول ناشتہ کرتے ہی سکول کی مرمتوں میں جٹ گیا۔ اسے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ استاد کے یہاں ہیرا پھیری کرنے میں اسے مشقت کی عادت بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کا دل، اس کی روح، اس کا سارا وجود جیسے اس کام کو کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ وہ خود بخود وہ سارے کام کر رہا تھا جو اس نے کبھی نہیں کئے تھے۔ اس چھوٹے سے سکول میں وہ ایک پیشہ ور مزدور کی طرح دن رات یوں کام میں لگا رہا کہ اسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔

اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ اسے ذرا سی تھکن کا احساس نہیں ہوا۔ جیسے جیسے وہ کام کرتا رہا۔ در و دیوار نکھرتے چلے گئے۔ اس کے اندر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر سی جاگتی گئی۔

گل کئی بار آ کر دیکھ جاتی تھی۔ ماسی کے رویئے میں بھی اب تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اسے اتنی محبت سے مسلسل کام کرتا دیکھ کر بار بار کہتی تھی کہ وہ کچھ دیر آرام کرے۔ وہ کہیں تھک تو نہیں گیا۔ اسے چائے تو نہیں پینی۔ اسے بھوک تو نہیں لگی۔

لیکن سجاول کو ایسی کوئی طلب نہیں تھی۔ اس کے دل میں تو بس ایک ہی لگن تھی کہ اسے گل کے سکول کو آئینہ بنا دینا ہے۔ چمکتا دمکتا۔ صاف شفاف۔ نیا نکور۔ اس کے لئے یہ سب کچھ بہت نیا۔ انوکھا اور زندہ کر دینے والا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دنوں کی تاریکی کے بعد آج سورج کا روپ نظر آیا ہے۔ وہ پھر سے جی اٹھا ہے اور اسے جینے کا جواز مل گیا ہے۔

اس کی دن رات کی محنت نے در و دیوار کو سنوار دیا۔ اس کے جذبوں کا نکھار چہار سو بکھر گیا۔ اس نے سکول کی صورت ہی بدل دی۔ جسے دیکھ کر گل کے دلکش چہرے پر خوشی کے نرالے رنگ چمک اٹھے۔ وہ دونوں کمروں میں نغمے کی طرح لہراتی ہوئی پھری۔ اس نے ایک ایک کونے، ایک ایک گوشے کو دیکھا اور مسرت سے چہکتی ہوئی بولی۔

"واہ۔ واہ سجاول تم نے تو میرے سکول کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بچے آئیں گے تو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ وہ تو پہچانیں گے بھی نہیں کہ یہ وہی سکول ہے' پہلے والا' ٹوٹا پھوٹا۔"

سجاول کا دل انجانی مسرت سے بھر گیا۔ جو اس کے اندر سے پھوٹی اور اسے شرابور کر گئی۔ وہ اس شادمانی اور سرشاری کا زندگی میں پہلی بار مزہ چکھ رہا تھا۔ اس کا انگ انگ اس شیرینی کو محسوس کر رہا تھا۔ گل جیسی اچھی اور نیک لڑکی کے لبوں سے نکلنے والے یہ لفظ اسے اپنی ہی نگاہوں میں بے حد اہم بنا رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"سجاول۔ تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ میری ایک بڑی پریشانی دور ہو گئی ہے۔ سکول کی تو صورت ہی بدل گئی۔ مجھے بتاؤ اس سب پر تمہارا کتنا خرچہ ہوا ہے۔ میں تمہیں تمہاری مزدوری بھی دوں گی۔"

سجاول کا چہرہ متغیر سا ہو گیا۔ اس نے افسردگی سے سر جھٹکا۔

"یہ کہہ کر تم نے میری ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میری زندگی میں کوئی تو اچھا کام رہنے دو۔ اس کا معاوضہ دینے کی بات کر کے میری ساری زندگی کی اکلوتی خوشی نہ چھینو۔"

"نہیں سجاول!" وہ جلدی سے بولی۔

"یہ تمہارے کام، تمہارے جذبے کا معاوضہ نہیں ہے۔ اس کی قیمت بھلا میں کس طرح دے سکتی ہوں۔ جس لگن سے تم نے کام کیا ہے میں ہزاروں روپے خرچ کر کے بھی اسے حاصل نہیں کر سکتی۔ میں نے تو اس خیال سے کہا تھا کہ نئی زندگی، نیا کاروبار شروع کرنے کے لئے تمہیں رقم کی ضرورت تو ہو گی نا۔"

"جب ایسی کوئی ضرورت ہو گی تو میں تم سے مانگ لوں گا۔" سجاول نے اس کی بات کاٹ کر یوں بے ساختہ کہہ دیا کہ اسے خود پر حیرت سی ہونے لگی۔ وہ اس لڑکی کو کتنا اپنا اپنا سا سمجھنے لگا تھا۔ پھر وہ خود ہی اپنی بات پر شپٹا گیا اور یونہی بات بنانے کو بولا۔

"نہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

ماسی بھی کمرے میں چلی آئی اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"واہ پتر! تو تو بہت اچھا کاریگر ہے۔"

سجاول کا دل بھر آیا۔ وہ ایسی بزرگانہ شفقت کی لذت، ممتا کا شیرین ذائقہ عرصہ ہوا بھول چکا تھا۔ ماسی کے اس محبت بھرے لمس نے اسے یہ گمشدہ فردوسی سوغاتیں لوٹا دی تھیں۔

0......0......0

"بخت آور! جی چاہتا ہے تمہیں سامنے بٹھا کر بس دیکھتا رہوں۔ دیکھتا چلا جاؤں۔ تم کتنی حسین ہو۔ تمہارا حسن۔ تمہاری ادائیں میری جان لے لیں گی۔ زینت کا بھی جواب نہیں تھا لیکن تمہاری تو بات ہی اور ہے۔ دل چاہتا ہے تمہیں چاہوں۔ تم سے محبت کروں۔ تمہیں پوجوں۔ کاش تم صرف میرے لئے وقف ہو جاؤ۔ صرف میرے لئے۔"

بخت آور اکتاہٹ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کا ایک ایک لفظ جیسے اس کے سارے وجود کو داغ رہا تھا۔ وہ زینت کی جگہ اس کوٹھے پر لائی گئی تھی۔ یہ شخص جو زینت کا دیوانہ تھا اب اس کے قصیدے پڑھتا تھا۔ وہ کوئی خبطی سا انسان تھا۔ جب بھی آتا عجیب و غریب باتیں کرتا رہتا۔ بخت آور کا جی چاہتا کہ اس کے منہ پر تھوک دے جو ہوس کو محبت کا نام دے کر محبت کی توہین کرتا رہتا تھا۔

وہ نیم باز آنکھوں سے اس کی جانب والہانہ تکتا ہوا اس کے بالوں میں سجے ہوئے موتیے کے گجرے کو چھو کر بولا۔

"بخت آور! تم نے خود میں اتنا حسن، اتنی دلکشی کس طرح سے جمع کر لی ہے۔ پھولوں کا یہ گجرا بھی اس لئے اچھا لگ رہا ہے کہ تم نے اسے پہنا ہوا ہے۔ اپنی ریشمی زلفوں میں سجایا ہوا ہے۔"

"مجھے تمہاری یہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" بخت آور نے پھولوں کا وہ گجرا اپنے بالوں سے نوچ کر بکھیر دیا۔

اس نے ٹوٹے ہوئے گجرے کے سارے پھول چن لئے اور انہیں اس پر اچھالتا ہوا بولا۔

"ہم اتنے برے بھی نہیں ہیں جان من!"

"تم بہت برے ہو۔ تم بڑے سنگدل ہو۔ تم سارے ہی مرد بہت برے، بہت سنگدل

ہو۔ بے حس اور کٹھور۔'' وہ نفرت سے ہونٹ چبا کر کہنے لگی۔

''تم عورت سے اس کے سارے رشتے چھین کر اسے صرف عورت بنا دیتے ہو۔ تم اس کے گرد ہوس کا جال سا بنتے رہتے ہو اور اسے محبت کا نام دیتے ہو۔ تم محبت کے نام پر تہمت کیوں لگاتے ہو۔ تم عورت کو کھلونا کیوں بناتے ہو؟ تمہیں ہم جیسی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ ہم بھی کسی کی بہنیں۔ کسی کی بیٹیاں ہیں۔''

''واہ۔ واہ۔ واہ بخت آور واہ۔'' اس نے تالی بجا کر داد دی۔

''تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں فلموں میں طوائف کے لئے ایسے ہی زوردار مکالمے لکھتا ہوں تو ہال میں تالیاں بجتی ہیں۔''

بخت آور نے غصے سے منہ پھیر لیا اور خود پر قابو پانے کی کوشش میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

وہ ریشمی گاؤ تکیے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گیا اور اس کی والہانہ نگاہیں اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں گھومنے لگیں۔ بخت آور نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر تم ہمدردی نہیں کر سکتے تو مذاق بھی مت اڑاؤ۔''

''بھئی مذاق کون کافر اڑا رہا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اچھا بات سنو۔ یہاں آ کر بیٹھو۔''

بخت آور نے توجہ نہیں دی اور بوجھل قدموں سے کمرے میں اسی طرح ٹہلتی رہی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا یوں جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہاں آؤ نا بخت آور تمہیں بلا رہا ہوں اور بالکل سنجیدہ ہوں۔ تمہارے سر کی قسم۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔''

بخت آور نے پلٹ کر دیکھا۔ بوجھل قدموں سے قریب آئی اور ایک کرسی کے بازو پر ٹک گئی۔ وہ چند لمحے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''بخت آور! مجھے دوٹوک جواب دو۔ تمہیں یہاں رہنا ہے یا نہیں؟''

بخت آور کی آنکھوں میں ایک تیز چمک جاگی۔ اس نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

''تم میں اتنی جرأت ہے کہ اس کوٹھے سے پاؤں نیچے اتار لو۔ بولو۔ تم میں ہے اتنی

ہمت۔ کہ اس جگہ سے باہر نکل سکو۔''

''تمہیں کیا معلوم کہ میں اس جرم میں کن کن اذیتوں سے نہیں گزری۔ لیکن یہ خیال اب بھی میرے دل سے نہیں نکلا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ اگر اب میں نے بھاگنے کی کوشش کی اور ان لوگوں کے ہاتھ آ گئی تو یہ تیزاب سے میرا چہرہ بگاڑ دیں گے اور مجھے چرسیوں اور افیونیوں کے حوالے کر دیں گے لیکن میں پھر بھی ذلت کی اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ کوئی جگہ ہے تمہاری نظر میں؟'' وہ رازداری سے پوچھنے لگا۔

''جگہ۔'' بخت آور نے ٹھنڈی سانس بھری اور نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

''نہیں، جگہ تو کوئی نہیں۔ مگر خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ مجھے کہیں نہ کہیں سر چھپانے کو جگہ مل ہی جائے گی۔''

''رہیں نا تم بھولی کی بھولی۔ گاؤں کی وہی نادان لڑکی۔ یہاں کوئی کسی کو سر چھپانے کی جگہ نہیں دیتا۔'' وہ زہریلی ہنسی ہنسا۔ ''تم جیسی خوبصورت عورتوں کیلئے یہاں اور وہاں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بس ذرا یہ جگہ بدنام بہت ہے۔''

''نہیں۔ دنیا میں سب تم جیسے نہیں ہیں۔ کوئی اچھے لوگ بھی تو ہوں گے۔'' بخت آور نے تلخی سے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں بھئی۔ دنیا میں اچھے لوگ تو بہت ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ ''لیکن ان اچھے لوگوں کو اپنی عزت کی بہت فکر ہوتی ہے۔''

''خاموش ہو جاؤ۔ میری ہمتوں کو پست نہ کرو۔'' بخت آور نے غصے سے کہا۔

''اچھا سنو۔'' وہ تکیہ دھکیل کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''اچھا اب سچ سچ بتاؤ کہ کیا تم واقعی چھٹکارا چاہتی ہو۔ یہاں سے؟''

''ہاں۔ ہاں۔ اور کتنی دفعہ کہوں کہ تمہیں یقین آئے۔'' بخت آور چڑ گئی

''خفا کیوں ہوتی ہوں جانِ من!'' وہ بڑے لگاؤ سے بولا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے نیا سگریٹ سلگایا اور گہرے گہرے کش لیتا ہوا اپنی کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ بخت آور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے کافی دیر بعد سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے کسی گہری سوچ میں سے ابھر کر کہا۔

"میں تمہاری مدد تو کر سکتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں۔ ایک بات سے ڈرتا ہوں۔"

"وہ کیا؟" بخت آور نے بے تابی سے پوچھا۔

"اب تمہیں کیا بتاؤں۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "میری بیوی کم بخت بڑی ظالم ہے سالی۔ اگر اسے اس بات کی ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو میری خیر نہیں۔"

"اس طرف سے تم بے فکر رہو۔" بخت آور نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"میں تمہارا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے کہیں کوئی معمولی سی نوکری دلوا دینا اور بس۔ اس کے بعد میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔"

"ارے رے رے۔ اب ایسا غضب بھی نہ کرنا ظالم۔ نہیں تو ہم مر جائیں گے۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

سجاول کے پاس کوئی ایسا ہنر نہیں تھا جسے وہ دنیا کے بھرے بازار میں رکھ کر اپنے لئے باعزت زندگی کی ضمانت حاصل کر لیتا اور گل سے کیا ہوا وعدہ نبھا لیتا۔ ان گنت لوگوں سے آباد اس شہر میں کوئی اسے جاننے پہچاننے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنی شناخت اپنے ہاتھوں سے مٹائی تھی۔ وہ اس چہرے کے ساتھ جینا نہیں چاہتا تھا جس کے ماتھے پر قاتل لکھا تھا۔

وہ ایک نئے انداز، نئی پہچان کے ساتھ کارزار حیات میں اترنا چاہتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں تھی۔ کوئی اسے جاننے والا نہیں تھا۔ وہ جہاں بھی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتا اس سے ضمانت طلب کی جاتی۔ اس بھرے پرے اجنبی شہر میں اس کا کوئی ضامن نہیں تھا۔

اس نے دو ایک جگہ دہاڑی بھی لگائی لیکن مشقت کا یہ کام اسے تھکا کر چور چور کر دیتا۔ شام ڈھلے اس کی جیب میں صرف چند سکے ہوتے۔ جن سے وہ بمشکل اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا۔ کچھ اور کرنے کے لئے وقت ہی نہیں بچتا تھا۔

وہ اس طرح کی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اسے فراغت کی ضرورت تھی۔ اسے بھاری جیب چاہئے تھی جو سودا اس کے سر میں سمایا ہوا تھا اس کے لئے کڑکڑاتے نوٹوں کی ضرورت تھی۔ اسے اپنی بہن کو ڈھونڈنا تھا۔ اسے بھاگ بھری کے بھاگ جگانے تھے۔ اسے خاندان کی عزت کو بازار کی ذلت سے نکالنا تھا۔ اس کے لئے اسے سونے کی کنجی کی ضرورت تھی جو کوٹھوں کے دروازے کھول دے۔ جو بند کمروں کے راز آشکار کر دے جو اسے چور دروازوں

کے راستے بتا دے۔

وہ شہر کی خاک چھان چھان کر ہار گیا تھا لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی تھی۔ کوئی راستہ بھی تو روزگار کی طرف نہیں جاتا تھا۔ کہیں عزت کی روٹی نہیں تھی۔ تھک کر وہ ایک تانگے میں بیٹھ گیا اور اسے اسی راستے کی طرف چلنے کو کہا جو گل کے گھر کی طرف جاتا تھا۔

وہ اس دن سے نکلا تھا تو پھر وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی باعزت روزگار حاصل کرے تو گل کا سامنا کرے لیکن ہر طرف ناکامی ہی ناکامی تھی۔ اسی ناکامی سے گھبرا کر اس نے اچانک گل کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ شاید اس کی خوبصورت باتیں اسے سہارا دے سکیں۔ اس کی ڈھارس بندھا سکیں۔ شاید وہ اسے کوئی اچھا مشورہ دے سکے۔ یا شہر میں اپنے کسی شناسا کے بارے میں بتا سکے جو اس کی ضمانت دے دے یا اس کی سفارش کر سکے۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا کہ اسے اپنے پہلو میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔

"جانِ عزیز! جو کچھ جیب میں ہے چپ چاپ نکال دے ورنہ۔"

نوجوان تانگہ بان نے دانت بھینچ کر کہا اور منہ سے کٹاک کی سی آواز نکالی۔ سجاول کو اس لڑکے کی دیدہ دلیری پر غصہ آیا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی اور واردات کا طریقہ بھی منجھا ہوا نہیں تھا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار ہلکی کر دی تھی اور کھلا ہوا چاقو اس کے پہلو میں رکھے ہوئے تھا۔

سجاول نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ بہت گھبرا گیا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دفعتاً جھپٹ کر کوچوان کا چاقو والا ہاتھ گرفت میں لے لیا اور اس کی کلائی اس طرح مروڑی کہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ تانگہ بان کا رنگ اڑ گیا۔ سجاول نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکا اور چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"غنڈہ گردی کرتا ہے کمینے۔"

وہ کھسیانے لگا۔

"معاف کر دے یار۔ چل جانے دے۔ تجھے اللہ رسول کا واسطہ۔"

"اچھا؟ اب تجھے جانے دوں؟" سجاول نے شدید طیش میں اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھٹکا دیا۔

"الو کے پٹھے۔ میں تو تجھے ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ......"

لڑکے نے بدحواسی میں دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اپنا گریبان چھڑاتا ہوا بولا۔

"نہیں۔نہیں۔نہیں۔ مجھے معاف کر دے۔ مجھے کچھ مت کہنا۔"

سجاول نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی غیر معمولی کشادہ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس کے بال پیشانی پر بکھر گئے تھے۔ وہ خوف سے پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اس کی کلائیاں پتلی تھیں اور ہاتھوں کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ سجاول کو کچھ شک سا ہوا۔ لڑکے کی آواز نرم تھی اور اپنا آپ چھڑانے کا انداز کسی مرد کا سا نہیں تھا۔

سجاول نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور کھلا ہوا چاقو اس کی خوف سے پھیلی ہوئی ہراساں آنکھوں کے درمیان رکھ کر بولا۔

"سچ بتا۔ کہیں تو لڑکی تو نہیں۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ سجاول نے اس کے سر پر لپٹا ہوا صافہ کھینچ لیا۔ اس کے سیاہ ریشمی بال شانوں پر بکھر گئے۔ وہ سراسیمگی سے اس کی طرف تکنے لگی اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

سجاول کو اس پر ترس بھی آیا اور غصہ بھی۔ اسے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ اس کا مخاطب لڑکا نہیں۔ لیکن اب یقین آ جانے پر اسے افسوس بھی ہوا تھا۔ نہ جانے کون سی مجبوری تھی جو اس نوخیز لڑکی کو شباب کے ان البیلے دنوں میں گھر کی دلہیز سے باہر لے آئی تھی۔ اس نے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کرختگی سے بولا۔

"تجھے کوئی اور کام نہیں ملا تھا کرنے کو الو کی پٹھی۔"

لڑکی نے سہمی سہمی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے بکھرے ہوئے ریشمی بال اپنے صافے میں لپیٹتی ہوئی بولی۔

"مجبوری ہی سب کچھ کراتی ہے۔ ورنہ کون خوشی سے جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔"

"تجھے کیا مجبوری ہے؟" سجاول نے درشتی سے پوچھا۔

لڑکی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ارادے خطرناک نہیں۔ اس لئے اس کا خوف کم ہو گیا تھا۔ وہ اب پہلے کی نسبت کچھ اطمینان اور بے تکلفی سے بات کرنے لگی تھی۔

"باپ مر گیا۔ ماں مر گئی۔ بھائی آوارہ نشئی ہو گیا تو اب کس کے آسرے جیوں۔"

سجاول ان راہوں کے پیچ وخم سے آشنا تھا۔ اس نے زندگی کی دھوپ چھاؤں کو ننگے

پنڈے پر جھیلا تھا۔ گل کی خوبصورت باتوں کی مہک ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اس ڈھب کو بدلنے پر اپنے پورے جذبوں کے ساتھ آمادہ تھا۔ وہ تمام باتیں جو گل نے اس سے کہی تھیں وہ اس لڑکی سے کہنے لگا۔ وہ اسے سمجھانے لگا۔ اسے اس دلدل سے نکلنے پر آمادہ کرنے لگا۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے بے خیالی میں جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر ایک لمبا کش لیتے ہوئے بولی۔

"یار یہ سگریٹ تو ایک ہی ہے۔ لے تو بھی کش لگا لے۔" اس نے سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔

سجاول نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"تو سگریٹ بھی پیتی ہے؟"

"ہاں۔ بس منہ کو لگ گیا ہے۔" وہ عادی سگریٹ نوشوں کی طرح کش پہ کش لیتے ہوئے بولی۔

"نشہ بھی کرتی ہے؟" سجاول نے پوچھا۔

"نہیں۔ نشہ نہیں لگاتا۔ یہ ٹٹ پینا نشہ تو اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔" اس نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

"اس نشے نے تو میرا بھائی مجھ سے چھین لیا ہے۔ وہ اپنے ہوش میں ہوتا تو میں گھر سے کیوں نکلتی۔"

سجاول کو افسوس سا ہوا۔

"تو تو کوئی اور کام کر لیتی نا۔"

"اور کام کیا کرتی۔" اس نے گھوڑا چلانے کی مخصوص آواز نکالی۔

"یہ تانگہ چلانا کوئی برا کام ہے کیا؟"

"اور ساتھ جو یہ وارداتیں کرتی ہے وہ۔" سجاول نے غصے سے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ تو آج پہلی بار کی ہے اور تو ٹکر گیا۔ یہ چاقو مل گیا تھا کہیں سے۔ میں نے کہا۔ چلو ہاتھ دکھائیں۔"

"بڑی کمینی ہے تو۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ابھی تجھے سیدھا کر دیتا۔" سجاول نے

ملامت بھرے انداز میں کہا۔

''اونہہ۔'' اس نے ناک سکوڑی۔ ''یہاں ہم نے بھی ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔ کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔'' اس نے منہ ہی منہ میں گالی بکی۔

''بڑی پھنے خان بن رہی ہے اور ابھی کیسے تیری جان نکل رہی تھی۔ کیسے معافیاں مانگ رہی تھی۔ مری جاتی تھی۔'' سجاول نے جتایا۔

وہ کھسیانی سی ہوگئی لیکن پھر ڈھٹائی سے بولی۔

''وہ تو میں نے کہا کیا خون خرابا کرنا۔ اسی طرح کام نکلتا ہے تو نکل جائے۔ نہیں تو تو دیکھتا۔''

سجاول کو اس کی شیخی بگھارنے پر ہنسی آگئی۔

''کیسا فضول بک رہی ہے۔ میں تجھے پھر ایک بار کہتا ہوں کہ کوئی شریفوں والا کام کر۔ خوانخواہ کیوں اپنے خاندان کی عزت کو تماشا بناتی ہے۔''

''اچھا۔ تو تو دلا دے مجھے کوئی شریفوں والا کام۔ تو دلا دے۔'' وہ منہ پھاڑ کر کہنے لگی۔

سجاول ہنس پڑا۔

''ابھی تو میں اپنے لئے کام ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ تجھے کہاں سے کام دلاؤں۔''

''تو فکر کیوں کرتا ہے۔'' وہ بے تکلفی سے اس کے زانو پہ ہاتھ مار کر بولی۔

''چل میرے ساتھ۔ ملاں پسوڑی کے پاس بڑے کام ہیں۔ جیسا کہے گا کام مل جائے گا۔''

سجاول نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ملاں پسوڑی کون ہے۔ الو کا چرخا۔''

وہ یوں بے ساختہ ہنسی جیسے اس کی بات کا بہت لطف لیا ہو۔

''بہت کھرا آدمی ہے۔ سارا شہر اس کی مٹھی میں ہے۔'' اس نے مٹھی بند کر کے اس کے سامنے لہرائی۔

''تم ایک بار اس سے مل کر تو دیکھو یار! وہ تمہارے لئے کوئی نہ کوئی کام نکال ہی لے گا۔''

سجاول نے لمحے بھر کو سوچا کہ اس سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ اس شہر کا واقف

حال ہوگا۔ شاید اس کے ذریعے ہی اسے کوئی معقول ملازمت مل جائے۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔

''چل اب پہلے اسی طرف چل۔ تیرے ملاں پسوڑی کو بھی دیکھ لیتے ہیں کتنے پانی میں ہے۔''

''وہ پانی میں نہیں۔ وہ تو آپ سمندر ہے سمندر۔'' اس نے گھوڑے کی باگ موڑ کر اسے دوسرے راستے پر ڈال دیا۔

آبادی سے کچھ دور نکل کر وہ کچے راستے پر چل پڑی۔ گھوڑے کے سموں سے اڑتی ہوئی دھول میں اسے دور ایک پرانا حویلی نما مکان نظر آیا۔ لڑکی نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور چھلانگ لگا کر نیچے اتری۔ گھوڑے کی لگامیں تانگے کے ساتھ باندھتے ہوئے وہ شرارت سے بولی۔

''آجاؤ بادشاہو! جی آیاں نوں۔''

سجاول چاروں طرف متجسس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دور سے حویلی کافی بڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا اونچا دروازہ بھدا اور پرانا لیکن مضبوط تھا۔ لڑکی نے دروازے پر دستک دی تو گیٹ میں سے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور ایک بڑی بڑی مونچھوں والے کرخت چہرے نے باہر جھانکا۔

''میں ہوں پائیا کھل۔ میں ہوں شہزادی۔'' وہ بلند آواز میں بولی۔ تو سجاول کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شہزادی ہے۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ وہ دوڑ کر تانگے پر سوار ہوئی اور اسے اندر لے جا کر وسیع صحن میں کھڑا کر دیا تب تک سجاول بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔

''آجا یار۔ آجا۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے بولی اور اس نے آگے بڑھ کر ایک دروازے پر پڑی ہوئی چلمن اٹھائی۔

''ملاں جی! اجازت ہے۔'' وہ چہکی۔

پھر چلمن اٹھا کر اندر گھس گئی۔ سجاول بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اسے فضا میں رچی ہوئی ایک مانوس سی بو کا احساس ہوا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے مضبوط جسم اور اونچے قد کا ایک اوسط عمر آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی سیاہ گھنی داڑھی اس کے چوڑے شانوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بل کھاتی ہوئی گھنگھریالی زلفیں اس کی گھنی داڑھی میں الجھ کر رہ

گئی تھیں۔ بے حد سیاہ بالوں نے اس کی سرخ و سپید رنگت کو نمایاں کر دیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ یہی ملاں پسوڑی ہے۔ شہزادی نے آگے بڑھ کر جیسے اس کا تعارف کرایا۔

''ملاں جی۔ یہ بیچارا بندہ بے روزگار ہے۔''

''اچھا!'' اس نے بھاری آواز میں کہا اور سجاول کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں بھئی یار! کیا مسئلہ ہے تیرا؟''

سجاول نے راستے میں سوچ لیا تھا کہ وہ اسے کیا کہانی سنائے گا۔ وہ اس کے سوالوں کے نپے تلے جواب دیتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ ملاں کے شکوک دور ہو گئے اور اس کے انداز میں قدرے نرمی آ گئی۔

''سجاول!'' اچانک عقب سے کسی نے پکارا۔

سجاول اپنا نام سن کر چونک گیا۔ اس نے ملاں کو اپنا اصل نام بھی نہیں بتایا تھا لیکن اچانک اپنا نام سن کر اس نے بے خیالی میں پلٹ کر دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ ہونٹوں پر ایک خبیث مسکراہٹ لئے مستانہ اس کے مقابل تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ سجاول ایک لمحے کو پسینے پسینے ہو گیا۔ شکرے کا بے جان چہرہ اور پتھرائی ہوئی آنکھیں اس کی نگاہوں میں گھوم گئیں۔ وہ ماضی کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

مستانہ قریب آ کر مصنوعی رازداری سے بولا۔

''واہ۔ اوئے سجاولا۔ تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تو پولیس کی آنکھیں آ گئیں اور تو یہاں چھپا بیٹھا ہے۔ بلے بھئی بلے۔''

سجاول جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اسے نہ انکار کرتے بن پڑتی تھی نہ اقرار۔ قسمت اسے گھیر گھار کر یہ کہاں لے آئی تھی۔ جس جرم کو چھپانے کیلئے وہ در بدر بھٹکتا پھرتا تھا۔ مستانہ اس کا اشتہار بن کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ ملاں پسوڑی کے کان میں گھسا ہوا نہ جانے کیا پھونک رہا تھا۔ اس کی بات سنتے ہی ملاں کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی تھی۔ وہ یوں سر ہلا رہا تھا جیسے جھوم رہا ہو۔

مستانے نے آنکھ میچ کر کہا۔

''ملاں جی! یہ تو بڑے کام کا آدمی ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا۔''

ملاں نے ایک شاطر مسکراہٹ اس کی جانب پھینکی۔

''کیوں بھئی جوان! تو تو ابھی کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔''

سجاول الجھ کر رہ گیا۔ وہ باوجود کوشش کے ماضی کے اس گھنگھور سائے سے نہیں نکل سکتا تھا جس نے اس کے ماتھے پر اس کی سابقہ زندگی کے جرائم کھود دیئے تھے۔ وہ ان سے کس طرح انکار کر سکتا تھا۔ بات اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ اس کے قدموں تلے زمین نہیں رہی تھی۔ وہ کسی دلیل، کسی جواز سے انہیں قائل نہیں کر سکتا تھا۔ مستانہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے نگاہیں ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ ساری آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ سب کے درمیان مجرم بنا بیٹھا تھا۔

شہزادی نے ملاں کے شانے پر سے جھانکا اور مترنم قہقہہ لگا کر بولی۔

''مانتے ہو نا ملاں جی! یہ کیسا تحفہ لا کر دیا ہے۔ اول نمبر۔''

سجاول بھنا گیا۔ اسی آفت کی پڑیا نے اسے یہاں لا پھنسایا تھا ورنہ تو وہ دل میں ٹھان کر چلا تھا کہ گل کی دہلیز پر جا کر اس سے اپنے لئے تسلی اور ڈھارس مانگے گا۔

شہزادی نے سگریٹ کا کش لیکر دھواں اس کی طرف چھوڑتے ہوئے اٹھلا کر کہا۔

''سوہنیو۔ کیوں جوانی رولتے ہو۔ اپنے پر نہیں تو کچھ ہمارے حال پر رحم کرو۔''

سجاول کا جی چاہا۔ اس کا گلا گھونٹ دے۔ اس نے سارا غصہ اس پر نکالا۔

''بکواس نہ کر کم ذات۔'' وہ گالی دے کر بولا۔

ڈیرے کے دوسرے لوگ اور ملاں پسوڑی سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

''اوئے یار! اس کی بات کا کیا برا ماننا ہے۔ یہ تو ہمارے ڈیرے کی چڑیا ہے چڑیا اور چڑیوں کی بولی کا بھی کبھی کسی نے برا منایا ہے۔''

شہزادی ہنسی کے مارے دوہری ہو گئی۔ سجاول نے دانت بھینچ کر خود پہ قابو پایا۔ ملاں نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا اور ایک عجیب سی سرد کر دینے والی مفاہمت کے انداز میں بولا۔

''دیکھ یار! ہم یاروں کے یار ہیں۔ تیرے لئے چھاؤں بن جائیں گے۔ ایسا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل۔ نہیں تو تیرا بھلا تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اتنا سوچ لینا۔''

سجاول کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ جہاں سے چلا تھا وہیں واپس آ گیا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر ملاں پسوڑی کی طرف دیکھا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ ملاں کی تیز آنکھوں کی ظالم چمک اسے حصار میں لے رہی تھی۔

⁂

''تم نے جہاں اتنے احسان کئے ہیں ایک احسان اور کر دو۔ مجھے کوئی ملازمت دلوا

دو۔ مجھے کوئی کام کرنے میں عار نہیں۔ عزت کی زندگی کے لئے میں گھروں میں برتن بھی مانجھ سکتی ہوں۔ میں ہر کام کرلوں گی۔'' بخت آور نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

وہ جان پر کھیل کر اس کے ساتھ نکل آئی تھی۔ وہ چھپتا چھپاتا اسے ایک ہوٹل میں لے آیا تھا۔ جہاں اس نے کمرا پہلے سے لے رکھا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کے لئے یہ کمرہ اس کے فلمساز نے لیا ہوا تھا تاکہ وہ یہاں سکون سے اس کی فلم کے لئے کہانی اور مکالمے لکھ سکے۔ اسے یہاں آئے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہ دن بھر اس کمرے میں اکیلی بند رہتی۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ دروازہ بالکل مت کھولے۔

شام کو وہ آجاتا۔ اس کے لئے کھانا بھی لاتا اور رات گئے تک وہیں رہتا۔ پھر وہ ہوتی اور اس کی تنہائی۔ اور پکڑے جانے کا مار دینے والا خوف۔ جب بھی وہ آتا بخت آور اس سے پہلا سوال یہی کرتی کہ اس کی ملازمت کا کوئی بندوبست ہوا ہے یا نہیں۔ اور وہ جواب میں ہر روز ایک ہی بات کہتا۔

''بھئی۔ میں تو ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی بات ہی نہیں بنتی۔ تم اطمینان رکھو میری جان۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔'' وہ اپنے مخصوص لاابالی انداز میں کہتا اور گہری نگاہوں سے اس کے دلکش چہرے کی طرف تکتا رہتا۔ بخت آور اکتا گئی۔

''میں تو ہوٹل کے اس کمرے میں قید رہ رہ کر تنگ آگئی ہوں۔ بس ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ ڈرتی رہتی ہوں میں۔ وہ لوگ تو مجھے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہوں گے۔''

''اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ کچھ وقت گزر جائے تو اچھا ہی ہے۔ تمہارے وہ کچھ لگتے۔ ذرا تھک ہار کر بیٹھ تو جائیں کہ اب تم ان کے ہاتھ نہیں آؤ گی۔'' وہ مزہ لیتے ہوئے بولا۔

''یہ انتظار، یہ بے یقینی۔ بڑی اذیت ناک ہے۔'' وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا اس کے قریب آیا اور اس کی تھوڑی تلے انگلی رکھ کر اس کا دلکش چہرہ اوپر اٹھا کر بولا۔

''بخت آور تمہیں کیا معلوم کہ تم کیا ہو؟ تمہیں تو چاندنی، خوشبو اور نور سے تراشا گیا ہے۔ میں تمہیں دلوں کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن۔ تم برتن مانجھنے یا معمولی

کام کرنے کے لئے نہیں بنی ہو۔''

بخت آور نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ مجھے تو اب تم پر شک سا ہونے لگا ہے۔''

''مجھ پر شک!'' وہ مصنوعی حیرت سے کہنے لگا۔

''خدا کا نام لو بخت آور۔ اتنے لوگوں میں سے تم نے صرف مجھ پر ہی اعتبار کیا ہے اور اب شک کر رہی ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ میرے دل میں تمہارے لئے کتنی جگہ ہے۔ لیکن تم ہو کہ میرے خلوص کو تسلیم ہی نہیں کرتی ہو۔ خدا کی قسم بڑی ظالم ہو تم۔ بڑی ستم شعار ہو۔ اپنے پرستار کے سچے جذبوں پر شک کرتی ہو۔ چ چ چ۔''

''مجھے باتوں سے نہ بہلاؤ۔'' بخت آور نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''اگر واقعی تمہارے دل میں میری کوئی قدر ہے تو مجھے عزت کی زندگی کی طرف جانے دو۔''

''تمہاری یہ جلد بازی۔ تمہاری یہ جلد بازی۔'' وہ دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بخت آور خانم میں تو تمہیں وہ مقام دلانا چاہتا ہوں جو تمہارے شایان شان ہو۔ جو تمہارے قابل ہو۔''

''میں تو سنگسار کئے جانے کے قابل ہوں۔'' وہ ملامت بھرے لہجے میں بولی۔

''نہ۔ نہ۔ اس طرح نہ کہو بخت آور۔ ہائے میرا دل دکھتا ہے۔'' وہ اداکاری کرتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''تم تو دل لگی کر رہے ہو۔'' بخت آور نے بے دلی سے اسے ٹوکا۔

''تمہیں پتہ ہے بخت آور۔ میں ایسے موقعوں پر فلموں میں کیسے مکالمے لکھتا ہوں۔ ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

''جج صاحب! مجھے نہیں۔ اس معاشرے کو سنگسار کیجئے۔ جس نے گناہوں کا یہ طوق میرے گلے میں ڈال دیا ہے۔ مجھ سے پہلے ان نگاہوں کو سزا دیجئے جنہوں نے مجھے تماشے کی اور نظارے کا بہانہ بنا دیا ہے جج صاحب!''

''چپ ہو جاؤ۔ خدا کیلئے خاموش ہو جاؤ۔'' بخت آور نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تمہیں کسی کے جذبات کا خیال ہی نہیں ہے۔ تمہیں ہر بات میں مکالمے سوجھتے ہیں۔''

''چ۔ چ۔ چ!'' وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔

''ہائے میرے مکالموں کی ایسی ناقدری۔ بخت آور! تم کیا جانو کہ میرے مکالموں پر

سینما ہال میں تالی بجتی ہے۔ عورتوں کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ہر سال بہترین مکالمہ نگار کا ایوارڈ تمہارے اس نیاز مند کو ہی ملتا ہے۔''

بخت آور بے چینی سے اٹھ گئی۔

''مجھے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ تم مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ آج مجھے صاف صاف بتا دو کہ آخر تم کیا سوچ رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔''

وہ بھی اٹھ کر قریب آ گیا۔ اس نے شانوں سے تھام کر اسے اپنی جانب گھمایا۔ چند لمحے اس کے تمتمائے ہوئے دلکش چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بخت آور۔ تم بہت حسین ہو۔ ناچ گانے کے فن سے واقف ہو۔ دل پر چوٹ کھائے ہوئے ہو۔ تم......'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور اپنی بات پر زور دیتا ہوا بولا۔

''تم بہت اچھی فنکارہ بن سکتی ہو۔''

''کیا؟'' بخت آور نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم فلموں میں کام کرو۔ میں تمہیں فلموں کی ہیروئن بنانا چاہتا ہوں۔ خدا کی قسم تم سب کا نمبر کاٹ دو گی۔ ہر طرف تمہارے چرچے ہوں گے۔''

''تم میرے پاؤں میں پھر گھنگرو باندھنا چاہتے ہو؟'' بخت آور نے اس کی بات تلخی سے کاٹ دی۔

''اوہو۔ نہیں بھئی۔ تم میری بات نہیں سمجھیں۔'' وہ عجلت میں بولا

''میں سب سمجھتی ہوں۔ اتنی نادان نہیں۔'' بخت آور نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔

''لیکن تم بھی یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ کبھی نہیں ہو گا۔''

''ایک تو تم جذباتی بہت ہو یار! بغیر سوچے سمجھے بولنا شروع کر دیتی ہو۔'' وہ مفاہمت کے انداز میں نرمی سے بولا۔

''دیکھو نا جان من! آج کل تو اچھے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں معمولی چانس کے لئے ترستی پھرتی ہیں۔ ہاتھ پیر جوڑتی ہیں۔ سٹوڈیو کے چکر لگاتی ہیں اور کیا کچھ نہیں کرتیں۔ مگر کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہیں ہیروئن بننے کا چانس مل رہا ہے۔ میری کہانی چٹکیوں میں بکتی ہے۔ فلمساز میرے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔ ہیروئنیں میری منت خوشامد کرتی ہیں۔ میں جس کے لئے کہہ دوں فلمسازوں کی مجال نہیں کہ اسے ہیروئن لینے سے

انکار کرے۔ تمہاری ایک فلم ہٹ ہو گئی نا تو پھر تم دیکھنا سارے ملک میں تمہارے ہی نام کی دھوم ہو گی۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ مجھے یہ سب نہیں چاہئے۔'' بخت آور نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں ہیروئن نہیں بننا چاہتی۔ میں گمنام رہنا چاہتی ہوں۔ میرا بھائی مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ وہ مجھے پردے پر ناچتا دیکھ کر مر نہیں جائے گا۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔''

''تم بھی بہت بھولی ہو بخت آور!'' وہ ہنسا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ تم اب تک گاؤں کی وہی سیدھی سادھی لڑکی بھاگ بھری ہو۔ میری جان تم بہت بدل گئی ہو۔ کبھی آئینہ تو دیکھو۔ تم خود کو نہیں پہچان سکو گی۔ تمہیں آئینے میں بخت آور ہی نظر آئے گی۔ بھاگ بھری نہیں اور اب تو ہم تمہیں خوش بخت بنا دیں گے۔ فلمسٹار خوش بخت تمہارے تو وہ ٹھاٹھ ہوں گے کہ تمہارا بھائی تو کجا تمہیں تو تمہارے یہ کوٹھے والے بھی نہیں پہچانیں گے۔''

''کوئی مجھے پہچانے یا نہ پہچانے۔ میں تو خود کو پہچانتی ہوں نا۔'' بخت آور نے قطعی لہجے میں کہا۔

''میں اپنے ہاتھوں اپنے خاندان کی عزت کو تماشہ نہیں بناؤں گی۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں میں گھنگھرو نہیں باندھوں گی۔ میں اس دوزخ سے اس لئے تو نہیں نکلی تھی کہ ایک نئے جہنم کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤں۔''

وہ نرمی سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ کس طرح رضامند نہیں ہوئی۔

وہ اس کی ہر بات کے جواب میں انکار ہی کرتی رہی۔ وہ کچھ جز بز سا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتا پیشانی سے بال جھٹکتا۔ ہونٹ چباتا ہوا۔ وہ نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر اس کی طرف پلٹا اور غیر مانوس سے لہجے میں بولا۔

''بخت آور! تمہیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ تمہیں بڑے آرام سے پھر وہیں پہنچایا جا سکتا ہے۔ جہاں سے تمہیں جان جوکھوں میں ڈال کر نکالا گیا ہے اور وہاں تمہارا جو حشر ہو گا وہ تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ اس کے چہرے پر بڑی بے رحم سختی تھی اور وہ اجنبی سی نگاہوں سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔

بخت آور سناٹے میں رہ گئی۔ اس کی گھورتی ہوئی بے رحم نظریں اسے اپنے وجود میں تیر کی طرح پیوست ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

اسے یوں لگا جیسے وہ ایک جال سے نکل کر دوسرے جال میں پھنس گئی ہے۔ اس نے بے چارگی سے سر جھکایا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تم مجھ پر رحم نہیں کر سکتے۔ مجھے مجبور سمجھ کر۔''

''دیکھو۔ میں نے اپنی جان اور عزت داؤ پر لگا کر تمہیں وہاں سے نکالا ہے۔ اب بھی ان کی طرف سے خطرہ ہے۔ اتنے دنوں سے تمہیں اس فائیو سٹار ہوٹل میں رکھا ہوا ہے۔ کیوں؟ کس لئے۔ میں کوئی احمق یا چغد نہیں ہوں۔ میں نے کچھ سوچ کر ہی یہ رسک لیا ہے۔ سمجھیں تم؟''

اس کا قطعی انداز بے حد درشت تھا۔

بخت آور سن سی ہوگئی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ مغموم سے لہجے میں بولی۔

''غلطی میری ہی ہے میں نے تم پر اعتبار کر لیا۔ میں نے تم سے غلط توقعات وابستہ کر لی تھیں لیکن اس غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا تو نہ دو۔''

''خوانخواہ مظلوم بننے کی کوشش نہ کرو بھئی۔'' وہ بے نیازی سے کہنے لگا۔

''ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔ میری بات پر سنجیدگی سے سوچو۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔''

''میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔'' بخت آور نے سر اٹھا کر تیزی سے کہا۔

''اور سنو۔ تم مجھے میری مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ سمجھے تم۔''

اس کے انداز میں سرکشی اور بغاوت کا تناؤ تھا۔

''بخت آور!'' اس نے اپنا لہجہ یکسر بدل دیا اور اسی مانوس ملائمت سے کہنے لگا۔

''یوں ایک دم فیصلے نہیں کر لیا کرتے۔ ہر بات پر خوب سوچ سمجھ لینا چاہئے۔''

''میں نے سوچ لیا ہے۔'' بخت آور نے قطعی لہجے میں کہا۔

''مجھے اب کچھ اور نہیں سوچنا۔ یہ فیصلہ ایک پل کا نہیں۔ میں نے ساری زندگی اس فیصلے کیلئے اذیت سہتے ہوئے کاٹی ہے۔ میں اسے نہیں بدل سکتی۔''

''عجیب ہو بھئی تم بھی۔'' اس کا انداز دوستانہ اور ملائم ہو گیا۔

''میری بات غور سے سنو بخت آور! اس قدر جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم

ناتجربے کار یا کم عمر نہیں ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کو اپنے سامنے رکھو۔ اپنے حالات، اپنی حیثیت، اپنے ماضی کو فراموش نہ کرو۔ میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا لیکن حقیقت تو بہر حال حقیقت ہے۔'' وہ ڈرامائی انداز میں لمحے بھر کو خاموش ہوا پھر گہری نگاہوں سے اس کی جانب تکتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

''تم اب ایک عام عورت نہیں ہو۔ تم نے ایک عرصہ اس بازار میں گزارا ہے۔''

بخت آور اذیت سے بے حال ہو گئی۔ ماضی کے چھینٹے کیچڑ کی طرح اس پر آن گرے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سارے وجود سے اس بازار کا تعفن اٹھ رہا ہے۔ وہاں گزرے ہوئے سارے لمحے اس کے ماتھے پر لکھے ہیں۔ وہ بے قراری ہو کر اٹھی اور تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی۔

''مجھے ایسی زندگی کی ضرورت نہیں۔ میں ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہنا چاہتی۔''

وہ لپک کر اٹھا اور اسے راستے میں ہی جا لیا۔

''بخت آور! عقل سے کام لو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ پاگل نہ بنو۔''

''چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔'' بخت آور نے اس کی گرفت میں تڑپتے ہوئے دیوانگی سے کہا۔

''میرا راستہ نہ روکو۔ مجھے مرنے دو۔ مجھے مر جانے دو۔'' اس نے اس کی قمیص کھسوٹ ڈالی۔ اس کی گردن اور بازوؤں کو ناخنوں سے زخمی کر دیا۔

اس نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اسے زور دار جھٹکا دیا۔

''یہ کیا حماقت ہے بخت آور! تم اپنے ساتھ مجھے بھی پھنسواؤ گی۔ تمہاری خودکشی کے بعد میں کس کس کو صفائیاں پیش کرتا پھروں گا۔ عجیب بیوقوف عورت ہو تم۔ میں تو تمہیں لا کر پچھتایا۔''

بخت آور اس کی بے رحم گرفت میں بے بس ہو گئی۔ اس نے وحشت سے سر دائیں بائیں جھٹکا۔

''خدایا۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟''

وہ اسے بانہوں میں لئے ہوئے کھڑکی سے دور ہٹ آیا اور اس کے بالوں پر مشفقانہ تھپکی دے کر بولا۔

''بخت آور اپنے ذہن کو صاف رکھو۔ دیکھو اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈالو۔ ابھی کچھ اور مت سوچو۔ اپنے اعصاب کو پرسکون رکھو۔ شاباش۔ ابھی تو سوچنے کیلئے بہت وقت پڑا ہے۔''

''شہزادیو! سناؤ کیا حال چال ہے؟'' شہزادی نے شرارت سے ناچتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''یہ لو سگریٹ پیو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے؟'' اس نے ٹوپی میں سے سگریٹ نکال کر اسے اپنے ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ کے ساتھ سلگاتے ہوئے کہا۔

سجاول نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ اس کی کھنکتی ہوئی چنچل ہنسی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ گھوم کر پھر اس کے سامنے آ گئی اور سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔ سجاول زچ ہو گیا۔ اس نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر فرش پر پھینکا اور اس پر اپنا بھاری جوتا رکھ دیا۔

''دفع ہو کمینی۔'' وہ گالی دے کر بڑبڑایا۔

وہ اس کے چڑ جانے پر محظوظ ہوئی۔

''اوئے ہوئے۔ یار! یہ کیا ظلم کر دیا۔ یہ تو بڑی اونچی نسل کا سگریٹ تھا۔ بس یہ دو ہی تو ملاں کے تکئے کے نیچے سے بڑی مشکل سے پار کئے تھے۔''

''جا جہنم میں۔'' سجاول غصے سے غرایا۔

''جہنم کا راستہ تو بتا دے۔'' وہ فوارے کی طرح ابلتی ہوئی مترنم ہنسی کے ساتھ بولی۔

سجاول کو اس کی بے تکی باتیں زہر لگتی تھیں۔ وہ بے حد شریر، چونچال، نٹ کھٹ اور بے باک تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے کا ایک ایک نقش باتیں کرتا تھا۔ اسے نہ کسی کی پروا تھی نہ لحاظ۔ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے ساتھ وہ اس بے تکلفی سے بات کرتی تھی جیسے اس کی ہم عمر سہیلیاں ہوں۔ اس نے لڑکوں کا حلیہ اور عادات اپنا لی تھیں۔ پہلی نگاہ میں وہ لڑکا ہی معلوم ہوتی تھی۔ خود اس نے بھی جیسے فراموش کر دیا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ جب وہ ڈیرے پر ہوتی تو یہاں سے وہاں شرارتیں کرتی۔ چہکتی پھرتی تھی۔ ملاں نے صحیح کہا تھا کہ وہ اس کے ڈیرے کی چڑیا تھی۔

سجاول کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس نے ہی اسے اس جال میں لا پھنسایا تھا۔ وہ اس وقت کو پچھتاتا تھا جب وہ اس کے ساتھ ملاں کے ڈیرے پر چلا آیا تھا۔ اور یہاں سے

نکلنے کے سارے راستے اس کے لئے مسدود ہو گئے تھے۔ ملاں اور اس کے کارندے ہر وقت اس پر نگاہ رکھتے تھے۔ وہ ان کے ہاتھوں کھلونا بننے پر مجبور تھا۔ وہ ابھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ ابھی پھانسی کا پھندہ گلے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسے تو ابھی بھاگ بھری کا کھوج لگانا تھا۔ اپنے خاندان کی عزت کو بازار سے نکالنا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈے بغیر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتا تو باوجود تھکن کے اس کی آنکھیں نیند سے خالی رہتیں اور حالات کی تلخیاں زہر بن کر اس کے رگ و پے میں آگ لگانے لگتیں۔ اسے اپنا بھرا پرا گھر یاد آتا جو پل بھر میں ویران ہو گیا تھا۔ اسے ماں کا مہربان چہرہ اور گرم گود یاد آتی۔ اسے بابا کا خیال آتا جو نامعلوم زندہ بھی تھا یا اپنے غموں کو سینے سے لگائے کہیں جا سویا تھا۔ پھر اسے رانی کا خیال آتا۔ اس کا دلکش چہرہ۔ اس کی محبت بھری نگاہوں کی یاد اس کے دل میں ہلچل مچا دیتی۔ وہ پریشانی سے اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا اور سوچتا کہ تقدیر کی گردش اسے کہاں لے آئی تھی۔

وہ اپنے محور سے دور ہٹ گیا تھا۔ گل نے اسے جو آس دلائی تھی وہ کب کی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے اپنی صورت دکھا سکے۔ وہ اس سے کیا ہوا وعدہ نہیں نبھا سکا تھا۔ وہ ایک بار پھر ناپسندیدہ اور قابل نفرت زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ شہزادی کی موجودگی فراموش کر کے نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ افسردہ، مغموم، اکتایا ہوا سا۔ بددل اور پشیمان۔ وہ شوخ نگاہوں سے اس کی محویت کو دیکھتی رہی۔ جب وہ اپنے آپ میں ہی الجھا رہا اور اس کی جانب متوجہ نہیں ہوا تو اس نے گلے میں بندھا ہوا ریشمی رومال لہرا کے اس کے سر پر ڈال دیا اور کھل کھل ہنستی ہوئی بولی۔

''واپس آ جاؤ سرکار! بڑی دور نکل گئے ہو۔''

سجاول چونک گیا۔ اس نے جھپٹ کر رومال پھینکا اور چڑچڑے پن سے بولا۔

''دفع ہو۔ چل پرے ہٹ۔''

شہزادی نے شرارت سے ایک آنکھ میچی اور اس کے برابر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''سوہنیو۔ کبھی تو ہنس بول لیا کرو۔''

سجاول بیزار ہو کر اٹھ گیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے غصے سے غرایا۔

''دفع ہو جا۔ جا کہیں اور جا کے مر۔''

وہ لڑکھڑاتی۔ بے تحاشہ ہنستی دروازے تک پہنچ گئی اور چنچل پنے سے نہ معلوم کیا کہنے لگی۔

بابو دروازے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ شہزادی کی آواز سن کر وہ اندر آ گیا۔ وہ ڈیرے کا سب سے فیشن ایبل لڑکا تھا۔ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اپنے لباس اور ظاہری ٹپ ٹاپ کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسی لئے سب اسے بابو کہتے تھے۔

اس نے تیکھی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا اور سجاول سے بولا۔

"کیوں اوئے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سجاول نے اسے نظر انداز کر دیا اور اپنا تولیہ اٹھا کر نہانے چل دیا۔ بابو تلملا کر آگے بڑھا اور اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالتا ہوا بولا۔

"اوئے۔ مجھ سے بات کر کے جا۔ تو یہاں کیا کر رہا تھا اس کے ساتھ۔"

سجاول نے ایک ہی جھٹکے میں اس سے اپنا گریبان چھڑا کر اسے پرے دھکا دیا۔

"جا۔ اپنی اس کچھ لگتی سے پوچھ۔"

شہزادی کے سامنے اپنی اس سبکی پر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ بے تحاشہ گالیاں بکتا وہ اس کی طرف جھپٹا۔ سجاول بھی بھنا کر پلٹ آیا اور اس نے تابڑ توڑ کئی گھونسے اس کے جبڑے پر جڑ دیئے۔

"اب گالی بکی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

شہزادی بے ساختہ ہنس پڑی۔ بابو چکرا گیا تھا۔ سجاول نے بابو کا گریبان پکڑ کر اسے شہزادی کی طرف دھکا دیا اور غصے سے غرایا۔

"لے۔ بتا اپنے ماے کو کہ تو یہاں کیا کر رہی تھی۔"

شہزادی کی ہنسی رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے بولی۔

"کیوں ماما جی! پوچھو کیا پوچھنا ہے۔"

بابو نے دانت کچکچا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہزادی کو ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ فوارے کی طرح اس کی مترنم ہنسی ابلتی چلی جا رہی تھی۔ سجاول نے ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی اور تولیہ شانے پر ڈالتا ہوئی باہر نکل گیا۔

سائیں سائیں کرتی سیاہ رات میں وہ گھنی جھاڑیوں میں سے رائفلیں تانے ہوئے نکلے اور انہوں نے مسافر بس کو سنسان راستے میں روک لیا۔ مسافروں کی دہشت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بچے خوف سے رونے لگے۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ان کے سیاہ لباس اور رائفلوں کی چمکتی ہوئی نالیاں فضا میں دہشت گھول رہی تھیں۔ لوگ ششدر سے اپنی جگہ پر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

سجاول نے دبنگ لہجے میں کہا کہ سب لوگ خاموشی سے نقدی اور دوسری قیمتی اشیاء ان کے حوالے کر دیں تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مسافروں نے خوفزدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بندوق کی تنی ہوئی نالیوں کا مقابلہ کرتا۔

سجاول کے سب ساتھی چوکنے تھے۔ بس کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیلے ہوئے ایک ایک لمحے کا حساب رکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں ہر طرف تیزی سے دوڑتی پھرتی تھیں۔ وہ مسافروں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مسافروں کے پاس خاموشی سے اپنا مال و متاع ان کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چہروں پر دہشت اور پریشانی لئے وہ اپنی اپنی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے۔

اچانک جھکی ہوئی کمر والا ایک ضعیف شخص اپنی سیٹ پر سے اٹھا۔ سجاول اور اس کے ساتھیوں نے رائفلیں تان لیں۔

"خبردار بابا۔" اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے چنگھاڑ کر کہا۔

لیکن بوڑھا رکا نہیں نہ ہی خوفزدہ ہوا۔ وہ چندی آنکھوں سے چمکتی ہوئی نالیوں سے آنکھیں ملاتا۔ اکڑے اکڑے قدم رکھتا سجاول کے قریب آ کھڑا ہوا۔ بس کے مسافر سانس روک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے بڑی شفقت سے

مخاطب کیا۔

''پتر۔ اگر تو کسی مسلمان کا بچہ ہے تو تیرے باپ نے تجھے اتنا نہیں بتایا کہ کسی کو لوٹ کر پیٹ بھرنا دوزخ کے انگاروں سے اپنا پیٹ بھرنا ہے۔''

سجاول سکتے کی سی کیفیت میں اس کی جانب تکتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ، اس کی آواز، اس کا لہجہ' اس کا انداز' چہار جانب سے اس پر یلغار کرنے لگے۔ یہ شناخت یہ پہچان طوق کی طرح اس کے گلے آ پڑی۔ وہ کانپ اٹھا۔ اس کے سارے وجود کو جہنم کے شعلے چاٹنے لگے۔ ذرہ ذرہ اس پر تھوکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے چہرے سے سیاہ نقاب نوچ کر پھینک دے اور بابا کے قدموں میں جھک کر کہے۔

''بابا! تو تو مجھے بیچ منجدھار کے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب بتا میں تیرا سکھایا ہوا سبق کس طرح یاد رکھوں۔''

وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں ڈوب گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ ابھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گا۔ اس کے لئے ان بوڑھی نگاہوں کا سامنا کرنا قیامت ہو گیا تھا۔ جن میں کوئی پہچان نہیں تھی لیکن وہ اس کا نام لے لے کر پکار رہی تھیں۔ اس کے لئے وہاں ایک لمحہ رکنا بھی بار ہو گیا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ کسی کو لوٹے بغیر چپ چاپ بس سے اتر جائیں۔ وہ اس کے حکم کے پابند تھے۔ لیکن ہاتھ آیا ہوا مال چھوڑتے ہوئے وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں بگڑ رہے تھے۔ پس و پیش کر رہے تھے۔ وہ بار بار گھورتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید وہ اپنا فیصلہ بدل دے گا۔

لیکن سجاول کی تو جیسے جان پہ بنی تھی۔ یہ لمحہ اس کے لئے زندگی اور موت کا لمحہ تھا۔ اس نے بندوق کی نالی اپنے ہی ساتھیوں کی طرف سیدھی کر دی تو وہ غصے سے سر جھٹکتے، ماتھے پر تیوریاں ڈالے بغاوت سے تنتے ہوئے ایک ایک کر کے بس سے نیچے اتر گئے۔

مسافر دم بخود رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا سب کچھ لٹتے لٹتے بچ گیا ہے۔ وہ پتھر سے ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت، خوشی اور سوال تھے لیکن موقع کی نزاکت نے زبانوں پر مہر ثبت کر دی تھی۔ وہ احساس تشکر سے تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بابا نے سجاول کے بازو پر محبت سے تھپکی دی۔

''شاباش۔ شاباش۔ جواناں۔ تو کسی شریف کی اولاد ہے۔ تو نے مجھ بڈھے کی بات رکھی ہے۔ اللہ پاک تجھے اس کا اجر دے۔ دیکھ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تیرے ہاتھ سے کچھ نہیں گیا۔ جہنم کی آگ سے پیٹ نہ بھر۔ اپنے رب سے معافی مانگ لے۔ توبہ نے تو چوروں کو بھی قطب بنا دیا ہے۔''

سجاول کے دل کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ احساسِ جرم نے اس پر جان کنی کی سی کیفیت طاری کر دی۔ وہ ایک تنکے کی طرح تیز ہوا کی زد میں تھا۔

وہ تو بابا کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ ملا بھی تھا تو کہاں؟ زندگی کے کس موڑ پر۔ جہاں وہ اسے کسی رشتے سے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ نہ اس سے کچھ پوچھ سکتا تھا۔ نہ اسے اپنا حال سنا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کے گلے میں پھندا سا لگ رہا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں متذبذب سا کھڑا بابا کی طرف بڑی حسرت سے دیکھتا رہا پھر جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور الٹے قدموں بس سے باہر نکل گیا۔

ڈیرے کی طرف لوٹتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بابا کی آواز بھی لپکتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے چاروں جانب پھیل رہی تھی۔ اس کے رگ و پے میں اتر رہی تھی۔ بابا کو دیکھ کر اس کے لہو کا رنگ چمک اٹھا تھا۔ کبھی وہ ندامت کے پسینے میں نہا جاتا کبھی حالات کی سنگینی اسے بے کل کر دیتی۔ انتقام کی خاردار وادیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ جن بدنامیوں کو اپنی جھولی میں ڈالتا آیا تھا وہ اسے کچوکے دینے لگتیں۔

بابا اسی بس میں بیٹھا اس کی دنیا سے' اس کی پہنچ سے' اس کی دسترس سے بہت دور نہ جانے کس طرف نکل گیا تھا اور وہ فراق و جدائی کے چٹیل صحرا میں بھٹکنے کو تنہا رہ گیا تھا۔ بابا نے لمحوں کو اسے اپنا دکھی چہرہ دکھایا تھا لیکن اس کی آواز اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والی، روح کو جھنجھوڑ دینے والی، اعصاب شکن آواز۔

وہ کہاں جائے؟ کیا کرے؟ اپنے دکھ کس سے کہے؟ کس کو دل کا حال سنائے؟ کوئی تو اپنا ہو۔ جو اس کے زخموں کو دیکھے۔ ان کی ٹیس کو محسوس کرے۔ ان پر مرہم رکھ دے۔ مگر گرد و پیش میں کوئی نہیں تھا۔ وہ تنہا' اکیلا۔ اجنبی چہروں میں گھر گیا تھا۔ نفرت کی چنگاریوں نے جھلسا دیا تھا۔ ڈیرے کے لوگ مرنے مارنے پر تیار تھے۔ وہ اس کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ اس نے ہاتھ آیا ہوا مال چھوڑ دیا تھا۔ مستانہ اور بابو دوسرے لوگوں کو اور بھڑکا رہے تھے۔ ملال پھوڑی نے سب کچھ سن کر بھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بس پراسرار خاموشی

کی چادر اوڑھے بیٹھا رہا۔

سجاول اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اگر ملاں پسوڑی نے اس کے ساتھ کوئی تعرض کیا تو وہ کسی کی پروا نہیں کرے گا۔ نفع و نقصان کچھ نہیں سوچے تھے۔ اس نے خود کو ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

وہ ایک جان لیوا کشمکش میں مبتلا تھا۔ ماضی کے رشتوں نے حال کی تلخیوں کو ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ مستقبل تاحد نگاہ زہریلے دھوئیں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک شدید طوفان بپا تھا۔ اس کے وجود کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ وہ بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

وہ بڑا جی دار تھا۔ وہ حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ لیکن آج اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ آج وہ جی بھر کے آنسو بہانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے حوصلوں کے ہار جانے کا اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی ایسے کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس کے سامنے وہ اپنا دکھ بھرا دل کھول سکے۔ جسے اپنے زخم دکھا سکے۔ جس کے سامنے رو سکے۔

O.......O.......O

بجلی کی سی سرعت سے معاً ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ تیز قدموں سے وہ نیم تاریک راہداری سے گزرا تو اسے ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے غور سے سنا اب اس آواز کے ساتھ لپٹی ہوئی سسکیاں بھی اس تک پہنچیں۔ وہ کانپ گیا۔ اس نے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ اس کا خون کھول اٹھا اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ شدید اشتعال میں اس نے بغیر سوچے سمجھے دیوانوں کی طرح اپنے شانے کے زور سے بند دروازہ کھولا اور چوکھٹ پر آن کھڑا ہوا۔

''گل! گل! تو کیا کر رہی ہے یہاں؟'' وہ غصے سے سرخ چہرہ لئے دھاڑا۔

کمرے میں موجود بابو نے چونک کر دیکھا۔ گل دوڑتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی اور ہانپتی ہوئی اس کے شانے سے لگ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔

سجاول نے حیرت اور طیش سے اس کے زرد رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں اور اڑی ہوئی رنگت کو دیکھا۔ پھر ایک نگاہ بابو پر ڈالی جس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

کچھ اندازہ نہیں کر سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے غصے کے ساتھ گل کو پیچھے ہٹایا اور دانت پیس کر بولا۔

''گل! تو کیا کر رہی ہے یہاں؟''

وہ اسی طرح اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ گم سم کھڑی رہی۔ بابو نے بڑے رعب سے کہا۔

''اوئے جاجا۔ اپنا راستہ لے۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ تو خوامخواہ ماما نہ بن اس کا۔''

سجاول کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے گھور کر بابو کی طرف دیکھا اور گل کو جھنجھوڑ دیا۔

''بکتی کیوں نہیں کمینی! کہ تیرا اس کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ بتا کیوں آئی ہے تو یہاں؟ کیوں آئی ہے؟''

گل کا پھول سا چہرہ کملا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور چاقو پکڑے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

سجاول کے لئے گوگو کی یہ کیفیت ناقابل برداشت تھی۔ وہ بابو کی طرف جھپٹا جو ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کون لایا ہے اس لڑکی کو یہاں؟ کون لایا ہے؟ بتا۔'' سجاول نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔

''اپنے پیروں سے چل کر آئی ہے یہ نیک پروین۔ اپنی مرضی سے۔'' بابو نے گریبان چھڑاتے ہوئے تمسخر سے لفظ چبائے۔

''اس کے ساتھ تو تیری بھی پرانی یاری لگتی ہے۔ مگر یہ تتلی کسی کے ہاتھ آنے والی نہیں۔'' اس نے پاجی پن سے آنکھ دبائی۔

سجاول سن سا ہو گیا۔ وہ جیسی بھی تھی۔ جو بھی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سننا نہیں چاہتا تھا۔ ہر اچھائی پر سے اس کا ایمان اٹھ گیا تھا۔ وہ نیکی کے چہرے کو مسخ ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے بابو کا گریبان چھوڑ دیا اور ہونٹ چباتا خون جگر پیتا مایوس پلٹ گیا۔ لیکن گل اس کے راستے میں آ گئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اسے دکھا کر بولی

''سجاول! اگر تم مجھے اس کے رحم وکرم پر چھوڑ کر گئے تو میں یہ چاقو اپنے سینے میں اتار لوں گی۔ یا اس کے پیٹ میں گھونپ دوں گی۔ میں خود مر جاؤں گی یا اس کو مار دوں گی۔ یہ جھوٹ بکتا ہے۔ خدا کیلئے اس پر اعتبار نہ کرو۔ مجھے اس سے نجات دلاؤ۔ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بابو نے قہقہہ لگایا۔

''واہ بھئی۔ تو تو بڑی اچھی ایکٹنگ کر لیتی ہے۔ کیسا مظلوم بن رہی ہے۔ اپنے اس یار کے سامنے۔''

سجاول کے لئے یہ صورتحال ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ کبھی وہ روتی ہوئی گل کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی تمسخر سے ہنستے ہوئے بابو کی طرف۔ گل نے زور سے اس کی آستین کھینچی۔

''سجاول! تمہیں اعتبار کیوں نہیں آتا۔ میری بات سنو۔ مجھ پر یقین کرو۔ اس بدمعاش نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ یہ ہمارے محلے کا ہے۔ پتہ نہیں کیوں میرے پیچھے پڑا ہے۔ میرا پیچھا کرتا ہے۔ رقعے پھینکتا ہے۔ مجھے دھمکیاں دیتا ہے۔ اس نے مجھے خود بلایا ہے۔ کہتا ہے اگر میں آپ نہ آئی تو یہ مجھے غنڈوں سے اٹھوا لے گا۔ خدا کی قسم سجاول میں آج اس سے فیصلہ کرنے آئی ہوں۔ آج یہ رہے گا یا میں۔''

سجاول بابو کے کرتوتوں سے بے خبر نہیں تھا۔ گل کی روتی ہوئی آنکھوں کی فریاد اس کے دل پر جا لگی۔ وہ دانت کچکچا کر بابو پر جھپٹا اور اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی۔ بابو سنبھل نہیں سکا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ وہ خود کو آزاد کرانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

گل کی دہشت سے چیخ نکل گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور شدید گھبراہٹ میں اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''گل! تو ہٹ جا۔'' سجاول نے چلا کر کہا۔

''نہیں۔ نہیں۔ اسے چھوڑ دو۔ یہ مر کر تمہارے متھے لگے گا۔ اسے چھوڑ دو۔ بات پولیس تک پہنچی تو کیا ہوگا۔''

سجاول نے کچھ سوچ کر بابو کی گردن چھوڑ دی اور اسے دھکا دے کر غرایا۔

''اگر اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو تیری ہڈیوں کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔''

راستے بھر سجاول نے کوئی بات نہیں کی۔ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور گل سے کچھ فاصلے پر اس طرح چلتا رہا جیسے اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔ اس کے گھر سے کچھ دور وہ رک گیا اور خشک سے لہجے میں بولا۔

''اب اس کی طرف سے فکر نہ کرنا میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اور ہاں سن۔ آئندہ کبھی اس جگہ نہ آنا سمجھی۔'' اپنی بات ختم کر کے اس نے پلٹ جانا چاہا۔

''تم گھر نہیں چلو گے سجاول!'' گل نے ہولے سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ روکھائی سے کہنے لگا۔

''ماسی سے تو مل لو۔ وہ تمہیں یاد کرتی رہتی ہے۔'' گل نے اصرار کیا۔

''پھر کبھی سہی۔'' وہ سر جھٹک کر بے اعتنائی سے بولا۔

''اب ایسی بھی کیا بات ہے؟ تم تھوڑی دیر کیلئے گھر نہیں آ سکتے۔ خوامخواہ ضد کر رہے ہو۔'' وہ ناراضگی سے کہنے لگی۔

سجاول نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ روٹھی روٹھی سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بے حد پریشان نظر آتی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بغیر کچھ کہے اس کے گھر کی سمت چل پڑا۔

ماسی بڑی محبت سے ملی اور گلہ کرنے لگی کہ وہ اتنا عرصہ کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ یونہی عذر تراشنے لگا۔ بہانے بناتا رہا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ماسی اسے بھولی نہیں تھی۔ وہ اپنوں کی طرح گلہ کر رہی تھی۔ حالانکہ اس سے اس کا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ وہ چارپائی پر اس کے برابر بیٹھی ہوئی اس کی پشت پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اتنے دن کیا کرتا رہا۔ اسے کوئی ڈھنگ کا کام ملا ہے یا نہیں۔

اپنی پشت پہ رکھے ہوئے ماسی کے شفقت بھرے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے وہ ناقابل فہم احساس جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ماسی کا ہاتھ اپنی پشت پر سے ہٹا دے اور اسے صاف کہہ دے کہ وہ ان محبتوں اور شفقتوں کا حقدار نہیں۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ محبت کا کوئی رشتہ خود سے منسوب کر سکے۔ کسی شریف گھر کی چھت تلے کچھ لمحے گزار سکے۔

ماسی اس کے لئے چائے بنانے اٹھ گئی۔ وہ وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر گرد و پیش دیکھا۔ سامنے کھڑکی کے قریب گل بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ کھڑکی سے

چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرنوں کے جھرمٹ میں اس کا معصوم حسین چہرہ بہت دلکش معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کمرے میں ناگواری خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے گل پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اسے بار بار اس خیال سے وحشت سی ہو رہی تھی کہ گل اس جگہ گئی کیوں تھی۔ اگر وہ اتفاقاً وہاں نہ پہنچ جاتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔

دونوں میں سے کسی نے بھی بات نہیں کی۔ اپنی اپنی سوچ میں الجھے ہوئے دونوں چپ بیٹھے رہے۔ ماسی چائے لے کر آئی تو انہیں اس طرح لاتعلق بیٹھے دیکھ کر کچھ حیران ہوئی اور چائے کی پیالیاں تپائی پر رکھ کر گل سے مخاطب ہوئی۔

''گل! کیا بات ہے؟ اس طرح چپ چپ کیوں بیٹھی ہو؟''

گل نے چونک کر دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ماسی کے قریب آ کر بولی۔

''ماسی! تو نے مجھ سے کچھ کہا؟''

''ہاں۔ تجھ سے ہی بات کر رہی ہوں۔ تو سنے بھی۔ کیا ہوا ہے تجھے؟ طبیعت تو تیری ٹھیک ہے؟ کتنے دنوں سے تو پریشان سی ہے؟'' ماسی نے فکرمندی سے کہا۔

''نہیں تو ماسی! میں تو بھلی چنگی ہوں۔'' وہ کانوں کے پیچھے بالوں کی ایک شریر لٹ سمیٹتے ہوئے بولی۔

سجاول نے نگاہ اٹھا کر اس کے پھول ایسے شگفتہ چہرے کی طرف دیکھا جو کملایا ہوا سا لگتا تھا۔ وہ ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں میں دبائے ہوئے تھی۔ جس سے اس کے گلابی رخسار پر گڑھا پڑ گیا تھا۔ سجاول کے سارے جذبوں نے جھنجلا کر سوچا۔

''اس دلربا پاکیزہ حسن پر بابو کی آوارہ نگاہ کیوں پڑی تھی۔''

ماسی نے چائے کا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ خاموشی سے چائے پینے لگا۔ ماسی اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہمارا نہ کوئی عزیز ہے نہ رشتہ دار۔ بس مسافروں کی طرح پڑے ہیں۔ پتر تو ہی کبھی پھیرا لگا جایا کر۔''

وہ سعادت مندی سے سر ہلاتا رہا لیکن منہ سے ایک لفظ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ گل بھی بالکل چپ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ ماسی کچھ دیر اپنے طور پر ہی باتیں کرتی رہی پھر باہر کسی ہمسائی نے آواز دی تو وہ اسے دیکھنے کیلئے اٹھی۔

سجاول بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ماسی نے اسے کھانے کیلئے روکنا چاہا۔ لیکن وہ جانے کو تیار ہو گیا۔ نہ جانے کیوں وہ بے طرح الجھ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیوں اس قدر الجھا ہوا ہے۔ وہ نہ کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ نہ کہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بس بے مقصد چلتا ہوا نہ جانے کس طرف نکل جانا چاہتا تھا۔

ماسی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئی تو گل نے قریب آ کر کہا۔

''سجاول! میری بات سن کر جانا۔''

وہ اسی طرح کھڑا رہا اور قدرے لاتعلقی سے بولا۔

''دیکھو۔ آئندہ وہ کچھ بھی بکواس کرے تم وہاں قدم نہ رکھنا۔ اچھا۔ میری بات کو یاد رکھنا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ وہاں کبھی مت جانا۔''

گل بالکل اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ''سجاول مجھے معلوم ہے تم ناراض ہو۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے ناراض ہونے کی۔'' وہ خفا خفا سا بولا۔

وہ ہولے سے بڑی پیاری ہنسی ہنسی۔

''خفا بھی ہو اور کہتے ہو کہ خفا نہیں ہو۔''

سجاول کو اس کے ہنسنے پر نہ جانے کیوں غصہ آ گیا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تم اس لفنگے کے پاس گئی ہی کیوں تھیں۔'' وہ چڑچڑے پن سے بولا۔

''تم اچھی بھلی سمجھدار پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں پتہ نہیں کہ ایسی جگہوں پر لڑکیوں کو نہیں جانا چاہئے اور وہ بھی اکیلے۔ کتنی بے وقوفی کی تم نے۔ مجھے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا ہے کہ آخر تمہیں ضرورت کیا تھی وہاں جانے کی؟ وہ رقعے لکھتا تھا تو لکھتا رہتا۔'' اس نے جھلا کر سر جھٹکا۔

''آئندہ ایسی حرکت کی نہ تم نے تو۔'' وہ کچھ اٹکا اور جیسے اپنی تصحیح کرتا ہوا بولا۔

''میرا مطلب ہے کہ آئندہ ایسی بے وقوفی نہ کرنا۔ سمجھیں؟''

گل برا ماننے یا خفا ہونے کے بجائے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اشتیاق بھرے لہجے میں بولی۔

''یہ باتیں تمہارے منہ سے بہت اچھی لگ رہی ہیں سجاول! میں نے نہ باپ کو دیکھا ہے نہ میرا کوئی بھائی ہے۔ لیکن تمہارے ہونے سے میں یہ محسوس کر سکتی ہوں کہ جن گھروں

میں مرد ہوتے ہیں وہ کتنے محفوظ ہوتے ہیں۔''

سجاول اس کے اپنائیت بھرے لہجے پر بے حد پشیمان ہوا۔ وہ بڑے اعتماد سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ وہ قاتل اور مجرم ہے۔ پولیس اسے تلاش کرتی پھرتی ہے۔ وہ اس کی نگاہوں کے اعتماد کے مقابل کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے پھر چلنے کا ارادہ کیا اور اس کی بات ٹالنے کو بولا۔

''اچھا۔ تو میں چلتا ہوں۔''

''کیا ہو گیا ہے سجاول!؟'' گل نے خفگی سے اس کی جانب دیکھا۔

''میں کتنی بار تم سے کہوں گی کہ تھوڑی دیر کے لئے رک جاؤ۔ لیکن تم...... تم سنتے ہی نہیں ہو۔ آخر ایسی کیا مصیبت ہے تمہیں؟ تھوڑی دیر بیٹھ نہیں سکتے؟ میں چاہتی ہوں کہ بابو کے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں۔''

''تم بھول جاؤ اس بدمعاش کو۔ نام مت لو اس کا۔'' وہ منہ ہی منہ میں گالی دے کر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

''تم جیسی لڑکی کو اس کا نام بھی نہیں لینا چاہئے۔ بس اب اس کا ذکر نہ کرنا۔''

گل اس کے غصے سے محظوظ ہوئی۔ ہولے سے ہنس کر مطمئن لہجے میں بولی۔

''میری بات تو تمہیں سننی پڑے گی۔ سجاول تمہیں کیا پتہ کہ تم نے اس وقت مجھے کتنا سہارا دیا ہے۔ تم نے مجھے ہر فکر سے آزاد کر دیا ہے۔ میں اس کمینے بابو کی وجہ سے اتنی پریشان تھی کہ میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھتی تھی۔ لیکن مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو مجھے پناہ میں لے لے۔ جو مجھے ہر فکر سے آزاد کر دے۔ جو مجھ سے اتنا کہہ دے کہ وہ سب کچھ سنبھال لے گا۔ مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو اس عذاب سے گھبرا کر خودکشی کرنے کو تیار تھی۔ اسی لئے تو میں بے خوف ہو کر بابو کے ڈیرے پر چلی گئی تھی۔ میں یہ سوچ کر گئی تھی کہ یا خود مر جاؤں گی یا اسے مار دوں گی۔''

''پاگل ہو تم تو۔'' سجاول نے سر ہلایا۔

''بھلا تم چاقو سے اس مسٹنڈے کو مار سکتی تھیں۔ وہاں کچھ اور ہو جاتا تو۔''

''نہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اللہ کے بھروسے پر وہاں گئی تھی۔ میں نے ساری رات دعائیں مانگی تھیں۔ اللہ نے میری سن لی۔ اس نے کہیں سے تمہیں وہاں بھیج دیا۔ تمہیں دیکھ کر میرا خوف ختم ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم...... تم

مجھے ہر مصیبت سے نکال سکتے ہو۔'' وہ بڑی سادگی اور سچائی سے چھوٹے چھوٹے سیدھے سادے لفظوں میں خود کو بیان کر رہی تھی۔

سجاول کچھ سمجھا۔ کچھ نہیں سمجھا۔ نہ اس نے سمجھنے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ دل ہی دل میں نادم سا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سٹپٹا گیا تھا۔ پشیمان ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ معصوم سی بھولی بھالی لڑکی اس پر کتنا اعتبار کرتی تھی۔ مگر اس جیسا شخص اس پھول سے چہرے والی لڑکی کے معصوم اعتماد کا حق دار نہیں تھا۔ وہ اپنے وجود کا سایہ بھی اس پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی حفاظت میں سینہ سپر ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہمیشہ کے لئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر۔

وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ جھنجھلاہٹ۔ کچھ پشیمانی سے بولا۔

''تم یہ سب کچھ مجھے کیوں سنا رہی ہو۔ تم مجھ پر اتنا اعتبار نہ کرو۔ تم ایک بہت اچھی شریف لڑکی ہو۔ تمہیں ایک غیر شخص پر اس طرح اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ میں کیسا آدمی ہوں؟ میں کیا کچھ کرتا رہتا ہوں۔ میرا تعلق کن لوگوں سے ہے۔ میں کن میں اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ میں۔ میں......'' وہ اٹکا۔ کچھ موزوں لفظ چننے کیلئے۔ ایسے محتاط لفظ جو اس لڑکی کے لئے نامانوس نہ ہوں۔

گل درمیان میں ہی بول پڑی۔ ''میں تم پر اعتبار کرتی ہوں۔ تو کیا تم مجھے دھوکہ دو گے۔''

سجاول نے اس کی سوالیہ نگاہوں کو اپنے چہرے پہ محسوس کیا۔ ان میں ابھرنے والے سوالات نے اس کے اندر ایک ہلچل سی مچا دی۔ وہ اس سے یہ سوال نہ بھی کرتی اس پر اتنا اعتماد نہ بھی کرتی تو بھی وہ اس کو دھوکہ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ دو ہی قدموں میں اس کے نزدیک آ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سچے لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتا گل! میں تمہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ اس لئے میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ میں مجرم ہوں اور پولیس سے چھپتا پھرتا ہوں۔ تم مجھے نہ جانے کیا سمجھ رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے وہی سمجھو جو میں ہوں۔''

وہ اس کی بات توجہ سے سنتی رہی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

''دیکھو تم مجرم ہو یا برے آدمی۔ مجھے اس سے کیا؟ میرے ساتھ تو تم نے بھلائی ہی کی ہے۔ میرے ساتھ تو تم نے اچھا انسان بننے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس وعدے کو ضرور نبھاؤ گے۔''

''عجیب باتیں کرتی ہو تم بھی۔'' وہ زچ ہو گیا۔

''اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں کس حال میں پھنسا ہوا ہوں۔ حالات نے مجھے کس طرح بے بس کر رکھا ہے۔ میں نے تم سے اچھا انسان بننے کا وعدہ تو کر لیا تھا۔ لیکن اسے نبھانا آسان نہیں۔ اسے نبھا لیتا ہوں تو پھانسی کا پھندہ گلے پڑتا ہے۔ مگر مجھے ابھی مہلت چاہیے۔ ابھی میرے ذمے کچھ کام باقی ہیں۔ میں انہیں پورا کیے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔''

وہ یکلخت خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر کھجاتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ گل خاموشی سے اس کی طرف متوجہ رہی۔ وہ اس کی طرف پلٹا اور بولا۔

''گل! میں تمہیں بتاؤں کہ میں یہ دن رات کس اذیت میں گزارتا ہوں۔ کس طرح روز جیتا اور روز مرتا ہوں۔ میں اپنے آپ سے کس قدر شرمندہ ہوں۔ میں تو خود سے آنکھ بھی نہیں ملا سکتا۔'' اس نے ایک سرد آہ بھری۔

''میرے ماں باپ مجھے کیا بنانا چاہتے تھے اور حالات نے مجھے کیا بنا دیا ہے۔'' اس نے تاسف سے اپنی پیشانی پہ ہاتھ مارا۔

''میں تو اس قابل بھی نہیں کہ اپنے باپ کو باپ کہہ سکوں۔ وہ کہتا ہے توبہ نے چوروں کو قطب بنا دیا ہے۔ مگر میں کس طرح توبہ کروں؟ میں کس طرح توبہ کر سکتا ہوں؟ میں نے توبہ کر لی تو بھاگ بھری کا کیا ہوگا۔ اسے جہنم سے کون نکالے گا۔ مجھے بتاؤ نا گل کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ رات میں نے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔''

وہ اپنی رو میں کہتا گیا۔ گل نے اسے نہیں ٹوکا۔ نہ ہی کوئی سوال پوچھا۔ وہ ایک ہمدرد اور غمگسار کی طرح بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتی رہی اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ وہ جیسے اپنے ہی مقابل اپنے ہی روبرو تھا۔ خود فراموشی کے عالم میں وہ اپنے بارے میں اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار نمی چھلک آتی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹتا ہوا بالکل اس معصوم بچے کی طرح باتیں کر رہا تھا جو باہر سے جھگڑا کر کے آیا ہو اور اپنی صفائی پیش کر رہا ہو۔

0......0......0

''سجاول! اٹھ پتر! دیکھ دن کتنا چڑھ آیا ہے۔'' ماسی کی آواز پر سجاول نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں۔ ماسی اس کے سرہانے کھڑی ہولے ہولے اس کا شانہ تھپتھپا رہی تھی۔

اسے ماں کے نرم گرم لمس کا احساس ہوا۔ اس نے طمانیت بھرے دل کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں اور ہولے ہولے ماضی کے سہانے لمحے میں اتر گیا جہاں ماں کی شفقت تھی۔ اس کی ممتا کی پھوار تھی۔ اس کی محبتوں کی شادابی تھی۔ اس کے وجود کی ٹھنڈک اور سایہ تھا۔

ماسی نے اسے پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے دیکھا تو محبت بھری تشویش سے پوچھنے لگی۔

''سجاول! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

سجاول نے آنکھیں کھولیں۔ ماسی کے چہرے کی ممتا اور اس کے لہجے کے دلار نے اسے جیسے تسلی دے دی۔ وہ چارپائی سے اٹھا اور صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے پانی کے دو چار چھپاکے چہرے پر لگائے۔ کلی کی اور کرتے کے دامن سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''اچھا ماسی! اب میں چلتا ہوں۔''

ماسی جو چولہے کے پاس جا بیٹھی تھی وہیں سے بولی۔

''کیوں پتر! بھوکا ہی چلا جائے گا۔ ناشتہ تو کر لے۔''

''نہیں ماسی! اس وقت دل نہیں چاہتا۔'' وہ ناخن چباتا ہوا بے دلی سے بولا۔

''اس کا مطلب ہے تیری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' وہ بڑے لگاؤ سے کہنے لگی۔ ''چل ادھر آ۔ دودھ کے ساتھ بخار کی گولی کھا لے۔ میں ابھی گل سے کہتی ہوں کہ تمہیں آ کر دوائی دے دے۔''

''نہ...... نہ ماسی اسے تکلیف نہ دینا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں ٹھیک ہوں بالکل۔ لا تو دودھ گرم کر دے۔'' وہ قریب ہی ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

ماسی نے دودھ کا پیالہ اس کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

''گل کہہ رہی تھی کہ تم اس سے مل کر جانا۔''

وہ بے حد پریشان ہوا۔ اس نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا کہ وہ گل کا سامنا کس طرح کرے گا۔ رات اس نے اپنی رو میں اس سے نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ اسے تو یہ بھی ٹھیک طور یاد نہیں تھا کہ اس نے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ نہ جانے وہ اس کی باتوں کو کس رنگ میں لے گی۔ نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ وہ اونچے خیالات رکھنے والی بہت نیک لڑکی

تھی۔ نہ معلوم وہ اس سے بات کرنا بھی پسند کرے گی یا نہیں۔ شاید وہ پہلے جیسی مہربان نہیں رہے گی۔ وہ اس کی بدلی ہوئی نگاہوں کا سامنا کس طرح کرے گا۔ وہ اس کی بے اعتنائی کیونکر برداشت کرے گا۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی چلا جائے تاکہ اس کا سامنا ہی نہ ہو۔ وہ ان مہربان آنکھوں میں اتری ہوئی نفرت و حقارت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی بڑے بڑے گھونٹ بھرے، پیالہ ایک طرف رکھا اور منہ صاف کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا ماسی میں چلتا ہوں۔ گل کو میرا سلام دے دینا۔''

''تم خود ہی اس سے سلام دعا کرلو۔ وہ صبح بھی تمہارا انتظار کرتی رہی مگر تم جاگے ہی نہیں۔ اس لئے وہ مجھ سے کہہ گئی تھی کہ تمہیں بتا دوں کہ اس سے مل کر جانا۔'' ماسی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تاکہ گل کو بلا لائے۔

''نہیں ماسی رہنے دو۔ میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔'' سجاول نے ہلکی سی گھبراہٹ سے کہا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن میں سے ہوتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ گل کے آنے سے پہلے یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ گل اپنے تر و تازہ وجود کے ساتھ اس کے مقابل تھی۔

وہ بے طرح پشیمان ہوا۔ احساس ندامت نے اسے پسینے میں ڈبو دیا۔ وہ دانتوں سے ناخن کترنے لگا۔ اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ اس میں گل کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

''سجاول! جا رہے ہو تم؟ ارے بھئی اتنی جلدی کس بات کی ہے؟'' وہ شگفتگی سے کہنے لگی۔

سجاول کے دل سے جیسے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ گل کی شیریں آواز نے اسے پھول کی طرح کھلا دیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اس نے احساس ممنونیت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی مہربان مسکراہٹ اس پر چھا گئی۔ وہ باوجود کوشش کے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ صرف چند بے معنی سے لفظ اٹکتے ہوئے اس کی زبان سے نکلے۔

''گل!...... گل! کہیں تم مجھ سے خفا تو نہیں۔''

''لو بھلا میں تم سے کیوں خفا ہونے لگی۔'' وہ خوش دلی سے ہنسی۔

''کہیں...... کہیں تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں۔'' اس نے جیسے سانس روک کر پوچھا۔

''کیوں بھئی؟ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ آخر تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ جو میں تم سے نفرت کروں گی۔ تم سے خفا ہو جاؤں گی۔'' اس نے بڑی نرمی سے سوال کیا اور ملائم سی نگاہ اس پر ڈالی۔

''میں برا آدمی جو ہوں۔ بہت برا۔'' وہ پریشانی سے کہنے لگا۔

''تم خود برے نہیں ہو سجاول! تم برے حالات میں گھر گئے ہو۔ تمہیں برا بننا پڑ گیا ہے لیکن یہ بات تو اچھی ہے نا کہ تم اچھا انسان بننا چاہتے ہو۔ تمہیں برائیوں کا پتہ ہے۔ تمہارا ضمیر زندہ ہے اور تمہیں برے بھلے کی تمیز کراتا رہتا ہے۔''

سجاول اس کی ان باتوں کا مطلب کھوجتے ہوئے کھو سا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر ایک انجانی سی خوشی پھوٹی ہے جس نے اسے شرابور کر دیا ہے۔ وہ جیسے خود سے بولا۔

''اب مجھے جانا چاہئے۔'' پھر بے خیالی میں گل سے پوچھنے لگا۔

''میں چلا جاؤں؟''

''تمہیں جانے کی بہت جلدی ہے تو چلے جانا۔ ناشتہ تو کر لیا ہے نا تم نے؟''

''ہاں بس کر ہی لیا ہے۔'' وہ عجلت سے بولا۔

''کہاں کیا ہے اس نے ناشتہ۔ بہت کہا ہے اس کو تو بس ایک پیالہ دودھ پیا ہے۔'' ماسی دور ہی سے بولی۔

''کیوں سجاول! یہ کیا بات ہے؟ تم نے روٹی کیوں نہیں کھائی؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''بس بھوک نہیں ہے۔ دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''کیا ہو گیا ہے جو تمہیں بھوک نہیں ہے۔ خوامخواہ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ چلو چل کر آرام سے ناشتہ کرو۔ بھوکے پیٹ گھر سے نہیں نکلتے۔'' اس نے زور دے کر کہا اور چولہے کی طرف چلی گئی۔

سجاول انکار نہ کر سکا اور گرد و پیش کو ایک نئے اور خوبصورت انداز میں دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

وہ ڈیرے پر پہنچا تو وہاں سفر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ملاں پسوڑی اپنے مرشد کے آستانے پر حاضری دینے جا رہا ہے۔ ڈیرے کے سبھی لوگ اس کے ساتھ جائیں گے۔ وہ ہر سال عرس میں شریک ہوتا تھا۔ یہ سب تیاریاں اور اہتمام اسی سلسلے میں تھا۔

بابو مستانہ اور دوسرے لوگ اس سے خار کھانے لگے تھے۔ وہ پہلے ہی اس سے حسد کرتے تھے کہ ملاں اس پر اتنا اعتبار کیوں کرنے لگا ہے۔ اس پر یہ نیا شاخسانہ تھا کہ اس نے ہاتھ آیا مال چھوڑ دیا تھا۔ ڈیرے کے لوگ ابھی تک بگڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے گھور گھور کر دیکھتے اور بڑبڑاتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملاں اس سے باز پرس کرے۔ اپنا روایتی جلال دکھائے اور اسے آڑے ہاتھوں لے لیکن وہ نہ جانے کیا سوچ کر اس تمام واقعہ کو نظر انداز کر گیا تھا۔ اس کے رویے سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے اس تمام معاملے کی خبر ہی نہیں۔

سجاول کا دل ہر شے سے اچاٹ تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے یہ ڈیرہ۔ اس میں رہنے بسنے والے چہرے بڑے مکروہ معلوم ہو رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ غلطی سے کسی ایسی متعفن جگہ پر چلا آیا ہے جہاں سانس لینا بھی محال ہے۔

گل کا پھول سا شگفتہ چہرہ اس کے تصور میں جھانکتا تھا۔ اس کی شیریں آواز سماعت میں رس گھول رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کے شگوفے اس کے من میں پھوٹ رہے تھے۔ وہ کسی پھولوں سے لدی' خوشبو سے بھری، چاندنی سے چھلکتی ہوئی فضا میں تنہا بیٹھ کر بڑی عقیدت سے اس کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ گل نے اسے نگاہوں سے نہیں گرایا۔ اس کی خوشبو، اس کا وجود، اس کی مہک اب بھی اس کی زندگی میں باقی ہے۔

سب لوگ چلنے کیلئے تیار تھے۔ اسے بھی مجبوراً تیاری کرنی پڑی تھی۔ وہ کپڑے بدل کر کرتے میں بٹن لگا رہا تھا کہ شہزادی ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ سجاول نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور تیوری چڑھائے اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ اپنی شریر آنکھیں شوخی سے گھماتی ہوئی قریب آئی اور کرتے میں بٹن لگانے میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"دفع ہو۔" سجاول نے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

وہ اس کے چڑ جانے پر بے حد محظوظ ہوئی۔ اس کی نٹ کھٹ ہنسی سارے کمرے میں کلیلیں کرنے لگی۔ سجاول نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے مردانہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے گلے میں رنگین ریشمی رومال تھا۔ الجھے ہوئے گھنے بالوں پر اس نے ترچھی

ٹوپی لگا رکھی تھی۔ اس کے کان پر سگریٹ اٹکا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں میں شوخی بھر کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جا۔ اپنا کام کر۔" سجاول نے خشکی سے ڈانٹا۔

وہ ٹلی نہیں اور اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولی۔

"واہ۔ آج تو بڑی ٹَش نکالی ہے۔"

سجاول بے طرح جھنجھلایا۔ ایک بار زور سے اس کا بازو پکڑ کر اس نے غصے سے اسے جھٹکا دیا تو وہ پھولوں سے بھری ڈال کر طرح لچکتی ہوئی اس کے اوپر ہی آ رہی۔ سجاول نے چڑ کر اسے پرے دھکیلا تو اس کے گلابی ہونٹوں سے سریلی ہنسی کا ایک فوارہ سا ابل پڑا۔ سجاول جھلایا۔

"شہزادی! کسی وقت تو انسان بنا کر۔"

اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں ہنستی ہوئی گنگنائی۔

"سنا ہے کل تو نے بابو کی اچھی جھاڑ پونچھ کی ہے۔" اس نے شوخی سے آنکھ دبائی۔

"کیوں استاد۔ کیا معاملہ تھا؟"

"تو اپنے کام سے کام رکھا کر۔ اچھا۔ سمجھی؟" سجاول نے آنکھیں نکالیں۔

وہ یوں شرارت سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے اس کے غصے سے خوفزدہ ہو گئی ہو۔ پھر ایک دم آگے بڑھی اور رازداری سے کہنے لگی۔

"سنا ہے استاد کسی لڑکی وڑکی کا معاملہ تھا۔ کیا کہنے! گنوں کے تو تم بھی پورے ہو۔"

سجاول کو ضبط کرنا محال ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور اس کی مزاحمت کے باوجود اسے دروازے سے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

۞......۞......۞

وہ پیر صاحب کے مخصوص علاقے میں پہنچے تو دن ڈھل رہا تھا۔ انسانوں ایک سیلاب سا اسی سمت رواں تھا۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ فضا میں خوشی جوش اور گرمی تھی۔ وقفے وقفے سے بسیں آتیں اور عقیدت مندوں کو ان کی منزل پر کر واپس روانہ ہو جاتیں۔ بیل گاڑیوں، تانگوں، ریڑھیوں، ٹریکٹر ٹرالیوں اور سواریوں میں لوگ گاتے، دھمال ڈالتے، خوشیاں مناتے چلے آتے تھے۔ راہ میں چلنے والوں کی ٹولیاں سبز اور سنہری چادریں اٹھائے، عقیدت کے نغمے گاتیں کشاں کشاں بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ سب بھی جس بس سے یہاں پہنچے تھے وہ بھی صاحب کے عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھی۔

یہاں کی گہما گہمی اور رونق پر میلے کا سا گمان ہوتا تھا۔ ہر طرف شور، ہنگامہ اور پہل تھی۔ بازار سجے ہوئے تھے۔ جھولے لگے ہوئے تھے۔ کہیں نٹ' کہیں بازی گر اپنا جما رہے تھے۔ کہیں سرکس والے اپنا پنڈال لگا رہے تھے۔ قوالوں کی ٹولیاں دور دور سے تھیں۔ اس کھلی اور بے آباد جگہ پر ایک چھوٹا سا شہر بن گیا تھا۔

سجاول کو پتہ چلا کہ ان دنوں ملاں کے پیر و مرشد کے بزرگوں کا عرس ہوتا ہے جاری کیا جاتا ہے۔ سماع کی محفلیں ہوتی ہیں۔ دھمال ڈالی جاتی ہے۔ لوگ دور دور سے اور اپنے من کی مرادیں پاتے ہیں۔ کئی روز تک میلہ بھی لگتا ہے۔ لوگ برکت کے لئے فروخت بھی اسی منڈی سے کرتے ہیں۔

سجاول یہاں کی رونقوں میں گم سا ہو گیا۔ اسے اپنے گاؤں کا وہ میلہ یاد آ گیا میں وہ اپنے باپ کی انگلی پکڑے گھومتا پھرتا تھا۔ جہاں کی رونق اور چہل پہل میں گم ہو لگتا تھا جیسے وہ میلہ اس کے دل میں اتر آیا ہو۔ وہ کئی روز تک اس کی گہما گہمی کو محسوس کرتا رہا تھا اور اپنے ہم جولیوں سے اس کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتا رہا تھا۔

ملاں پسوڑی نے خانقاہ سے کچھ دور پیروں سے جوتیاں اتار دیں۔ سر پہ لپیٹا ہوا صافہ گلے میں ڈال لیا اور عقیدت و محبت میں ڈوبا ہوا خانقاہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ وہ سب بھی اس کے پیچھے اس کے قدموں پر قدم دھرنے لگے کہ کہیں کوئی غلط قدم نہ پڑ جائے۔ کہیں کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔ سجاول نے ملاں کو کبھی اس عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے رحم اور سخت مزاج تھا۔ یہاں آ کر اس کا پتھر ایسا سخت اور سنگین چہرہ بھی ملائم ہو گیا تھا۔ نہ جانے اس کے دل کا حال کیا تھا۔ اس کی روح کا کیا عالم تھا۔ بظاہر تو وہ عقیدتوں میں شرابور نظر آتا تھا۔

سجاول کے اپنے دل کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ اس کی آنکھیں عقیدت کے آنسوؤں سے نم ہو گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ خانقاہ میں یہاں وہاں بیٹھے ہوئے مست حال فقیروں میں شامل ہو کر اس پاپ بھری دنیا سے ہمیشہ کیلئے ناطے توڑ لے۔ خدا کے اس پیارے بندے کی چوکھٹ پر سر جھکا کر اپنے لئے آسودگی اور سکون کی بھیک مانگ لے۔ ملاں پسوڑی پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری دینے کو بیقرار تھا لیکن مریدوں نے بتایا کہ پیر صاحب اس وقت وظیفے میں مشغول ہیں۔ حجرے میں موکل آ جا رہے ہیں اس لئے کسی کو حجرے کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں۔ پیر و مرشد وظیفے سے فارغ ہو کر جس کو طلب فرمائیں گے وہی ان کی خدمت میں شرف بازیابی حاصل کرے گا۔

سجاول کے دل پر ایک ناقابل بیان ہیبت سی چھا گئی۔ موکلوں کے تصور سے ہی وہ سہم گیا۔ اسے اپنی زندگی کے تاریک گوشے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ اس نے سہم کر سوچا کہ گناہوں سے بھری یہ دنیا ان ہی خدا کے پیارے بندوں کے دم سے قائم ہے۔

ملاں ایک جانب عقیدت سے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹ ہلنے لگتے جیسے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا ہو۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ مرشد کے تصور میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ گرد و پیش کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس نے نہ کھانا کھایا تھا نہ پانی پیا تھا۔ نہ ہی سگریٹ نوشی کی تھی۔ بس سر جھکائے یوں بیٹھا تھا جیسے مراقبے میں ہو۔

اس کے قریب ہی شہزادی اپنی شوخ اور خوبصورت کشادہ آنکھیں حیرت سے کھولے بیٹھی تھی۔ سجاول نے شاید آج پہلی بار اسے لڑکیوں ایسے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ بار بار چادر اس کے سر سے بار بار ڈھلک جاتی تھی جسے اس کے مردانہ انداز میں کئے

ہوئے سیاہ گھنگریالے بال اس کی پیشانی پر جھکے جاتے تھے جنہیں وہ سمیٹ کر پھولدار
چادر میں چھپا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نامعلوم سا ہراس تھا۔ وہ بار بار ہونٹوں
ہونٹوں میں کچھ پڑھنے لگتی تھی۔

شاہو' مستانہ' بابو اور ڈیرے کے دوسرے لوگ بھی مؤدب بیٹھے تھے۔ لوبان اور اگر
کی بو ماحول کو بے حد پراسرار اور بوجھل بنا رہی تھی۔ سجاول کے اندر ایک ہلچل سی مچی تھی۔
کے تقدس نے اسے اسیر کر لیا تھا۔ اس کی ہر سانس میں چبھن اتر آئی تھی۔ وہ خود کو ایک ذرے
کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ان اللہ والے لوگوں سے روشنی کی بھیک مانگنا چاہتا تھا۔
روشنی جو اس کی تاریک راہوں کو منور کر دے۔ جو اس کے دل سے ہو کر گزرے۔ جو اس
روح کو تاریکیوں سے نکال لے۔

وہ جلد سے جلد اس پہنچی ہوئی ہستی کی زیارت کر لینا چاہتا تھا جو اس کی دنیا بدل
تھی' جو اس کے دکھوں کا مداوا کر سکتی تھی۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ پیر و مرشد کی بارگاہ میں
کر وہ کچھ اور ہو جائے گا۔ اس کی تقدیر بدل جائے گی۔ وہ یہاں کی خاک میں مل کر آسودہ
جائے گا۔

کہیں رات گئے پیر و مرشد وظیفے سے فارغ ہوئے تو ملاں پسوڑی کو باریابی
اجازت ملی۔ سجاول اسی تاک میں تھا۔ وہ چپکے سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ ملاں کی عقیدت
اتھاہ نہیں تھی۔ اس نے پگڑی اتار کر گلے میں ڈال لی تھی۔ ننگے پاؤں ہاتھ باندھے اپنی
پر ناز کرتا نم آنکھوں کے ساتھ وہ حجرے کی طرف روانہ ہوا تو سجاول بھی اس کے ساتھ
تھا۔

وہ عود و عنبر سے مہکتے ہوئے حجرے میں پہنچے تو ملاں نے جھک کر اس کی چوکھٹ
بوسہ دیا۔ سجاول نے بھی اس کی تقلید کی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جھکا نہیں۔ بلندی
جانب اٹھ رہا ہے۔ اوپر بہت اوپر۔ بے حد ہلکا پھلکا۔ ہر غم اور فکر سے آزاد۔

''آ جاؤ بچہ۔ آ جاؤ۔'' پیر و مرشد نے بھاری آواز میں انہیں اندر آنے کی اجازت دی
تو چھوٹے سے حجرے کے سبز در و دیوار ان کی گھمبیر آواز سے گونجنے لگے۔ ملاں نے
بڑھ کر قدم بوسی کی لیکن سجاول خود کو اس جرأت پر آمادہ نہیں کر سکا۔ وہ ملاں کی اوٹ میں
داخل ہو گیا۔ اس کا دل پاکیزگی سے بھر گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں
کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ پیر و مرشد کے رعب و جلال سے دمکتے ہوئے نورانی چہرے

نگاہ بھی نہیں ڈال سکا۔ بس چپ چاپ عقیدت سے سر جھکا کر ان کی مقدس آواز سنتا رہا۔ ان
کے ہونٹوں سے چھونے والے لفظوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں
سکون و اطمینان کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

پیر و مرشد کی گفتگو سے ایک عجیب جلال ٹپکتا تھا۔ ان کی بھاری گونجیلی آواز ہیبت
طاری کرتی تھی۔ ان کی گفتگو سمجھنا آسان نہیں تھا لیکن ان کی آواز کا زیر و بم عربی لب و لہجہ اور
ناقابل فہم الفاظ سجاول پر وجد سا طاری کر رہے تھے۔ پیر صاحب کی باتیں تو شاید ملاں کی سمجھ
میں بھی نہیں آ رہی تھیں لیکن ان کی عقیدتوں کی تسکین اسی طرح ہو رہی تھی کہ پیر و مرشد ان سے
مخاطب تھے۔ اور وہ ان کے روبرو ان کے اس مقدس حجرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں مؤکل
آتے جاتے تھے۔

۞......۞......۞

وہ رات اسی سرشاری میں بسر ہوئی۔ سجاول ایسی آسودہ اور پرسکون نیند عرصے سے نہیں
سویا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں۔ وہ تمام دکھوں سے آزاد ہو کر
زندگی کے نئے اور سنہری دور میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ رات بڑے اطمینان سے سوتا رہا۔ اس
کی آنکھ کھلی تو ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ اسکے کانوں میں سماع کی صدا گونج رہی تھی۔ ملنگ اور
سائیں اللہ ہو اور حق یا علیؓ کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔

وہ کچھ دیر اسی طرح اپنی جگہ پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اذان کی سرمدی صدا گونجی تو
اس کے ہونٹوں پر آپ سے آپ کلمہ طیبہ جاری ہو گیا۔ وہ قریب ہی سوئے ہوئے ملاں پسوڑی
اور دوسرے لوگوں کو سوتا چھوڑ کر نماز پڑھنے کے خیال سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی تلخیوں سے بھری ہوئی زندگی میں یہ چونکا دینے والی تبدیلی تھی۔ وہ آسودہ تھا
اور نماز کی طرف اس کا دل خود بخود جھک رہا تھا۔ باہر احاطے میں سماع کی محفل ختم ہو گئی تھی۔
کچھ لوگ وضو کر رہے تھے۔ کچھ ٹولیوں میں بٹے۔ یہاں وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔
سائیں اور ملنگ دیواروں کے ساتھ بے خبر اور مست پڑے تھے۔ کچھ نیند اور نشے میں بڑبڑا
رہے تھے۔ کچھ بلند آواز میں خراٹے لے رہے تھے۔ سجاول ان سب سے بچتا بچاتا مسجد میں
داخل ہو گیا۔ اس کے وضو کرنے تک جماعت کھڑی ہو چکی تھی وہ بھی اس میں شامل ہو گیا۔

نماز کے بعد وہ ایک جانب بیٹھا مولوی صاحب کا وعظ سنتا رہا لیکن اسے کوئی خاص
لطف نہیں آیا نہ اس کا دل مطمئن ہوا۔ مولوی صاحب کی زبان میں وہ شیرینی اور تاثیر نہیں تھی

جو پیر و مرشد کے لفظوں میں چھلکتی تھی۔ رات کی کیفیت کا لطف، پیر صاحب کے لفظوں کی چاشنی، ان کی گفتگو کی لذت اور حلاوت ابھی تک اس کے روئیں روئیں میں گھلی ہوئی تھی۔ وہ اسی کیفیت میں سرشار مسجد سے باہر آیا اور خانقاہ کی سمت چل پڑا۔

وہ ابھی احاطے میں داخل ہی ہوا تھا کہ شہزادی سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ وہاں آئی ہوئی دوسری لڑکیوں میں گھری چہک رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر تازگی تھی۔ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی، اٹھکیلیاں کرتی بہت خوش معلوم ہوتی تھی۔ اس پر نگاہ پڑی تو وہ دوسری لڑکیوں سے علیحدہ ہو کر اس کے قریب آگئی اور مسکرا کر بولی۔

”بڑی نمازیں شازیں پڑھ رہے ہو یہاں آ کر۔ خیر تو ہے؟“

”تو اپنے کام سے کام رکھ بھی۔“ سجاول نے اکڑ پنے سے کہا اور آگے بڑھ آیا۔

اس نے دیکھا کہ شہزادی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کھڑی ہنس ہنس کر ان سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ اسے نظرانداز کر کے خانقاہ کی رونقیں دیکھنے لگا۔ آج عرس کی تقریبات شروع ہونے والی تھیں۔ مزار پر چادر چڑھائی جانی تھی۔ مزار کو غسل دیا جانے والا تھا۔ عقیدت مند مزار پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ اس کے ستونوں سے لپٹے ہوئے، راہداری میں بیٹھے ہوئے، دیواروں سے لگے ہوئے، صحن میں، دالان میں۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہ اپنے اپنے انداز میں عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔

سجاول نے لنگر سے کھانا لیکر ناشتہ کیا اور ابھی ہاتھ صاف کر ہی رہا تھا کہ دھوم مچ گئی کہ پیر و مرشد تشریف لے آئے ہیں۔ ہجوم میں ہلچل شوریدہ سر لہروں کی طرح بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ عوام کی بیقراریوں میں شدت پیدا ہوگئی۔ لوگ دھکم پیل سے ایک دوسرے کو گراتے اور پچھاڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ پیر و مرشد کی ایک جھلک کے پیاسے تھے۔ وہ انکا دیدار حاصل کرنے کو تڑپ رہے تھے۔ وہ ان کی ایک نگاہ کرم کے منتظر تھے۔

پیر و مرشد کو ان کے مرید گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ وہ جذب و عقیدت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے جذبات کی شدت سے پیر صاحب کو محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ سجاول کے دل کی کیفیت میں بھی جیسے ایک انقلاب سا بپا ہو گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پیر و مرشد ہی اس کی جائے پناہ اور ڈھارس ہیں۔ اس کا سب کچھ ان کے پاس ہے۔ وہ اس کی چھاؤں۔ اس کا قرار ہیں۔ اسے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ غیرارادی طور پر لوگوں کی گھنی بھیڑ کو چیرتا بے اختیار آگے بڑھا اور پیر و مرشد کی سبز چادر کا کونہ آنکھوں سے لگا رو دیا۔

مجمعے پر ایک سکوت سا چھا گیا۔ پیر و مرشد کے مرید تیزی سے آگے بڑھے اور اسے بے دردی سے کھینچ کر علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن پیر و مرشد نے منع کر دیا اور اپنا بھاری ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ ان کی گونجیلی آواز کے بلند ہوتے ہی چاروں جانب جیسے سناٹا چھا گیا۔ لوگ دم بخود ہو کر سننے لگے۔ پیر و مرشد فرما رہے تھے۔

”جا بچہ! دل کو صاف رکھ۔ اللہ مشکلیں آسان کرے گا۔“

لوگ رشک و حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا کہ اس پر پیر و مرشد کی نگاہ کرم ہوگئی تھی۔ پیر و مرشد تو آگے بڑھ گئے۔ ان کی سبز چادر کا کونہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اور لوگ سجاول پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ کوئی اس کے پاؤں چھو رہا تھا۔ کوئی اس سے دعا کرنے کیلئے کہہ رہا تھا اور کوئی اس سے اپنے بچے کے سر پر ہاتھ پھروانا چاہتا تھا۔

سجاول جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی اس سے کیا کہہ رہا ہے؟ کوئی اس سے کیا چاہتا ہے؟ اس کی جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔

ملاں پسوڑی نے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اسے اندر مسافر خانے میں لے جانا چاہا لیکن وہ رضامند نہیں ہوا اور قبر کے چبوترے سے ٹیک لگائے وہیں بے خود سا بیٹھا رہا۔ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس زمانے سے بہت دور جیسے کسی اور دنیا میں سانس لے رہا تھا۔

نہ جانے وہ کب تک اسی عالم بے خودی میں ڈوبا رہا کہ اچانک کسی کے بیقراری سے رونے اور بار بار اسے مخاطب کرنے کی آواز سے وہ چونک گیا۔ بے خودی کی سی کیفیت آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی اور اسے دنیا کی آوازیں اپنے چاروں طرف سنائی دینے لگیں۔

اس نے بے خیالی میں آنکھیں کھولیں اور روتی ہوئی آواز کی سمت دیکھا۔ ملگجی چادر اوڑھے کوئی عورت زار و قطار روتی ہوئی مضطرب التجائیں کر رہی تھی۔

”سائیں جی! اللہ کے واسطے میرے کاکے کو بچا لو۔ سائیں جی۔ تم اللہ والے ہو۔ میرے بچے کیلئے دعا کرو۔ تمہیں اللہ، رسول کا واسطہ، پنجتن پاک کا واسطہ۔“ اس کی آواز میں اتنا درد اور اس کے لہجے میں اتنی تڑپ تھی کہ سجاول کا اپنا دل پسیج گیا۔ اس نے ایک نگاہ رونے والی کی سمت دیکھا اور اس کی نگاہ وہیں رہ گئی۔ اس کا سارا وجود جیسے طوفان کی زد میں آ گیا۔

اس کی چادر سر سے ڈھلک سی گئی تھی۔ اس کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی بادامی آنکھیں جل تھل تھیں۔ وہ یکلخت حقیقت کی اس دنیا میں لوٹ آیا جسے پیرو مرشد کی نگاہ کرم نے بھلا دیا تھا۔

وہ ان شربتی آنکھوں کو ہزاروں آنکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ ان بادامی آنکھوں کو صدیوں بعد بھی شناخت کر سکتا تھا۔ ان آنسو بھری آنکھوں میں تو وہ کبھی خود کو دیکھا کرتا تھا۔ اس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ اس کی بے قراریوں نے اسے بے ساختہ پکار لیا۔

''رانی!۔ رانی!''

وہ بے طرح چونکی اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ ان آنسوؤں کی طرح گنگ ہو گئی جو اس کے ملیح رخساروں پہ ٹکے اس کے دل کے لٹنے کی داستان بیان کر رہے تھے۔ اسکے ہونٹ لرزے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

سجاول نے مضطرب ہو کر کہا۔

''تو نے مجھے پہچانا۔ ہیں رانی؟''

رانی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی نکلی اور آنسو اس کے رخساروں پر تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے اپنی اوڑھنی لبوں میں دبا لی۔ اس کی روتی ہوئی آنکھیں وہ کچھ کہنے لگیں جسے بیان کرنے کو اس کے کانپتے لب ترس رہے تھے۔

سجاول کو وہ لمحے زخم زخم کر گئے۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رانی اسے تڑپانے لگی۔ اس کے لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی؟ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ سب کچھ اس کی رندھی ہوئی چپ ہی کہہ رہی تھی۔

سجاول نے خود ہی اس خاموشی کو توڑ دیا۔ جو جیسے زندگی اور موت کا سوال بن گئی تھی۔

''رانی! بولتی کیوں نہیں۔ کچھ کہہ تو سہی۔ چپ کیوں بیٹھی ہے؟ کچھ تو کہہ۔'' رانی کے خوبصورت چہرے پر بے بسی کی ایسی دھند سی چھا گئی جیسے بولنے پر قادر نہ ہو۔ اس کے دلربا چہرے پر برسنے والی اذیت جیسے گویائی کو ترسنے لگی۔ سجاول کا جی چاہا ایک بار اس کا ہاتھ تھام لے۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی حرف، کوئی لفظ سن لے۔ جو فراق کے ان محروم لمحوں کی اذیت کی تلافی کر سکیں۔ وہ ہر لمحہ اس کی زندگی کو محرومیوں اور ناکامیوں سے بھرتے رہے تھے۔ لیکن رانی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ بس بیٹھی یوں ہاتھ ملتی رہی جیسے کوئی بے حد عزیز شے کھو گئی ہو۔

''رانی۔ نی رانیئے۔ جلدی آ۔ دیکھ کاکے کو کیا ہو گیا ہے۔''

اچانک کسی عورت نے عقب سے پکارا اور اس کی آواز چاروں طرف پھیل گئی۔ سارا طلسم بکھر گیا۔ ساری کیفیتیں ٹوٹ گئیں۔ سکتے میں بیٹھی ہوئی رانی لرز گئی۔ وہ چونک کر یکدم اٹھی اور بے تابی سے پکاری۔

''ہائے میں مر گئی۔ کیا ہوا میرے کاکے کو؟''

اس نے دوڑ کر بچے کو گود میں لے لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگی۔ وہ عورت نہ جانے اسے کیا بتانے لگی اور رانی پریشان سی، بیقرار سی، بے کل سی ہو کر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی پل بھر میں خواب کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

۞......۞......۞

رانی اپنے ساتھ سکون کی وہ دولت بھی لے گئی جو اسے پیرو مرشد کی ایک نگاہِ کرم نے بخش دی تھی۔ اس کے کھو جانے سے یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ کھو گیا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں محبت کا کوئی رشتہ باقی نہیں بچا۔ چاہتوں کے سب در بند ہو گئے ہیں۔ تپتی ہوئی زندگی میں نہ کہیں سایہ تھا نہ خنک ہوا۔ نہ کسی ایسے مقام کی آس جہاں پل دو پل ٹھہرا جا سکے۔

کہیں سکون نہیں تھا۔ کہیں قرار نہیں تھا۔ درد دل کی دوا کسی کے پاس نہیں تھی۔ زخم دل کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خانقاہ میں بھٹکتا پھرتا تھا جیسے کوئی گم کردہ راہ مسافر جسے منزل تک پہنچنے کی نہ کوئی آس تھی نہ آرزو۔ لوگ اس کی طرف اشارے کرتے اسے روک کر اپنا حال کہنے کی کوشش کرتے ایک دوسرے کو بتاتے کہ یہی وہ خوش قسمت ہے جسے پیر صاحب کی نگاہ کرم نے کچھ کا کچھ کر دیا تھا۔ وہ کہیں نہیں رکتا تھا۔ کسی کی بات نہیں سنتا تھا۔ بس یہاں وہاں یونہی بھٹکتا پھرتا تھا۔ لوگ اسے دیکھ دیکھ کر کہتے تھے کہ وہ پیر صاحب کے کرم سے اللہ لوک ہو گیا ہے۔

مگر یہ اس کا دل جانتا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ اسے دنیا کتنی بے رنگ اور اجڑی اجڑی سی معلوم ہو رہی ہے۔ نہ اس کا جی قوالیوں میں لگا۔ نہ دھمال میں، نہ کسی محفل میں، نہ مزار پر۔ اس کی روح میں ایک پکار تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایک جستجو اور اس کے دل میں طلب۔ وہ کبھی یہاں کھڑا ہو جاتا تو کبھی وہاں۔ کبھی تیزی سے چل پڑتا تو کبھی رک کر نہ جانے کیا سوچنے لگتا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی طرف دیکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بات دل کو نہیں بھاتی تھی۔

وہ یونہی گم سم سا کھڑا تھا کہ گنگناتی ہوئی چنچل ہنسی اس کے چاروں جانب بکھر گئی۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں گھری ہوئی شہزادی ہنس ہنس کر اس کی طرف اشارے کر رہی تھی۔ وہ سخت بیزار ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ یہاں سے ہٹ جائے۔ وہ خود میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لڑکیاں ایک دوسرے کو ٹہوکے دیتیں۔ سرگوشیاں کرتیں، شوخ مسکراہٹ رسیلے ہونٹوں میں دباتیں اس کے قریب آ گئیں۔ سجاول نے الجھ کر حسینوں کے اس جھرمٹ کی طرف دیکھا۔ شزادی کی شوخ آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ لڑکیاں ایک دوسری کے پیچھے چھپتیں ایک دوسری کو اس سے بات کرنے کے لئے آگے دھکیلتیں ہنستی رہیں۔ پھر ایک گلابی گالوں والی نٹ کھٹ سی لڑکی ذرا آگے بڑھی اور ہنستے ہنستے اس طرح بولی کہ اس کے شوخ لفظوں سے اس کی چنچل ہنسی کہیں الگ نہیں تھی۔

''وے پا۔ یہ شہزادی تیری کیا لگتی ہے؟''

دوسری لڑکیاں بھی ایک چھناکے سے ہنس پڑیں۔ سجاول نے گھور کر شہزادی کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟''

شہزادی نے بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہا۔

''چپ کرو۔ نی چپ۔ ہمارا سجاول تو بڑا ڈاڈا ہے۔ بڑا ہی ڈاڈا۔''

وہ سب ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ سجاول نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ناچنے والی چنچل ہنسی اسے کوئی انوکھی اور عجیب شے معلوم ہو رہی تھی جس سے وہ واقف نہیں تھا۔ زندگی جو ہمیشہ اس کے لب کی آہ رہی تھی ان لڑکیوں کے ہونٹوں پر ہنسی بن بن کر کھل رہی تھی۔

شہزادی نے اندازہ کر لیا کہ وہ خفا ہے۔ اس نے دوسری لڑکیوں کو کچھ کہہ کر بھگا دیا اور خود اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ سجاول نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جا۔ تو بھی دفع ہو۔ یہاں کیوں کھڑی ہے' میرے سر پر؟''

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''سجاول میں تیرے سر پر کھڑی ہو جاؤں تو لوگ یہیں میلہ لگا لیں۔ کہیں کوئی سرکس

والے ہیں۔''

''بکواس نہ کر۔'' سجاول نے غصے سے سر جھٹک کر کہا۔

اس نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبائی۔

''یار یہاں تو لوگ دل ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں آپس کی بات ہے میں نے تو سب کو یہی کہا ہے کہ اپنا منگیتر ساتھ ہے ذرا کسی نے میلی آنکھ سے دیکھا تو انتڑیاں ڈھیر کر دے گا۔''

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنس پڑی۔ اس کے سنہری عارضوں میں گلابی رنگ پھوٹا۔

''سجاول۔ اگر کوئی تجھ سے پوچھے تو انکار نہ کرنا۔ تجھے میری قسم۔''

''الو کی پٹھی۔'' سجاول نے دانت کچکچائے۔ ''تجھے منگیتر بنانے کو کوئی اور مسٹنڈا نہیں ملا تھا۔''

''اور کوئی اپنے جوڑ کا ہے ہی نہیں۔'' اس نے شان دلربائی سے شانے اچکائے۔

''چل جا اب۔ میرا دماغ نہ چاٹ خوامخواہ۔'' سجاول نے بیزاری سے کہا اور چلنے کا ارادہ کیا۔

شہزادی کی خوبصورت شوخ آنکھوں میں گلے کی سی کیفیت اتر آئی۔

''سجاول تو تو ہمیشہ خفا ہی رہتا ہے۔'' اس کا لہجہ اتنا مختلف تھا کہ سجاول نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں کوئی گالی دے کر آگے بڑھ گیا۔

O......O......O

وہ سکون کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا تھا مگر سکون کہیں نہیں تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پیر و مرشد کے حجرے میں جا کر اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دے۔ اپنا چاک چاک دل ان کے سامنے کھول دے۔ اپنا فگار سینہ انہیں دکھائے۔ ان سے کہے کہ انہوں نے تو اسے مشکلیں آسان ہو جانے کی دعا دی تھی لیکن اس کی تو مشکلیں اور بڑھ گئی تھیں۔ اس کی بے سکونیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا قرار لٹ گیا تھا۔ اس کی روح میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

وہ ملاں پسوڑی کو حیرت سے دیکھتا جو اس آستانے پر آ کر بالکل بدل گیا تھا۔ وہ انگلیوں میں تسبیح پھراتا یوں مطمئن اور آسودہ نظر آتا تھا جیسے دل میں کوئی خلش نہ ہو۔ جیسے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ کاش وہ بھی اس آسودگی کا ذائقہ چکھ سکتا۔ کاش یہ آستانہ اس کی تقدیر بدل سکتا۔ اس کا لخت لخت دل ٹھکانے نہیں آتا تھا۔ دکھ، غم، تفکرات اس کے پیچھے پیچھے اس کے آس پاس، اس کے گرد و پیش ہر طرف فضا میں تیرتے پھرتے تھے۔

خانقاہ میں بے مقصد گھومتے گھومتے وہ تھک کر چور ہو گیا تھا۔ آخر وہ ایک گوشے میں پڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کا جسم دکھنے لگا۔ فضا میں حبس بڑھتا جاتا تھا یا اس کے اپنے اندر کی گھٹن تھی جو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

رات کی سیاہ چادر پر ٹکے ہوئے ستارے مدھم مدھم اور بے نور تھے۔ فضا میں ایک عجیب ناگوار سی بو رچی ہوئی تھی۔ قریب سوئے ہوئے لوگوں کے خراٹوں کی آوازیں مکروہ اور کراہت آمیز تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر چت لیٹا آسمان کی طرف خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا۔

پھر کچھ سوچ کر اٹھا اور ارد گرد سوئے ہوئے لوگوں سے بچتا بچاتا پیر و مرشد کے حجرے کی طرف چل پڑا۔ ہولے ہولے پاؤں دھرتا وہ سوچ رہا تھا کہ اس گہری رات میں پیر و مرشد

کے مرید سو چکے ہوں گے۔ وہ خود یقیناً جاگ رہے ہوں گے۔ عبادت میں معروف ہوں گے۔ وہ چپ چاپ ان کے در پر جا بیٹھے گا اور ان سے اپنے لئے سکون کی دولت مانگ لے گا۔

اس کے دل میں امید کی جوت جگی اور اس کے قدموں میں تیزی آ گئی اسے منزل کی خوشبو بہت قریب محسوس ہونے لگی۔ اسے یقین سا ہونے لگا کہ پیر و مرشد اسے سکھ کی بھیک دے دیں گے۔ وہ اس کی جھولی میں سکون کی دولت ڈال دیں گے۔ وہ اسے دنیا سے بے نیاز کر دیں گے۔ یہی لگن اسے کشاں کشاں پیر صاحب کے حجرے کی طرف کھینچے لئے جاتی تھی۔

وہ ڈیوڑھی کے دروازے پر لمحے بھر کو رکا ہی تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

کوئی لڑکی بدحواسی میں بھاگتی۔ گرتی پڑتی ڈیوڑھی سے باہر آئی۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی وہ دہلیز پر کھڑے ہوئے سجاول کے ساتھ بڑے زور سے ٹکرائی۔ وہ بھی لڑکھڑایا لیکن سنبھل گیا اور اسے شانوں سے پکڑ کر روک لیا۔ وہ گھبرا کر خود کو چھڑانے لگی۔

سجاول نے بوکھلا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی اوڑھنی زمین پر لٹک رہی تھی۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ سجاول نے پریشانی میں اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''شہزادی! شہزادی! ہوش کر۔ ہوش کر۔ کیا ہوا ہے تجھے؟ یہ کیا حال بنایا ہے تو نے اپنا؟؟''

وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کے بازو سے لگ گئی۔

''سجاول! مجھے یہاں سے کہیں اور لے چل۔ مجھے یہاں سے نکال۔ خدا کے لئے سجاول مجھے کہیں اور لے جا۔''

سجاول نے سٹپٹا کر اسے خود سے علیحدہ کر دیا اور تسلی کے لئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا لیکن اسے اس پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس کی شوخی اور بے باکی نے ہی یہ نوبت پہنچائی تھی۔

اب اس کی شوخی، شرارت، بے باکی اور طراری سب کافور ہو گئی تھی۔ وہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دونوں ہاتھوں سے پونچھتی ہوئی ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے اوٹ میں لے جاتے ہوئے بولا۔

"کمینی تیری شوخیوں نے ہی یہ چاند چڑھایا۔ برا بھلا کچھ نہیں دیکھتی۔ ہر ایک سے بک بک کرنے کھڑی ہو جاتی ہے۔" شہزادی نے زور سے اس کا بازو جھٹکا اور سرکشی سے بولی۔

"تو کیا کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں۔ میں آپ تو اس مسٹنڈے کے پاس نہیں گئی تھی۔ مجھے ملاں نے بھیجا تھا۔"

"کس کے پاس؟" سجاول نے عجلت میں پوچھا۔

"اسی کمینے پیر کے پاس۔ کہتا تھا اس کے گھر سے بیمار ہیں تو تھوڑی خدمت کر دینا۔ مجھے کیا پتہ اس بدمعاش کی کیا مرضی ہے۔ بڑا پیر بنا پھرتا ہے۔ پھر میں نے بھی ایسے ہوش ٹھکانے لگائے ہیں کہ ایک بار تو یاد ہی کرے گا۔ الو کا پٹھا پیر۔"

سجاول بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ شہزادی کیا کہہ رہی ہے۔ وہ کس کا ذکر کر رہی ہے۔ وہ کس کو صلواتیں سنا رہی ہے۔ پیر و مرشد کے بارے میں تو وہ ایسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن شہزادی تو اسی کا نام لے رہی تھی۔ شاید اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی یا اچانک حادثے کی وجہ سے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اس نے زمین پر گھسٹتی ہوئی اس کی اوڑھنی اٹھا کر اس کے سر پر ڈالی اور دبی زبان سے بولا۔

"کچھ سوچ سمجھ کر بات کر شہزادی! تجھے دھوکہ تو نہیں ہوا۔"

"میں ابھی اتنی اندھی نہیں ہوئی۔ سمجھا تو۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"تجھے میری بات پر یقین نہیں آتا تو جا اندر جا کر ابھی اس بدمعاش سے پوچھ لے۔ جا' جا کے ہلدی چونا لگا اس ماے کو۔ جو کمینہ بدکار پیر بنا پھرتا ہے۔" اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

"آہستہ بول۔" سجاول نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے غصے سے ایک جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

"کسی نے تیری یہ بکواس سن لی نا تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"جو سنتا ہے سن لے۔ میں جھوٹی نہیں ہوں جو کسی سے ڈروں۔ تو ابھی آ میرے ساتھ۔ چل اسی بدمعاش کے حجرے میں۔ میں تھوکتی ہوں اس کے منہ پر۔" وہ دانت پیس کر گالیاں بکتے ہوئے بولی۔

"عقل سے کام لے شہزادی۔ ذرا تحمل سے مجھے بتا کہ بات کیا ہوئی ہے۔" سجاول

نے شش و پنج کے عالم میں کہا۔

اس نے اک پل میں دنیا بدلتی دیکھی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اتنی تیزی سے سامنے آیا تھا کہ اس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس نورانی صورت والے پیر کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ معلوم ہوتا تھا جس کی ایک نگاہ نے خود اس کی دنیا میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کس طرح یہ سب کچھ سوچ سکتا تھا۔

"سجاول میں اور کس طرح بات کروں۔ تجھے کس طرح سمجھاؤں؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"میں جیسی بھی ہوں سجاول! مگر ایسی تو نہیں کہ ایسی تہمت اپنے نام لوں گی۔"

شاید پہلی بار سجاول نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ اس کا بات کرنے کا انداز سچ کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ پشیمان سا ہو کر بولا۔

"شہزادی! اس بات نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ اس پیر کو دیکھتا ہوں تو یقین ہی نہیں آتا لیکن تو تسلی رکھ۔" اس نے شہزادی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"فکر نہ کر۔ اگر وہ پیر واقعی ایسا بندہ ہے تو سمجھ اب اس کی خیر نہیں۔ لیکن دیکھ یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔ خبردار جو کسی کے سامنے زبان کھولی۔ اور اگر اب تجھے ملاں وہاں بھیجے تو فوراً مجھے خبر کرنا۔ سمجھی؟ اس کے یہاں ہزاروں مرید ہیں۔ اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

شہزادی نے اپنے سر پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"سجاول! مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ میں نے۔ میں نے اسے زخمی کر دیا ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لے گا۔ سجاول میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتی ہوں۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ میرا دامن پاک ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ تو مجھے اپنے کپڑوں کا جوڑا لا دے میں ابھی یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

سجاول بے طرح پریشان ہوا۔ اندھیری سنسان رات اور وہ تنہا لڑکی۔ بھلا اس وقت کہاں جا سکتی تھی۔ اس غیر متوقع صورتحال نے ذہن بالکل ہی ماؤف کر دیا تھا۔ اس پر شہزادی کچھ سوچنے بھی نہیں دیتی تھی۔ اس نے مسلسل یہ رٹ لگا رکھی تھی کہ وہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جائے گی۔ سجاول زچ ہو کر اس پر برس پڑا۔

''دماغ تو صحیح ہے تیرا الو کی پٹھی! اس وقت اکیلی تو کہاں جائے گی؟ کہاں مرے گی؟ اب کسی اور کے ہتھے چڑھنا چاہتی ہے۔''

اس نے حسب عادت اسے ترکی بہ ترکی جواب نہیں دیا۔ اس کے دلکش چہرے پر ایک نرالی سی کیفیت چھا گئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھتی اور اپنا چھوٹا سا ملائم ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر دھیرے سے گنگنائی۔

''سجاول میں اکیلی ہوں نا۔ تو میرے ساتھ چل۔ چل ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔'' اس کے والہانہ لہجے میں ہجیلے ارمانوں کی کلیاں چٹک رہی تھیں۔

سجاول نے چونک کر اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا اور گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے غصے کی پروا کئے بغیر اس کے بازو سے لگ گئی۔

''سجاول! تو مجھے کہیں بھی لے چل۔ میں آنکھیں بند کر کے تیرے پیچھے چل پڑوں گی۔ میں ساری عمر تیری غلامی کروں گی۔ ساری عمر۔''

''پیچھے ہٹ۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔'' سجاول نے پھر اسے پیچھے دھکیل دیا اور ناراضی سے بولا۔

''بیوقوفی کی باتیں مت کر۔ جا۔ جا کر آرام کر۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فو بتانا۔''

''سجاول میری بات مان لے۔'' شہزادی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

سجاول نے سر جھٹکا۔

''پاگل ہوئی ہے۔ چل جا کر سو جا۔ تجھے ملاں کا پتہ نہیں۔ جینا حرام کر دے گا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہیں کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی۔ سجاول نے اس کا با تھاما۔

''چل میں تجھے اپنے ڈیرے تک پہنچا آؤں۔''

''نہیں تو رہنے دے۔ میں آپ چلی جاؤں گی۔'' شہزادی نے اس کا ہاتھ پرے دیا اور آگے بڑھ گئی۔

۞......۞......۞

اگلی صبح شہزادی غائب تھی۔ ملاں اور ڈیرے کے دوسرے لوگ سب حیران تھے ک

کدھر گئی۔ پہلے تو ملاں یہی سمجھتا رہا کہ وہ پیر و مرشد کی حویلی کے زنان خانے میں ہے۔ مگر جب شام تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو اس نے پیر و مرشد کے مریدوں سے پوچھا۔ یہ سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ پیر و مرشد کا ایک مرید بھی غائب ہے۔ غالباً وہ اسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

پیر و مرشد کے مریدوں نے کہا تھا کہ آئندہ وہ ایسی بدچلن لڑکیوں کو اپنے ہمراہ لے کر نہ آیا کرے۔ ابھی تو انہوں نے پیر و مرشد کو اس واقعے کی خبر نہیں ہونے دی تھی ورنہ ان کے جلال کی حد نہ ہوتی۔ ملاں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی منت سماجت کی کہ وہ اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیں۔ خاص طور پر پیر و مرشد سے اس کا بالکل ذکر نہ کریں ورنہ وہ ان کے سامنے نگاہ اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔

شہزادی کے غائب ہونے کی خبر نے سجاول کو بے حد فکرمند کر دیا تھا۔ وہ جو پہلے ہی بیکل اور پریشان تھا اب کچھ اور بے چین ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے پیر و مرشد نے ہی غائب کروایا ہے۔ اور اگر وہ اپنی حماقت میں خود کہیں نکل گئی تھی تو بھی اس کی خیر نہیں تھی۔ ملاں اس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ اس کے کارندے اسے بوگیر کتوں کی طرح ہر طرف سونگھتے پھرتے تھے۔ وہ کہاں تک چھپ سکتی تھی۔ کتنی دور تک بھاگ سکتی تھی۔

بار بار اس کی شریر آنکھیں، اس کی چنچل ہنسی، اس کی نٹ کھٹ شرارتیں سجاول کی یادوں میں ابھرتی تھیں۔ وہ کیسی زندگی سے بھرپور، ہنستی کھیلتی لڑکی تھی لیکن اب نہ جانے کس حال میں تھی۔ کہاں تھی؟ کدھر چلی گئی تھی؟ اسے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ملاں کے کارندے اسے ڈھونڈ ہی نہ نکالیں۔ اسے بھی ملاں نے یہ فرض سونپا تھا کہ وہ قریبی سٹیشن اور بسوں کے اڈے پر اسے تلاش کرے۔

سجاول بظاہر تو خانقاہ سے نکل کر بسوں کے اڈے کی طرف چل پڑا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ ساری دنیا سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ عقیدتوں کے برج منارے مسمار ہو گئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس منحوس پیر کے منہ پر کالک مل کر اسے گلیوں بازاروں میں گھسیٹتا پھرے۔ ایک ایک کو اس کے کالے کرتوت بتائے۔ اس کے مکروہ چہرے سے نیک نامی کی نقاب نوچ کر اس کا اصلی چہرہ دنیا کو دکھا دے۔

وہ دل ہی دل میں اس پر سوچ رہا تھا۔ وہ کوئی ایسا منصوبہ بنانا چاہتا تھا کہ پیر کو بے نقاب کر سکے جس نے اپنے گرد مصنوعی کرامات کا ایک جال سا بن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت

لبے تھے۔ علاقے کے تمام معزز لوگ وہاں حاضری دیتے تھے۔ اس پر کوئی الزام لگانا اور اسے ثابت کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی اس کی مصنوعی کرامات کا پردہ چاک کرنا چاہتا تھا۔ خواہ اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا بسوں کے اڈے تک گیا اور یونہی ادھر ادھر آوارہ گردی کر کے کہیں شام کو واپس آیا۔ یہ جان کر اسے اطمینان ہوا کہ ملاں کے کسی کارندے کو شہزادی کی خبر نہیں ملی تھی۔ مگر یہ فکر ابھی بھی اس کے دل سے دور نہیں ہوا تھا کہ اگر شہزادی کو پیر کے بندوں نے غائب کیا ہے تو نہ جانے وہ کہاں ہو گی؟

رات لنگر سے کھانا آیا تو اس نے بے نام ہی کھایا۔ نہ وہ سماع میں شریک ہوا نہ کسی اور محفل میں۔ بس چپ چاپ ایک کونے میں پڑ کر لیٹ رہا۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور ذہنی پریشانی نے اس کی پلکوں کو بوجھل کر دیا۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا پھر نہ جانے کب سو گیا۔

اچانک عجیب سے شور وغل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے اردگرد سوئے ہوئے دوسرے لوگ بھی اٹھ اٹھ کر بیٹھ رہے تھے۔ کسی لڑکی کے خوفناک قہقہوں سے خاموش رات گونج رہی تھی۔ کچھ لوگ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ نے لیٹے لیٹے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ اور کچھ اسی طرح بے خبر پڑے سوتے رہے۔

رفتہ رفتہ قہقہے چیخوں کا روپ دھارنے لگے۔ ان میں تیزی اور دیوانگی پیدا ہونے لگی۔ لوگ ٹھٹھک گئے۔ کچھ اور اٹھے۔ کچھ نے قیاس آرائی کی کہ پیر و مرشد کسی کا جن نکال رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ کسی مؤکل کو زیر کر رہے ہیں۔ جن اور مؤکل کا تذکرہ سن کر کچھ لوگ منہ لپیٹ کر پھر پڑ رہے لیکن کچھ من چلے اٹھ کھڑے ہوئے کہ اپنی آنکھوں سے پیر صاحب کی کرامات دیکھیں۔

سجاول کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ یہ سوچ کر اس کے اندر ایک ہیجان سا بپا ہو گیا کہ آج کسی اور شہزادی کا آنچل پیر کے گندے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی رگوں میں گردش کرتا ہوا لہو لاوا بن گیا۔ وہ لپک کر اٹھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ آج وہ پیر کا فیصلہ کر کے ہی رہے گا۔ اس کے قریب ہی لیٹے ہوئے ملاں نے نیند بھری آنکھیں بمشکل کھولیں اور نیم غنودگی کے عالم میں بولا۔

''سجاول۔ یہ کیسا شور ہے؟''

''ابھی پتہ کر کے آتا ہوں۔'' سجاول نے چلتے چلتے کہا تو ملاں کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔

پیر و مرشد کے حجرہ خاص کے سامنے ایک ہجوم تھا لیکن کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر آگے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دوسروں کے کندھوں پر سے جھانک رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیسا شور ہے۔؟ کس کی چیخیں اور کیسے قہقہے سنائی دے رہے ہیں؟ حجرے میں کون لڑکی ہے؟

لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ صرف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اندازے لگائے جا رہے تھے لیکن آگے کیا ہو رہا ہے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ لوگوں کے آپس میں باتیں کرنے سے ایک شور سا مچ گیا تھا لیکن لڑکی کے قہقہے اور چیخیں اب بھی سنائی دے رہے تھے۔ جس وقت یہ وحشتناک ہنسی چاروں طرف گونجتی تو مجمعے پر سکوت سا چھا جاتا۔

اچانک آگے کھڑے ہوئے لوگوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ کسی نے پیچھے مڑ کر بلند آواز میں روتے ہوئے فریاد کی۔

''ہم مارے گئے۔ ہم لٹ گئے۔ پیر صاحب قتل ہو گئے۔''

''ہیں......! پیر جی مارے گئے؟'' کسی نے وحشت سے کانپ کر کہا۔

''ہائے......ہائے......! پیر سائیں کا خون ہو گیا۔'' کوئی کرب سے چلایا۔

''ہم لٹ گئے۔ ہم یتیم ہو گئے۔ اللہ والی سرکار کا وصال ہو گیا۔'' کسی نے سینے پر دوہتڑ مارا۔

سارے مجمعے میں ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ ''پیر و مرشد شہید ہو گئے۔''

فضا میں خون کو منجمد کر دینے والی دہشت چھا گئی۔ کسی کو اعتبار نہیں آتا تھا۔ کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ لوگوں کے سروں پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ پیروں تلے زمین ڈول رہی تھی۔ سب حیرت و سراسیمگی کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ پیر صاحب کو کس نے قتل کیا ہے؟

کسی نے بتایا کہ اسی پاگل لڑکی نے جو قہقہے لگا رہی ہے۔ لوگ دم بخود رہ گئے۔ حیرت نے انہیں گنگ کر دیا۔ ایک معمولی لڑکی اتنے پہنچے ہوئے پیر کو کس طرح قتل کر سکتی ہے؟ اس سوال نے سارے ذہنوں کو چکرا دیا تھا۔ لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد پیر صاحب کا ایک مرید خاص باہر آیا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ اس نے مجمعے کو بتایا کہ لڑکی پر کسی بھاری جن کا قبضہ تھا جس پر قابو پانے کی کوشش میں پیر صاحب شہید ہو گئے تھے۔

لوگ جواب تک شش و پنج کے عالم میں تھے اور بے یقینی سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ ابھی اس خبر کی تردید ہو جائے گی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ عورتیں بلند آواز میں بین کرنے اور سر کے بال نوچنے لگیں۔ کچھ لوگ سکتے میں آ گئے۔ کچھ صدمے سے گنگ ہو گئے۔

لڑکی کے قریب کوئی بھی جانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ کبھی قہقہے لگاتی، کبھی چیخیں مارنے لگتی اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اس کے ہونٹوں سے مغلظات کی بارش ہو رہی تھی۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور ادھورے جملوں میں نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔

ہجوم کو دیکھ دیکھ کر اس کی وحشت بڑھ رہی تھی۔ کبھی وہ حجرے کے اندر چلی جاتی۔ پھر زور سے دروازے کے پٹ بجاتی، نہ جانے کیا کچھ کہتی ہوئی باہر آ جاتی۔ کبھی ہنستی۔ کبھی روتی کبھی گالیاں بکتی اور کبھی نہ جانے کس کو کوستی۔ اس کے حلق سے غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔

جس سے لوگ دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ اس پر جن کے قبضہ کا خوف کسی کو آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ جا کر اسے قابو کرے۔ سب اس خوف سے کانپ رہے تھے کہ لڑکی پر جن سوار تھا۔ جو اتنا طاقتور تھا کہ اس نے اتنے پہنچے ہوئے پیر کو قتل کر دیا تھا۔

سجاول مجمعے میں سے راستہ بناتا ہوا پیر و مرشد کے حجرے کے قریب پہنچ گیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ پیر و مرشد اور لڑکی میں کیا معاملہ ہوا تھا۔ لڑکی خود کو بچاتے ہوئے پیر کو قتل کر چکی تھی۔ شاید اسی قتل کی دہشت نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا جس اپنے سر خون لیکر نہ جانے کتنی دوشیزاؤں کے آنچل تار تار ہونے سے بچا لئے تھے۔

حجرے کے قریب پہنچ کر اس نے احاطے میں شیرنی کی طرح بپھری ہوئی لڑکی دیکھا۔ جس کے لمبے سیاہ بال کھل کر بکھر گئے تھے۔ جس کے کپڑے کہیں کہیں سے مسکے ہوئے تھے۔ جس کے سر پر چادر نہیں تھی۔ جس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت نے اس کے

خوبصورت نقوش بگاڑ دیئے تھے۔ جس کی وحشی آنکھوں سے غم و غصے کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ کسی ایک سمت نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اسے کسی کل قرار نہیں تھا۔ وہ بار بار سر جھٹکتی ہوئی اپنے ہی بال نوچتی تھی۔

سجاول ٹھٹک گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گہرے صدمے میں ڈوبتے ہوئے اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ ''کاش یہ لڑکی یہاں نہ ہوتی۔''

اسے بلور سے ترشے ہوئے خوبصورت پیروں میں کھنکتی ہوئی جھانجریں یاد آئیں۔ اسے غرور حسن سے تمتمایا ہوا دلکش چہرہ یاد آیا۔ اسے مستی میں ڈوبی ہوئی گلابی آنکھیں یاد آئیں۔ اسے اکھڑ لہجے میں بولتا ہوا پیار یاد آیا۔ اسے تیکھے تیور اور ناز سے اٹھی ہوئی گردن یاد آئی۔

اس کے اندر بے طرح ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ رنج و الم کی تڑپا دینے والی کیفیت نے اسے چور چور کر دیا۔ اس کا جی چاہا کہ رو پڑے۔ ہیر کی طرح بانکی اور دلربا گلابی کے ہاتھ تو مہندی کے بجائے خون سے رنگے گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ پیر و مرشد کی دور دور تک بڑی ساکھ تھی۔ اسی لئے فوراً ہی ساری مشینری حرکت میں آ گئی تھی۔ سجاول کی آنکھوں کے سامنے دلآویزی کے پیکر حسن کی مورت کو پولیس والے اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے اور وہ دگرگوں دل کو سنبھالتا وہیں کھڑا رہ گیا۔

زندگی کا یہ ستم اس پر بہت بھاری پڑا تھا۔ اسے ہر شے ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔ ہر طرف بیقراری اور بے کلی تھی۔ بے چینی اس کی رگ رگ میں سما گئی تھی۔ اسے بار بار پھولوں والی گلابی کا خیال آتا تھا جو جیل کی سنگلاخ دیواروں کی طرف چلی گئی تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ بھی اپنے اختیار میں نہ ہو۔ نہ لمحے، نہ دل، نہ وقت، نہ حالات، نہ تقدیر، نہ اپنا آپ۔ بے اختیاری اور بے بسی جیسے چاروں طرف برس رہی تھی۔ وہ اکتایا ہوا پریشان حال، رنج میں ڈوبتا، ابھرتا اس جگہ سے دور ہٹتا گیا۔ وہ اس جگہ سے، اس مقام سے، اس لمحے سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ جہاں گلابی قاتل کے روپ میں کھڑی تھی۔ وہ مٹی میں اٹے ہوئے پیروں کے ساتھ بے سمت چلتا چلا گیا اور نہ جانے کب تک چلتا رہا۔ خود سے بے خبر گرد و پیش سے لاتعلق بلا سوچے، بلا سمجھے۔

اچانک اس کا پاؤں مٹی کی ڈھیری سے ٹکرایا۔ وہ گرتے گرتے بچا اور جیسے گرد و پیش میں لوٹ آیا۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ وقت اور مقام اور سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آتا تھا۔ وہ بغیر کچھ کھائے پیئے نہ جانے کہاں نکل آیا تھا۔ اس کے چاروں طرف فضا خاموش تھی۔ اور ہر طرف مٹی کی چھوٹی بڑی ڈھیریاں بکھری پڑی تھیں۔ وہ شاید کوئی قبرستان تھا۔ جس کی فضا میں ہیبت اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔

سجاول کے دل کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ زندگی کے انجام نے اس کی مایوسی اور حسرت بڑھا دی۔ اسے وقت، زندگی اور ساری دنیا مٹی کا ڈھیر نظر آنے لگی۔ اس نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ سوچا کہ زندگی کی حرارت، رونق اور گہما گہمی کو یوں مٹی کا ڈھیر ہی ہونا ہے تو پھر یہ ساری تگ و دو، یہ سارا کھیل اور یہ ساری جیت ہار کس لئے۔

ہر طرف ویرانی ہی ویرانی۔ ناآسودگی اور اکیلا پن تھا۔ اس نے گھبرا کر اس جگہ سے دور نکل جانا چاہا۔ جو اسے اس کی، زندگی کی اور ہر شے کے فنا ہو جانے کی خبر دے رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ اچانک ٹھٹک گیا۔

اس نے حیرت سے دیکھا کھلے ہوئے بالوں والی ایک عورت ایک قبر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کے قدم وہی رک گئے۔ اس کے دل پر نامعلوم سی ہیبت چھا گئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس ویران سے قبرستان میں یہ کون عورت تھی جو قبر سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے بھورے بال مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے اس کی سسکیوں کی درد بھری صدا سنائی دیتی تھی۔ جو روح پر ایک لرزہ سا طاری کر دیتی تھی۔ وہ شاید کچھ کہہ بھی رہی تھی لیکن اس کے شکستہ لفظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

سجاول کو افسوس سا ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ اسے تسلی دے۔ اسے سمجھائے کہ دنیا کا یہی دستور ہے۔ خدا کی مرضی کے سامنے کون دم مار سکا ہے۔ اس کے اس طرح رونے اور ہوش کھونے سے مٹی کے ڈھیر میں مٹی ہو جانے والا رشتہ اس کی محبت، اس کی چاہت اسے واپس نہیں مل سکتی۔ وہ دو چار قدم آگے بڑھا اور اس نے محتاط سے لہجے میں پکارا۔

"بی بی...... بی بی!!! اٹھ گھر جا۔ اس طرح رونے سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ اللہ کی یہی مرضی ہے۔ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔"

اس نے بہت کچھ کہا اور کئی دفعہ کہا۔ لیکن اس نے جنبش تک نہیں کی۔ نہ پہلو بدلا بس اسی طرح قبر پر اوندھی پڑی سسکیوں اور ہچکیوں میں نہ جانے کیا کہتی رہی۔

سجاول نے اردگرد دیکھا۔ قبرستان میں ہر طرف ویرانی کا بسیرا تھا۔ کوئی ذی روح یہاں ان کے سوا نہیں تھا۔ ہر طرف موت کے سائے منڈلاتے نظر آتے تھے۔ سجاول نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کا شانہ ہلائے یا اسے قبر سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی خستہ حالت دیکھ کر اس کا دل کڑھ رہا تھا۔

اس نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر آہستگی سے اٹھانے کی کوشش کی اور ملائمت سے بولا۔ "اٹھ بی بی! اپنے گھر جا۔ اللہ تجھے صبر دے۔ تیری پریشانی دور کرے۔"

"نہیں...... نہیں۔ میں اپنے کاکے کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی...... وہ میرے بغیر نہیں رہتا۔" اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لینا چاہا۔ لیکن سجاول نے اسے اس کا موقع نہیں دیا اور اسے قبر پر سے اٹھا کر اس کے پیروں پر کھڑا کر دینا چاہا۔

وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی اور دور ہٹ کر وحشت زدہ نظروں سے اس کی جانب تکنے لگی۔ اس کا سارا چہرہ مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ اور گرد آلود بال بکھرے ہوئے تھے۔ سجاول نے دکھ اور ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ خود کو روک نہیں سکا بے ساختہ آگے بڑھ کر اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"رانی! تو نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ تجھے کیا ہوا ہے؟"

وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی دلکش بادامی آنکھوں میں وحشت اور ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ سی کھڑی کبھی اس کی طرف اور کبھی قبر کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس انتظار میں ہو کہ کب وہ جائے اور وہ پھر قبر سے لپٹ کر منوں مٹی تلے سوئے ہوئے پھول سے باتیں کر سکے۔

سجاول کے دل کی دنیا تاراج ہو گئی۔ دکھ اور رنج کے کچل دینے والے احساس نے اسے چور چور کر دیا۔ اس کے من کی اکلوتی آرزو یہ کس روپ میں اس کے روبرو کھڑی تھی۔ آنسو بھری آنکھیں لئے۔ ہوش و خرد سے بیگانہ، اجڑی اجڑی ہوئی سی۔ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹی ہوئی التجا تھی۔

"میرا کاکا......! میرے بغیر نہیں رہتا، وہ ڈر جاتا ہے۔ وہ روتا ہے۔ وہ روتا ہے۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں ایک ہی فقرہ بار بار دہرا رہی تھی۔

سجاول کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر اس کے قریب ہوا اور اس نے اس کے غبار آلود چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ دینا چاہا۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ پیچھے

ہٹ گئی۔اور ناخن چباتی ہوئی بولی۔

"نہیں......نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے کاکے کے پاس رہوں گی۔ اپنے کاکے کے پاس۔اس کے ساتھ۔"

سجاول نے اس کے ہونٹوں سے بکھرتے ہوئے شکستہ حرفوں کو سنا۔لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ پایا کہ وہ اپنے بچے کے غم میں ہوش وحواس کھو بیٹھی ہے۔اسے وہ لمحے یاد آئے جب خانقاہ میں وہ اس کے قدموں میں بیٹھی اپنے بچے کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں سے جھلکتا ہوا اس کا عکس آنسوؤں میں بھیگ گیا تھا۔لیکن آج اس کے آنسوؤں میں کوئی عکس، کوئی تصویر، کوئی چہرہ نہیں تھا۔سجاول کو لگا جیسے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔رانی کی یہ تباہ حالت دیکھنے کیلئے کاش وہ یہاں کبھی نہ آیا ہوتا۔

سجاول کا جی چاہا کہ اپنے ہاتھوں سے اس کے بال سمیٹے۔اس کے چاند ایسے چہرے سے گرد ہٹائے اور اسے اسی اجلے روپ میں دیکھے جو آج بھی اس کے دل کے آسمان پر پورے چاند کی طرح روشن تھا۔وہ پھر ایک بار اس کے قریب آیا۔اور ملائمت سے بولا۔

"رانی!...... ہوش کر۔ دیکھ مجھے پہچان...... میں سجاول ہوں سجاول۔ میں سجاول ہوں۔" اس نے بار بار دہرایا کہ شاید کوئی لفظ، کوئی حرف اس کے دل پر جا لگے۔شاید اس کا نام اسے چونکا دے۔شاید اس کی پہچان اس کے ہوش لوٹا دے۔

لیکن اس کی وحشت بھری آنکھوں میں کوئی پہچان نہیں ابھری۔وہ کچھ خوفزدہ سی اپنے بچے کے بارے میں نہ جانے کیا کہتی الٹے قدموں اس سے دور ہٹتی گئی۔سجاول ابھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دور سے کسی کی آواز سنائی دی۔

"رانی!......او رانی۔تو پھر یہاں پڑی ہے۔چل آ گھر چل۔آ جا شاباش۔" سجاول نے پلٹ کر دیکھا گاڑھے کی بکل میں کوئی دیہاتی عورت تھی جسے سجاول نہیں پہچانتا تھا۔لیکن اس نے فوراً ہی اسے سلام کر دیا۔

اس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے اسے سر سے پاؤں تک تنقیدی نظروں سے دیکھا اور کچھ اکھڑ لہجے میں بولی۔"بھائی تو کون ہے؟ یہاں کا تو نہیں لگتا۔تو کیا کر رہا اس قبرستان میں؟"

"پردیسی ہوں بی بی!" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"یہاں سے گزرا تو سوچا فاتحہ ہی پڑھ لوں۔دیکھا تو یہ یہاں اس قبر پر پڑی تھی

شاید اس کے بچے کی قبر ہے۔"

اس عورت کا شک قدرے رفع ہوا اور اس کا لہجہ بدلا۔"بس بھائی کیا کریں۔کس سے گلہ کریں۔مقدر ہی خراب ہوں تو اس کا کیا علاج۔کہنے کو گاؤں کے چوہدری سے بیاہی گئی ہے۔پر سکھ کا ایک دن نہیں دیکھا۔"

سجاول کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔اس نے ایک دکھتی ہوئی نگاہ رانی پر ڈالی جو پھر قبر پر جھک کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی۔سجاول نے پریشانی سے پوچھا۔

"کیوں بہن اس کا گھر والا اچھا نہیں ہے۔اس کا خیال نہیں رکھتا؟"

"اس نے خیال کیا رکھنا ہے۔" اس عورت نے چاروں طرف یوں دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا اور رازداری سے بولی۔"یہ اس کی تیسری بیوی ہے۔اب وہ چوتھی کے چکر میں ہے۔سکول کی استانی کے گھر کے پھیرے لگاتا ہے۔بس مرد ذات ہے۔جس پر دل آ گیا۔اسے تو پوچھتا تک نہیں۔یہ بیچاری بے زبان نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔بچہ ہو گیا تھا تو اسے بھی آسرا تھا، اسی میں لگی رہتی تھی پر قسمت...... اللہ کا مال تھا۔اللہ نے لے لیا۔پر اس کو چین نہیں۔اپنے ہوش میں نہیں آسکی، نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔سارا سارا دن کاکے کی قبر پر بیٹھی رہتی ہے۔میں ہی آ کر اسے منت سماجت کر کے لے جاتی ہوں۔"

سجاول کا احساس چھلنی چھلنی ہو گیا۔بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس نے عورت سے پوچھا۔"وہ استانی کون ہے جس کے پیچھے اس کے گھر والا پڑا ہے۔"

"یہیں گاؤں کے سکول میں پڑھاتی ہے۔ایک مائی کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔ہے تو شریف گھر کی پر چوہدری نے اسے ایسے سبز باغ دکھائے ہیں کہ۔" اس نے منہ ہی منہ میں گالی بکی اور بولی۔"کل وہ رانی کے حسن پر جان دیتا تھا۔آج استانی کے پیچھے پڑا ہے۔کل اسے چھوڑ کر کسی اور طرف منہ اٹھا کے چل پڑے گا۔"

وہ جھک کر پھر رانی کو منت سماجت کے ساتھ قبر سے ہٹانے لگی۔سجاول کیلئے اس منظر کو دیکھنا محال ہو گیا تھا۔اس کا بس چلتا تو رانی کے دکھوں کا مداوا کرتا۔اپنی جان کے عوض اس کی خوشیاں خرید لاتا۔لیکن محبت کہیں نہیں بکتی۔خوشیاں اور سکھ مول نہیں ملتے۔لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ رانی کیلئے سکھ تلاش کرے گا۔اس کی خوشیاں ڈھونڈ کر لائے گا۔اس نے بلدم دل میں کچھ ٹھانا اور ان کی طرف پلٹ کر دیکھے بغیر قبرستان سے باہر نکل گیا۔

دن بیتا جا رہا تھا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ان پے در پے صدموں نے جیسے اسے مار دیا تھا۔ اس کی صحرا ایسی بے آب وگیاہ زندگی میں جو دو نخلستان تھے۔ وہ دونوں اس کی آنکھوں کے سامنے سوکھ کر مٹی میں مل گئے تھے۔ اسے بھوک تو نہیں تھی لیکن جسم میں نقاہت سی محسوس ہوتی تھی۔

گاؤں کا تنور دیکھ کر وہ رک گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ یہاں کچھ دیر رک کر کھانا کھانے کے بہانے استانی کے گھر کا پتہ پوچھ لے گا۔ تنور والی نے کچی بدمزہ دال اور روٹی اس کے سامنے رکھی۔ تو اس کا جی ایک نوالہ توڑنے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مجبوراً اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ کھانا کھا رہا ہے اور تنور والی سے بولا۔ ”اماں...... استانی کہاں رہتی ہے؟“

اس عورت نے تنقیدی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیوں...... تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ مجھے تو تم اس گاؤں کے نہیں لگتے۔“

”ہاں اماں......! میں دور سے آیا ہوں۔ استانی سے مجھے کام ہے۔ اس کے رشتہ داروں کا ایک پیغام اسے دینا ہے۔“ سجاول نے بات بنائی۔

”وہ تو دو دن سے کہیں گئی ہوئی ہے۔“ اس نے اطلاع دی۔

سجاول پریشان ہو گیا۔ اس نے جو سوچا تھا اس پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اوپر سے شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کھانا وہیں چھوڑ دیا اور اس سے استانی کے گھر کا پتہ پوچھ کر اٹھ آیا۔

گاؤں کی کچی گلیوں میں سے ہوتا ہوا وہ استانی کے گھر کے باہر جا پہنچا۔ جھولتے ہوئے پرانے سے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید تندور والی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی یا استانی واپس آ گئی ہو اور اسے پتہ نہ چلا ہو۔ لیکن وہ تو واقعی موجود نہیں تھی۔ اس نے اردگرد کھیلتے ہوئے بچوں سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بھی کچھ صحیح نہ بتا سکے۔ اکثر نے یہی کہا کہ وہ آنے والی ہے۔ کل یا پرسوں آ جائے گی۔

سجاول نے جھکتے ہوئے اندھیرے اور پہلی تاریخوں کے باریک مدھم چاند کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ وہ اس اجنبی گاؤں میں رات کہاں گزارے۔ وہ استانی سے ہر حال میں ملنا چاہتا تھا۔ چاہے وہ دس دن بعد آئے یا مہینے بعد۔ مگر وہ اتنے دن کہاں پناہ لے۔ وہ ایک مشکوک آدمی تھا۔ ملاں سے کچھ کہے سنے بغیر وہ بلا ارادہ یہاں تک آ گیا تھا۔ یقیناً وہ بھی اس کی تلاش میں ہو گا۔ وہ خود کو کہاں محفوظ کرے۔

وہ یہی کچھ سوچتا ہوا قبرستان کی طرف چل پڑا۔ اس طرف کسی کے آنے کا خدشہ کم سے کم تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح یہاں رات تو گزار ہی سکتا تھا۔ قبرستان تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا۔ پہلی تاریخوں کے مدھم چاند کی روشنی بہت ہی پراسرار اور نامعلوم سی تھی۔ اس نے ایک نگاہ کچی دیوار کے اندر ڈالی۔ دور دور تک مٹی کی ڈھیریاں پھیلی دیکھ کر اسے جھرجھری سی آ گئی۔ ہر طرف پھیلی ہوئی ویرانی دل پر ہیبت طاری کرنے لگی۔ وہ وہیں دیوار کے پاس کھڑا خود کو اندر جانے پر آمادہ کر رہا تھا کہ اچانک اس کے پیروں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔

اس نے چونک کر اپنا پاؤں زور سے جھٹکا۔ درد کی ایک شدید لہر اس کے پاؤں سے چلی تو ساری ٹانگ میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ گھاس پھونس اور سوکھے ہوئے پتوں میں ایک سیاہ چمکیلی لکیر کو حرکت کرتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

سجاول نے اس موذی کا سر کچلنے کیلئے ادھر ادھر کسی چیز کی تلاش میں دیکھا۔ دور اسے ایک بڑا پتھر نظر آیا۔ اس نے دوڑ کر وہ پتھر اٹھایا۔ لیکن تب تک وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس کوشش میں وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے چکر سے آ رہے ہیں۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ اس نے سر کو کئی بار جھٹکا۔ اپنی آنکھوں کو پوری طرح کھول کر ہوش وحواس بحال رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنا پاؤں دیکھنا چاہا۔ لیکن اندھیرے میں کچھ بھی دیکھنا محال تھا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ ذہن پر جیسے ایک دھندسی چھا گئی۔ پاؤں میں سوزش بڑھنے لگی۔ وہ بے طرح پریشان ہوا۔ وہ ایسی بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذمے تو ابھی بہت سے کام تھے۔ اس نے اپنے اندر کی ساری قوت خود کو زندہ رکھنے میں صرف کر دی۔ جیب سے رومال نکالا اور اسے اندازے سے خون کے بہاؤ پر کس کر باندھ دیا۔

معاً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اس قبرستان میں کہیں گورکن تو ہو گا۔ شاید وہ اس کی کٹیا کہیں تلاش کر سکے۔ وہ موت سے ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور نڈھال سا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ قبرستان میں داخل ہو گیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور حلق خشک تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے آواز دی۔ ”کوئی ہے...... کوئی ہے...... یہاں کوئی ہے۔“

گہرا سناٹا اس کی آواز سے چکنا چور ہو گیا اور اس کی گونج دور تک دوڑتی چلی گئی۔ اس نے تھوڑا توقف کیا کہ شاید اس کی آواز کا کوئی جواب آ جائے۔ لیکن تاریکی اور خاموشی جوں کی توں تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ اسے اپنے پاؤں پر کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ درد کی لہریں اسے ہر آن شکست دینے لگیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے زہر سے نیلی پڑی ہوئی اس کی اپنی لاش پھرنے لگی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آرزوؤں، امیدوں اور ولولوں کا خاتمہ اس کسمپرسی کے عالم میں ہو گا۔ اس نے گھبرا کر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے آواز دی۔ ''کوئی میری آواز سن رہا ہے تو میری مدد کرو۔ کوئی ہے...... کوئی ہے۔ یہاں کوئی ہے......''

وہ مجنونانہ انداز میں مسلسل آوازوں پر آوازیں دینے لگا۔ ''مدد...... مدد...... میری مدد کرو۔ خدا کے لئے میری مدد کرو۔ میری آواز سنو''

وہ چلاتا رہا۔ چیختا رہا۔ اس کا شور سن کر قریبی جھاڑیوں سے ایک بلی تیزی سے نکل کر بھاگی۔ کچھ پرندوں نے پر پھڑپھڑائے۔ رات کا سناٹا بجنے لگا اور اس کی آواز کی بازگشت اسی کی طرف لوٹ لوٹ کر آنے لگی۔

لیکن کوئی ذی روح اس کی مدد کو نہیں آیا۔ کسی نے اس کی آواز کا جواب نہیں دیا۔ مایوسی نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا۔ اس پر غنودگی سی چھانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے اتنے بھاری ہو گئے کہ اسے آنکھیں کھولے رکھنے میں دقت ہونے لگی۔ وہ موت کے خوف اور آرزوؤں کے حسرت میں بدل جانے کی مایوس پتھرا دینے والی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اور وہ کسی گہرے تاریک غار میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جاتا تھا۔

بخت آور نے کھڑکی کھولی۔ تیزی سے آتی جاتی گاڑیوں کا بے ہنگم شور اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ اسے زندگی کا احساس ہوا۔ تازہ ہوا دھوئیں اور پٹرول کی ملی جلی بو کے ساتھ اندر آئی۔ اتنی بلندی سے چمکتی ہوئی سلیٹی سڑک پر اڑتی ہوئی رنگ برنگی گاڑیاں بچوں کے کھلونوں جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر راہگیر آ جا رہے تھے۔ خرید و فروخت کر رہے تھے۔ وہ زندگی کے ہنگاموں میں رچے بسے محسوس ہوتے تھے۔

بخت آور نے ایک سرد آہ بھری۔ زندگی کی اس رنگا رنگی اور ہنگاموں میں شاید اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ وہ ایک قیدی کی طرح اس کھڑکی سے باہر بہتی ہوئی زندگی کو صرف دیکھ ہی سکتی تھی۔ آگے بڑھ کر اس میں اتر نہیں سکتی تھی۔ اسے چھو نہیں سکتی تھی۔ اس میں گم نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ دن میں کئی بار اس کھڑکی کو کھولتی تھی۔ پہروں اس میں سے جھانکتی رہتی تھی۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ باہر بہتی ہوئی زندگی میں شامل ہونے کے لئے اس کھڑکی سے چھلانگ لگا دے۔ اس ان چاہی زندگی سے نجات پانے کیلئے موت کو گلے لگا لے۔ جب بھی اس کے ذہن میں یہ خیال آتا تھا تو اس کے حوصلے ہار جاتے تھے۔ اس کے اندر کہیں زندگی کی چاہت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ اسے موت سے خوف آنے لگتا تھا۔

ہوٹل کے اس کمرے سے باہر پاؤں دھرتے ہوئے بھی وہ ڈرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کو تلاش کرنے والے اس سے غافل نہیں ہوں گے۔ وہ پھر ان کے ہتھے چڑھ کر اذیت کی ٹکٹکی پر نہیں بندھنا چاہتی تھی۔ وہ اس پریشان خیالی سے نجانے ۔ نجانے پاگل سی ہونے لگی تھی۔ پھر اس کے اندر کوئی کہتا کہ شاید کسی روز سجاول اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک پہنچے گا۔ اسے عذاب سے نجات دلا دے گا۔ اسے اس جہنم سے نکال لے جائے گا۔ وہ سوچوں کے تانے بانے بنتی۔ آس کے دیئے جلاتی رہتی۔ وہ آتا اور ایک ہی پھونک سے انہیں بجھا کر

چلا جاتا اور وہ اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاتی۔

وہ روز کسی نہ کسی احمق سیٹھ، کسی بیوقوف سرمایہ دار یا نو دولتیے کو ساتھ لے آتا۔ اسے ان سے ملواتا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ اسے اپنی نئی فلم میں ہیروئن لے لیں۔ ان کی بھوکی نظریں یوں لپٹ لپٹ کر اس کا جائزہ لیتیں جیسے وہ کوئی بکاؤ مال ہو۔ وہ اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا اور انہیں مجبور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ وہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ہنسی دل لگی کر کے رخصت ہو جاتے اور پھر پلٹ کر نہ دیکھتے۔

دروازے میں چابی گھومنے کی آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ آج بے وقت آ گیا تھا۔ بخت آور نے بیزاری سے سوچا۔ اب اس کا وجود اسے کھٹکنے لگا تھا۔ اس کی موجودگی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ لحہ لحہ مرتی اور لحظہ لحظہ جلتی رہتی تھی۔

دروازہ آہستگی سے کھلا۔ بخت آور نے منہ پھیر لیا۔ وہ اس کا مکروہ چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اس کی بے رحم شکاریوں کی سی ظالم مسکراہٹ سے نفرت تھی۔ پردے کے پیچھے دروازہ بند ہونے اور لاک لگنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسی طرح کھڑکی کے قریب کھڑی رہی جیسے باہر دیکھ رہی ہو مگر در حقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

"بخت آور......!" اجنبی آواز پر بخت آور نے پلٹ کر دیکھا۔

"کون ہو تم؟" غیر ارادی طور پر ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔ اس کے سامنے ایک کم عمر سا نوجوان تھا جس کی صورت دیکھی ہوئی سی لگتی تھی۔ لیکن وہ اسے صحیح طور پر پہچانتی نہیں تھی۔

وہ اس کے سوال پر گھبرا سا گیا اور عجلت میں بولا۔ "میں شیری ہوں۔ شہریار۔"

"تم ہو کون؟ اور یہ کمرے کی چابی تمہیں کس نے دی ہے؟" بخت آور نے درشتی سے پوچھا۔

"ٹھہریں جی! ذرا آرام سے۔ مجھ پر اتنا رعب نہ ڈالیں کہ میں ڈر ہی جاؤں۔" وہ اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

بخت آور تنقیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے شک سا ہونے لگا تھا کہ اس نوجوان کو یہاں کسی منصوبے کے تحت بھیجا گیا ہے۔ شاید اسے پھر اسی دھندے کی جانب لے جایا جا رہا تھا جس سے بھاگ کر وہ یہاں آئی تھی۔ اس خیال سے اس کا سارا وجود سلگ اٹھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ خاموشی سے

سب کچھ برداشت نہیں کرے گی۔

اس نوجوان نے سر اٹھایا۔ اسے اپنی جانب گھورتے دیکھ کر وہ ہنس پڑا اور خوش طبعی سے بولا۔ "پلیز...... آپ اس طرح تو میری طرف نہ گھوریں۔ اپنا موڈ ٹھیک کریں تو میں بات کروں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" بخت آور نے درشتی سے پوچھا۔

"بھیجا تو کسی نے نہیں۔ میں خود آیا ہوں۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"کیوں؟" بخت آور نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"اس لئے۔ اس لئے کہ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ساری باتیں۔ تنہائی میں۔ اکیلے اکیلے، آپ کے پاس بیٹھ کر۔" اس نے بچوں کی طرح آنکھیں میچیں۔

"مگر تم ہو کون؟" بخت آور الجھ گئی۔

"بتایا تو ہے آپ کو کہ میں شیری ہوں۔ شہریار!" اس نے برجستہ کہا اور ہٹیلے بچوں کے سے انداز میں بولا۔ "آپ بیٹھیں تو سہی نا...... پھر میں آپ کو ساری بات سچ سچ بتا دوں گا۔ بالکل سچ سچ!"

"ہاں بولو۔ تم کیا چاہتے ہو۔" بخت آور نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے عین مقابل آن رکا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔

"کیا میں اتنا ہی برا ہوں کہ آپ چند منٹ میری بات بھی نہیں سن سکتیں۔ آپ کو کیا پتہ میں کتنی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔"

بخت آور دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور مشکوک سے لہجے میں بولی۔ "بیکار وقت ضائع نہ کرو۔ سیدھی طرح سے بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ یہ چابی تمہیں کس نے دی ہے۔ بتاؤ؟"

"یہ چابی؟" اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔ "یہ چابی تو میں نے خود بنوائی ہے۔ دیکھ لیں۔ کتنے کاریگر ہیں ہم۔"

"کیوں۔ تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی نا۔ بڑی سخت ضرورت تھی۔" اس نے سر ہلایا۔ تھوڑا توقف کیا پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے پلک جھپکتے میں بخت آور کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور پرزور لہجے میں بولا۔ "مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ سچی محبت۔ خدا

کی قسم پاک محبت۔"

بخت آور نے بیزاری کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس کے اس عجب رویئے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ اسے کہاں ملی تھی؟ اسے کہاں دیکھا تھا؟ اور وہ تھا کہ محبت کے دعوے کر رہا تھا۔ بخت آور نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ڈپٹ کر بولی۔

"تم کیا اول فول بک رہے ہو۔ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں تم جیسے لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔"

وہ اس کے سخت رویئے سے روہانسا ہو گیا۔ چند لمحے یوں منہ بسور کر کھڑا رہا جیسے کسی لاڈلے بچے کو کسی نے بلاقصور جھڑک دیا ہو۔ پھر اس نے بڑھ کر بخت آور کا آنچل تھام لیا۔

"خدا کے لئے مجھ سے نفرت نہ کریں۔ میری بات کا یقین کریں۔ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ سچی اور پاک محبت۔ مجھے تھوڑی دیر تو اپنے پاس بیٹھنے دیں۔ میں بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں۔"

بخت آور نے جھٹک کر اپنا آنچل اس کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ یہ دیکھ کر اسے قدرے حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی کہ اس سے کیسا برتاؤ کرے۔ اسے یہاں سے کس طرح باہر نکالے۔ اس کی اس بے تکی بات سے کیا مطلب نکالے۔ وہ اب بھی کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ بسورے جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

"مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ کسی کو میری پروا نہیں۔ کسی کو میری ضرورت نہیں۔ میں مر بھی جاؤں تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

بخت آور نے بے شمار چہرے دیکھے تھے۔ وہ مردوں کے انداز اور ان کی نگاہوں کے مطالبوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ لیکن اس نوجوان کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں، اس کے انداز میں ہوس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح جیسے کسی کی شکایت کر رہا تھا۔ بخت آور غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اسی طرح خود سے باتیں کرتا رہا۔ پھر بخت آور نے اسے پکارا۔

"بات سنو لڑکے! تم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ میرا دامن تو خالی ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔"

"مجھے کچھ نہیں پتہ۔" وہ بچوں کے سے ہٹیلے پن سے بولا۔

"بس مجھے نہیں پتہ آپ کچھ بھی کہیں۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ جب میں یہاں ڈیڈی کے ساتھ آیا تھا اور میں نے آپ کو دیکھا تھا تو مجھے اسی وقت آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔ وہ آپ کو اپنی فلم میں ہیروئن لے لیں مگر انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نئی ہیروئن ہیں اور عوام نئے چہرے کو مشکل سے ہی قبول کرتے ہیں۔ وہ اپنا سرمایہ ضائع نہیں کرنا چاہتے۔

"بس پھر میں نے سوچ لیا کہ میں خود آپ سے ملنے کا کوئی نہ کوئی رستہ نکالوں گا۔ میں نے چابی بنوائی پھر میں انکل کے آنے جانے کا وقت نوٹ کرتا رہا۔ اتنے دنوں کی تگ و دو کے بعد اس میں کامیاب ہوا ہوں کہ آپ کے پاس آ سکوں۔ آپ کو دیکھ سکوں۔ آپ سے بات کر سکوں لیکن آپ تو......!"

اپنے دل کی ساری باتیں وہ بڑی سادگی سے بچوں کے سے معصومانہ انداز میں کہتا جا رہا تھا۔ بخت آور کچھ حیرت، کچھ تشویش سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

دوسرے روز پھر اسی وقت دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی تو بخت آور چونک گئی۔ اس کا خیال فوراً شیری کی طرف گیا۔ یقیناً وہی اس وقت آ سکتا تھا۔ وہ پریشان تو ہوئی لیکن اس کی آمد اسے اتنی بری نہیں لگی۔ وہ بظاہر ایک بے ضرر سا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جو ہوٹل کے اس کمرے میں قید تنہائی کاٹ کاٹ کر اکتا گئی تھی۔ اسے اس لڑکے کی وجہ سے خوشگوار سی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی پژمردہ زندگی میں ہوا کے نرم سیر جھونکے کی طرح داخل ہوا تھا۔ جس سے لمحوں کے لئے ہی سہی حبس قدرے کم ہو گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چند لمحوں کیلئے قفس وا ہو گیا ہو جس سے باہر کا زندگی آمیز منظر صاف صاف نظر آنے لگا ہو۔

اس نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر جھانکا۔ پھر پلٹ کر دروازے کو بند کیا۔ پردہ برابر کر دیا اور ایک ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"ہیلو......! ہیلو......! ہیلو......!"

بخت آور بے تاثر چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ اس نے بہترین کپڑے پہن رکھے تھے۔ بال بھی بڑے سلیقے سے بنائے تھے۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑھیا سی خوشبو کمرے میں تیرنے لگی تھی۔

وہ قریب آ کر قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی مٹھی اس کی گود میں رکھ دی۔ ''بتایئے میری مٹھی میں کیا ہے؟'' اس نے بچوں کے سے چونچال پن سے پوچھا۔

''ہٹاؤ یہ کیا بچپنا ہے۔'' بخت آور نے اس کا ہاتھ پرے دھکیل دیا۔

''پلیز...... آپ کھول کر تو دیکھیں۔'' اس نے پھر اپنی بند مٹھی اس کی گود میں رکھ دی۔

''نہیں بھئی۔ تم خود ہی بتا دو۔'' بخت آور نے کوئی دلچسپی لئے بغیر کہا۔

''اف۔ آپ کتنی بور ہیں۔ تھوڑی سی کوشش تو کریں نا۔'' اس نے منت کی۔

''کھولو بھئی۔ یہ تم خواہ مخواہ کیا پراسرار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ کھولو۔'' بخت آور نے یونہی اس کی مٹھی کھلوانے کو اس کی انگلیوں کو چھوا۔

اس نے جھٹ پٹ مٹھی کھول دی۔ بخت آور نے دیکھا اس کی ہتھیلی پر ایک خوبصورت انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ ذرا سا بلند کیا اور بڑے احترام سے بولا۔ ''اسے میری طرف سے قبول کر لیجئے۔''

بخت آور نے اس کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ دیکھا جو امید وبیم کی کیفیات میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ وہ کم عمر سا لڑکا تھا۔ وہ اتنی قیمتی انگوٹھی کہاں سے لا سکتا تھا۔ ابھی وہ کچھ تذبذب میں ہی تھی کہ کیا کہے کہ وہ بول اٹھا۔

''پلیز۔ آپ اس کو پہن کر تو دیکھیں نا۔ نہیں تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''

بخت آور نے انگوٹھی ہاتھ میں لے کر دیکھی۔ اس میں قیمتی ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اس نے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو بہت قیمتی انگوٹھی ہے۔ تم نے کہاں سے لی ہے؟''

''اس بات کو چھوڑیں۔ بس آپ اس کو پہن کر دکھائیں۔ پلیز! آپ اپنے اس پیارے سے ہاتھ میں پہن لیں نا اس کو۔'' وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

''تم جہاں سے بھی یہ انگوٹھی اٹھا کر لائے ہو۔ وہاں جا کر رکھو۔ میں اسے نہیں پہن سکتی۔ سمجھے تم۔'' بخت آور نے انگوٹھی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''آپ کیا سمجھ رہی ہیں کہ میں نے یہ چوری کی ہے؟'' وہ چمک کر بولا۔ ''جناب یہ ہمارے ماں باپ کا مال ہے اور ہمیں اس پر پورا پورا حق حاصل ہے۔ میں تو آپ کیلئے پورا سیٹ خریدنا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ انکل کو کہیں پتہ نہ چل جائے۔ یہ انگوٹھی تو چھوٹی

سی چیز ہے۔ چھپ بھی سکتی ہے۔''

''نہیں بھئی۔ میں اسے نہیں لے سکتی۔ تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔'' بخت آور نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

''پلیز! آپ ایک بار پہن کر تو دکھا دیں نا۔'' اس نے التجا کی۔

''پلیز! میری خاطر...... صرف ایک بار پہن کر دکھا دیں۔ صرف ایک بار۔ پھر میں اسے لے جاؤں گا۔'' وہ اصرار کرنے لگا۔

بخت آور کو اس کے اس بچگانہ اصرار کو ٹالنا مشکل ہو گیا۔ اس نے بے دلی سے وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لی اور اسے اپنی انگلی میں پہن کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔ ''لو۔ دیکھ لو۔ بس......''

اس نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ''خوبصورت...... بہت خوبصورت۔ بس اب میں جتنی دیر یہاں ہوں نا آپ اس کو پہنے رہیں۔ خدا کے لئے اتنی بات تو مان لیں۔ آپ کا کیا چلا جائے گا اور میرا دل ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ پلیز!''

''اور اگر وہ تمہارا انکل آ گیا نا تو تمہارا سر ٹوٹنے سے نہیں بچ سکے گا۔ بس اب اٹھو اور غائب ہو جاؤ۔ اپنی یہ انگوٹھی بھی لے جاؤ۔''

''انکل......'' وہ ہنسا۔

''انکل کا علاج تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ بس ایک روز آنٹی کو لے کر یہاں آ جاؤں گا۔ پھر دیکھئے گا آپ انکل کا حشر۔ اس لئے انکل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

''کیا تمہاری آنٹی بہت خطرناک خاتون ہیں؟'' بخت آور نے پوچھا۔

''پوری ہلاکو خان ہے۔ انکل تو ان کے سامنے تھر تھر کانپتے ہیں۔ دیکھنے والی حالت ہوتی ہے ان کی۔''

''ہوں...... اگر وہ یہاں آ گئی پھر تو مجھے بھی نہیں چھوڑے گی۔'' بخت آور نے مذاقاً کہا۔

''ارے...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے دفعتاً اپنے لمبے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے۔ ''میرے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔''

وہ تقریباً ہر روز ہی آ جاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں چھپا بیٹھا ہوٹل کے اس کمرے کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ انکل جیسے ہی جاتا وہ کمرے میں چلا آتا اور اپنی بے تکی باتوں سے اسے الجھائے رکھتا۔ وہ بھی رفتہ رفتہ اس کی کچھ عادی سی ہو گئی تھی۔ ہوٹل کے بند کمرے میں جہاں زندگی سے ملنے والی ساری راہیں مسدود تھیں' اسے زندگی کی حرارت اور حسن نظر آنے لگا تھا۔ وہ دن بھر کسی قیدی کی طرح اس کمرے کی اونچی دیواروں کے بیچ گھٹ گھٹ کر مرتی رہتی تھی۔ اسے تازہ ہوا کے جھونکے کا سا احساس ہوتا تھا۔

شہریار اس کے لئے ایک خوشگوار تبدیلی اور ایک نئی امید بن کر آیا تھا۔ وہ محرومیوں کا مارا اور محبتوں کا ترسا ہوا انسان تھا۔ اس کے سرمایہ دار ماں باپ کے پاس اس کے لئے کوئی وقت نہیں تھا۔ اس کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ کسی اپنائیت کے رشتے کا ذائقہ اس نے چکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے اندر تنہائی اور اکیلے پن کا ایک صحرا سا پھیلتا چلا گیا تھا' جس میں وہ پیاسا بھٹکتا رہتا تھا۔

کسی روز وہ نہ آ پاتا تو بخت آور کو کچھ کھویا کھویا سا لگتا۔ وہ جو اکیلی اس بے رحم شخص کے رحم و کرم پر ہوٹل کے کمرے میں قید تھی۔ شہریار کی وجہ سے جیسے اسے ایک سہارا سا مل گیا تھا۔ وہ اس کے لئے جنگل میں راستہ اور صحرا میں نخلستان کی طرح سے تھا۔ پہلے وہ زندگی سے فرار حاصل کرنے اور موت کے دامن میں پناہ لینے کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ اب اس کی سوچ نے ایک نئی کروٹ بدل لی تھی۔ اب اسے اس قید سے رہائی کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ شہریار کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس کی آمد اب اس کے لئے پہلے کی طرح ناگوار نہیں رہی۔ اسی لئے وہ خوش ہو کر کہنے لگا۔

''مجھے پتہ ہے آپ میرا انتظار کرتی رہتی ہیں۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔'' بخت آور نے اسے چھیڑا۔ ''شکل دیکھی ہے تم نے اپنی۔''

''شکل...... ہاں شکل تو میں نے دیکھی ہوئی ہے۔'' وہ اترایا اور بالکل اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

''آپ بھی تھوڑی دیر دیکھئے نا۔ آپ کی قسم محبت ہو جائے گی مجھ سے۔'' اس کے مضحکہ خیز انداز پر بخت آور کو ہنسی آ گئی۔

''تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔'' وہ قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بیوقوف محبت کرنے کے لئے تو زندگی پڑی ہے۔ ابھی تم اپنا دھیان پڑھنے لکھنے کی

طرف لگاؤ۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔''

''اور یہ وقت بھی تو پھر نہیں آئے گا۔'' وہ قالین پر بیٹھ گیا اور اس کی گود میں اپنا سر رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ بڑا قیمتی وقت ہے۔ بہت قیمتی۔ آپ مجھ سے پوچھیں کہ میرے لئے یہ لمحے کتنے قیمتی، کتنے انمول ہیں۔''

بخت آور نے اس کا سر ہٹایا۔ ''اچھا۔ تم یہ باتیں بنانا بند کرو اور ٹھیک طرح سے بیٹھ کر میری ایک بات سنو۔''

''جی فرمایئے...... ارشاد۔'' وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

بخت آور نے چند لمحے سوچا کہ اسے یہ بات شہریار سے کرنی چاہئے یا نہیں۔ پھر اس نے سوچا کہ وہی تو اس کی امید تھا۔ اسے کوشش تو کرنی چاہئے تھی۔ وہ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بخت آور نے گلا صاف کیا۔

''ہاں شہریار! کیا تم میری تھوڑی سی مدد کرو گے؟''

''مدد...... صرف مدد۔ بھئی آپ تو جان بھی مانگیں تو حاضر ہے۔'' وہ گرمجوشی سے بولا۔

''نہیں بھئی۔ جان سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے تو تمہاری مدد چاہئے۔ بس تھوڑا سا تمہارا تعاون۔ باقی سب میں سنبھال لوں گی۔''

''فرمایئے۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''شہریار! میں اس قید سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے اس انکل سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

''بالکل کر سکتا ہوں۔'' وہ زوردار لہجے میں بولا۔ ''کیوں نہیں کر سکتا۔ یہ تو بات ہی کوئی نہیں۔ میری طرف سے آپ ابھی چلیں۔ اٹھیں، جلدی کریں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔'' شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں چونک گئے۔ دونوں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''یہ کون ہے؟'' شہریار نے قدرے پریشان ہو کر آہستگی سے کہا۔ ''روم سروس والے تو نہیں؟''

''نہیں...... ان لوگوں کو منع کیا ہوا ہے۔'' بخت آور نے جواب دیا۔

''تو پھر کون ہو سکتا ہے؟ کہیں انکل......'' وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''جلدی کرو۔ باتھ روم کے پچھلے دروازے سے باہر نکلو۔ جلدی کرو۔ وہ ابھی اندر آ جائے گا۔اس کے پاس چابی ہے۔''

دستک ایک بار پھر ہوئی اور پہلے کی نسبت بلند آواز میں۔ شہریار تیزی سے اٹھ کر غسلخانے میں گھس گیا۔ بخت آور نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شہریار نکل جائے اور پھر دروازے کے پاس آ کر اس نے ہینڈل گھمایا۔

اس نے پورا دروازہ کھول دیا اور درشتی سے بولا۔''کب سے دروازہ کھٹکٹا رہا تھا۔تم نے سنا نہیں۔''

''تمہارے پاس چابی جو ہوتی ہے۔تو پھر دروازہ کیوں کھٹکٹا رہے تھے۔'' بخت آور نے ناگواری سے کہا۔

''وہ میرے دوسرے کوٹ کی جیب میں رہ گئی ہے۔'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے دو تین لمبے لمبے سانس لئے۔''یہ آج کل تم پرفیوم بہت استعمال کرنے لگی ہو۔خیریت تو ہے۔''

بخت آور اندر ہی اندر کھٹک گئی۔شہریار واقعی خوشبو کا بے دریغ استعمال کرتا تھا جو اس کے جانے کے بعد بھی کمرے میں تیرتی پھرتی تھی لیکن اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اس بات کو بھی نوٹ کرے گا۔ وہ قدرے پریشان تو ہوئی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور یوں بے نیازی سے خاموش بیٹھی رہی جیسے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی ہو۔

وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔''بخت آور......! ابھی تمہارے پاس کون تھا؟''

بخت آور دھک سے رہ گئی۔لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا اور تلخ لہجے میں بولی۔''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''میں کوئی فارسی نہیں بول رہا ہوں۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ ابھی اس وقت تمہارے ساتھ کون تھا؟'' اس کا انداز بے حد درشت تھا۔

''اس قید تنہائی میں میرے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہوتا۔''

''بخت آور۔ جھوٹ مت بولو۔'' اس نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔

''سچ سچ بتاؤ یہاں کون آتا ہے؟''

''یہ سب تمہارا وہم ہے۔تمہارا شک ہے۔'' بخت آور نے ناگواری سے جواب دیا۔

''بخت آور!'' اس نے سختی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔

''جو میں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اس کا جواب دو۔ یہاں کون آتا ہے؟''

بخت آور نے جرأت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔''بہرے ہو۔تم نے میرا جواب نہیں سنا۔''

اس نے اچانک آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لئے اور اتنے زور سے کھینچے کہ اس کا سر پیچھے کو جھک گیا۔وہ غصے سے سرخ آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف گھورتا ہوا بولا۔

''بتاؤ...... یہاں کون آتا ہے؟ کون آتا ہے یہاں تمہارے پاس۔ تمہیں شریفانہ زندگی راس نہیں آئی جو تم نے یہاں بھی وہی کرتوت کرنے شروع کر دیئے ہیں؟ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

کرب و اذیت سے بخت آور کے آنسو نکل آئے۔خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے غصے سے کہا۔''چھوڑو مجھے ذلیل انسان...... چھوڑو۔ یہاں اس قید میں تمہارے سوا اور کون آتا ہے۔تم......'' اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔

اس نے یکدم اپنا کھردرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔''خاموش رہو۔تم شور مچا کر یہاں لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہتی ہو۔ اگر اب تم نے کچھ اور کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ سمجھیں تم۔'' اس نے بے دردی سے جھٹکا دے کر اسے صوفے پر پھینک دیا۔

بخت آور اذیت سے بے حال ہو گئی۔ اس کے اندر نفرت کے ابال سے اٹھنے لگے۔ وہ اس طرح اس شخص کے ہاتھوں میں بے بس ہو گئی تھی۔ اس کے رحم و کرم پر پڑی ان چاہی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ باہر قدم نکالتی تھی تو اس جیسے کتنے ہی درندے اس کی تاک میں تھے اور یہاں اس کی قید میں جینے کی اذیت ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ زندگی ختم ہوتی تھی نہ مر سکتے تھے۔

بخت آور نے طیش میں دانت پیس کر کہا۔''تم گرے ہوئے انسان ہو۔تم بے رحم ہو ظالم ہو۔ کمینے! تم ایک ہی بار مجھے مار دو۔ میں روز روز کے مرنے سے تو چھوٹ جاؤں گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ میز پر ایک پاؤں رکھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے خونخوار لہجے میں بولا۔''اگر مجھے کچھ پتہ چل گیا نا تو تمہاری خیر نہیں۔ اتنا سمجھ لینا۔'' اس نے زور سے

پاؤں زمین پر مارا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بخت آور آنسو بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

0......0......0

اگلے روز شہر یار پچھلے دروازے سے آیا اور آتے ہی بخت آور کو دونوں شانوں سے پکڑ کر گھما دیا۔ پھر اس کے بازو سے لگ کر بولا۔ ''شکر ہے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ میرے سامنے ہیں۔ اپنے تمام تر حسن جہاں سوز کے ساتھ۔''

بخت آور نے اسے پرے دھکیلا۔ ''دور ہٹو۔ کیا فضول حرکت ہے۔''

''اف اف۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کل سے آج تک کا وقت کس طرح گزارا ہے۔ مجھے بس یہی ڈر تھا کہ اگر انکل کو کوئی شک ہو گیا تو وہ آپ کو کہیں اور نہ لے جائیں۔ تو پھر میں کیا کروں گا۔ مجھ غریب کا کیا ہو گا۔''

''اپنی بکواس بند کرو بزدل کہیں کے۔ کل تم کیسا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے اور تمہارا کمینہ انکل میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔''

''اوہ خدایا۔'' وہ پریشان ہو گیا۔ ''ان کو پتہ چل گیا ہے؟''

''اور نہیں تو کیا۔ تم جو شیشی بھر کر پرفیوم انڈیل آتے ہو وہی اس کو سب کچھ بتانے کے لئے کافی ہے۔ بس اب تم آئندہ یہاں مت آنا۔ وہ کل بہت غصے میں تھا۔'' بخت آور نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

''اوہو...... انہوں نے آپ کو کچھ کہا تو نہیں؟'' وہ گھبرایا۔

''بس اب تم یہاں نہ آیا کرو۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔'' بخت آور نے سختی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں نہیں آؤں گا اور آپ ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلیں گی۔ انکل کو کیا حق ہے کہ آپ کو یہاں قیدیوں کی طرح رکھے۔ اب خواہ کچھ بھی ہو میں آپ کو یہاں سے لے کر ہی جاؤں گا۔'' وہ ایک عزم کے ساتھ قطعی لہجے میں بولا۔

''تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ کہاں لے کر جاؤ گے تم مجھے؟''

''جناب میرے پاس سب انتظام ہے۔ آپ ایک بار چلنے کی حامی تو بھریں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''کیا انتظام ہے تمہارے پاس۔ پہلے مجھے بتاؤ تو سہی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میرے لئے باہر کتنا خطرہ ہے۔ چاروں طرف میرے دشمن مجھے کس طرح سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور تمہارا یہ انکل کتنا خطرناک ہے۔''

''ہم بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہیں۔ آخر بھتیجے کس کے ہیں۔ پلیز آپ مجھ پر بھروسہ تو کریں اور پھر دیکھیں آپ کا یہ خادم کیا کمال دکھاتا ہے۔ بس اب اٹھ جائیں اتنا نہ سوچیں۔ چلیں اٹھیں۔ پلیز۔'' اس نے بخت آور کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

بخت آور سوچ میں پڑ گئی۔ کل کے واقعے نے اسے بہت دل برداشتہ کر دیا تھا اس کے اندر بغاوت سر اٹھانے لگی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شخص اس سے کوئی بڑا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنی رہائی کیلئے کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی وہ پھر ایک بار اپنا آپ داؤ پر لگانے کو تیار ہو گئی۔ اس نے غور سے شہر یار کی طرف دیکھا۔

''کیوں شیری! بعد میں تم پچھتاؤ گے تو نہیں؟''

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میرے لئے تو اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں کہ میں آپ کے کسی کام آؤں۔ بس اب آپ اور وقت ضائع نہ کریں اور جلدی سے تیار ہو جائیں۔ میں ذرا ارد گرد کا جائزہ لیتا ہوں۔'' اس نے چٹکی بجا کر کہا اور بالکونی کی طرف چلا گیا۔

0......0......0

نئی طرز کی کشادہ کالونی شاید حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ سارے گھر ایک ہی طرز کے بنے ہوئے تھے۔ بخت آور نے ٹیکسی کے شیشے میں سے باہر جھانکتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شہریار سے پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہو؟''

شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ بخت آور کو بھی احساس ہوگیا کہ اسے محتاط رہنا چاہئے۔ ٹیکسی والا ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔

اس کے دل میں ایک عجیب ہلچل سی مچی تھی۔ قید سے رہائی کی خوشی اور کھلی فضا کی خوشگواری۔ کچھ خوف، کچھ اندیشے اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ وہ تو جان ہتھیلی پر لے کر نکلی تھی۔ انجام سے بے پروا ہو کر ایک بہتر اور باعزت زندگی کی آس لے کر۔ اس کے دل کو اطمینان تھا۔ اس کے دل کو قرار تھا کہ اس نے ایک اچھی زندگی کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ آگے کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں نہ اس نے سوچا تھا' نہ سوچنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو خوف اور اندیشوں سے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ شہریار نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ اسے کہاں لے جارہا ہے۔ وہ ایک باعزت زندگی کی تلاش میں اس کے ساتھ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر چل پڑی تھی۔

ٹیکسی ابھی تک اسی علاقے کے مختلف بلاکوں میں دوڑتی جارہی تھی۔ شہریار کبھی اس کی جانب دیکھ لیتا اور کبھی ہولے سے اس کا ہاتھ چھو لیتا۔ اس کا کم عمر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے تھے کہ ٹیکسی والے نے بریک لگائے۔ بخت آور نے جھٹکے سے چونک کر سامنے دیکھا۔

چند پولیس والے سامنے کھڑے تھے۔ بخت آور کی جان پر بن گئی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ کہیں اس نے پولیس کو خبر تو نہیں کر دی۔ اگر وہ یہیں دھر لئے گئے تو...... لمحے بھر میں اس کے ذہن میں ہزاروں وسوسے پھن پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا سانس حلق

میں اٹکنے لگا۔ اس کی پیشانی پسینے میں بھیگنے لگی کسی ان دیکھے حادثے کے ڈر سے وہ نہ تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننا چاہتی تھی نہ ہی ان کی طرف دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

پولیس والوں نے ٹیکسی کے شیشے میں سے اندر جھانکا اور اکھڑ پنے سے شہریار کا نام پوچھا۔

''میرا نام قیوم ہے۔'' اس نے بڑی روانی سے بتایا۔ ''اور یہ میری باجی زرینہ ہے۔''

کہاں جارہے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ ٹیکسی کہاں سے کرائے پر لی وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے بہت سے سوالات پوچھ ڈالے۔

بخت آور سانس روکے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اسے شہریار پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور بڑے اعتماد سے ان کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔ بخت آور نے چادر سے اپنا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ انہوں نے دو ایک بار اس کی طرف دیکھا لیکن کوئی اعتراض نہیں کیا۔

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی۔ بخت آور کا رکا ہوا سانس جیسے پھر سے بحال ہو گیا۔ شہریار نے جیسے ٹیکسی ڈرائیور کو سنانے کیلئے کہا۔

''باجی! شاید یہاں کوئی واردات ہو گئی ہے جب ہی پولیس سب کو روک رہی ہے۔''

بخت آور کو ہنسی آ گئی۔ شہریار کی چالاکی پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ جسے بھولا بھالا اور سادہ سا سمجھتی تھی وہ کتنا ہوشیار تھا۔ شہریار کی اس ہوشیاری نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اسے قدرے اطمینان ہو گیا تھا کہ شہریار حالات کا مقابلہ کرنے میں اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ وہ ایک نئی زندگی شروع کرنے کیلئے اس پر اعتماد کر سکتی تھی۔

سفر لمبا تھا یا منزل کے بارے میں لاعلمی اور تذبذب کے باعث وہ کچھ طویل معلوم ہو رہا تھا۔ بخت آور آنے والے لمحوں کے بارے میں اچھی اچھی امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ اسے آزادی اور رہائی کی سنسنی خیز مسرت کا نرالا احساس گدگدا رہا تھا۔

''اس گیٹ کے اندر لے جاؤ۔'' شہریار نے ایک سرمئی گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

بخت آور کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ شہریار نہ جانے اسے کہاں لے آیا تھا۔ اس نے خوف اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سوچا اور خود کو آنے والی صورتحال کا سامنا کرنے

کے لئے تیار کرنے لگی۔

ٹیکسی پورچ میں رکی۔ تو شہر یار نے باہر نکل کر کرایہ ادا کیا۔ پھر گھوم کر دوسرے دروازے کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر بڑے ادب سے بولا۔ ''آئیے۔''

بخت آور چادر سنبھالتی ہوئی باہر آئی۔ شہر یار نے ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا اور بخت آور سے بولا۔ ''آئیے...... چلئے۔''

بخت آور نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ کوٹھی شاندار تھی۔ لان سرسبز و شاداب تھا۔ روشوں کے گرد لگے ہوئے پودے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ بیلوں اور باڑ کی باقاعدہ تراش خراش کی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوٹھی آباد ہے اور اس کی باقاعدہ دیکھ بھال ہوتی ہے۔

بخت آور کچھ ہچکچائی اور اس نے شہر یار کی طرف دیکھ کر کہا۔

''شیری! یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟''

''آ جایئے نا۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔'' اس نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

بخت آور بھی دو ایک سیڑھیاں پھلانگ کر اس کے برابر آ گئی۔

''شیری! کچھ بتاؤ تو سہی نا کہ یہاں کون لوگ رہتے ہیں۔ تم انہیں میرے بارے میں کیا بتاؤ گے۔''

''اوہو۔ بھئی کیوں پریشان ہوتی ہیں آپ۔'' شہر یار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ یہاں سب اپنے ہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' بخت آور نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''تم مجھے سیدھی طرح سے بتاؤ کہ یہ کس کا گھر ہے؟ آخر تم میرا تعارف کس حوالے سے کراؤ گے۔ کچھ مجھے بتاؤ تو سہی نا۔ مجھے تو سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

''آپ تو ایسے ہی گھبرا جاتی ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''یہ خاکسار احمق سہی مگر اتنا بھی نہیں کہ آپ کو کسی ایسی ویسی جگہ لے جائے۔ آپ سے کہا ہے نا کہ یہاں سب اپنے ہی ہیں۔ فکر والی کوئی بات نہیں۔''

بخت آور نے اپنی چادر سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا اور بند دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے چہروں کا سامنا کرنے کیلئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔

شہر یار نے گھنٹی پر انگلی رکھی۔ ایک بار...... دو بار...... تین بار۔ اس نے مسلسل تین لمبی گھنٹیاں بجائیں۔

''شیری یہ تم ہو۔'' کسی مردانہ آواز نے پوچھا۔

بخت آور نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ آواز انٹرکام سے آئی تھی۔ شہر یار نے جواباً اپنا نام بتایا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے کی آواز یوں سنائی دی جیسے کسی خودکار نظام کے ذریعے سے دروازہ کھولا گیا ہو۔

''آئیے۔ میڈم ہمارے غریب خانہ کو رونق بخشیے۔'' شہر یار نے دروازہ کھول کر پورے آداب کے ساتھ کہا۔

بخت آور اس کے ساتھ ہی ایک وسیع راہداری میں داخل ہوئی جس میں کئی دروازوں کی موجودگی بتا رہی تھی کہ کوٹھی کافی بڑی تھی۔ راہداری کے آخری سرے پر جا کر شہر یار نے ایک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول دیا۔

* * *

''اے...... اے...... آنکھیں کھولو۔ اے ے ے! آنکھیں کھول اٹھ جا۔ ارے اٹھ......!''

سجاول کے کانوں میں ایک مہین سی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت دور سے پکار رہا ہے۔ یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ یا محض اس کا خیال ہی اسے آواز بن کر سنائی دے رہا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی بات، کوئی یاد، کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ اسے وقت کا، حالات کا، گرد و پیش کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا؟ ذہن پر جما ہوا خوف اسے آنکھیں بھی نہیں کھولنے دیتا تھا کہ نہ جانے کون سا منظر پیش نگاہ ہو؟ نہ جانے حالات کیسے ہوں؟

''اٹھ...... اٹھ، آنکھیں کھول۔'' اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔ اسے اپنی آنکھوں اور رخساروں پر ملائم سے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا پھر وہی لمس اس کے بالوں سے الجھا۔ پھر انہی ہاتھوں نے اس کے بالوں سے مٹھیاں بھر لیں۔

''اے...... اے اٹھ۔'' اسے پھر وہی ملائم آواز سنائی دی۔ اسے بالوں میں ہلکا سا کھچاؤ محسوس ہوا۔ رفتہ رفتہ اس کا ذہن کام کرنے کے قابل ہوا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ سارا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اور پھر وہ شاید

بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے یہ یقین کرنے کو کہ وہ زندہ ہے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

دھوئیں سے اٹی ہوئی کچھ دیواریں اور سرکنڈوں سے بنی ہوئی بے ہنگم چھت اس کی نگاہوں سے ٹکرائی۔

''اب اٹھو بھی نا۔ تم کب سے سو رہے ہو۔'' پھر اسی نرم آواز نے کہا۔ سجاول نے آواز کی سمت دیکھا۔ اسے حیرت کے ساتھ ایک موہوم سی تازگی اور خوشگواری کا احساس ہوا۔ ایک پھولے پھولے گالوں والی سانولی سی ننھی منی بچی اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں کے قریب دو چھوٹی چھوٹی چوٹیاں لٹک رہی تھیں اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ جلدی سے بولا۔

''توبہ...... تم کتنا سوتے ہو۔ اب بس کرو نا۔ اب نہ سونا۔ اگر تم نہ جاگے تو تم مر جاؤ گے۔ اچھا۔''

سجاول نے تیز نظر سے چاروں طرف دیکھا کہ کمرے میں اس بچی کے علاوہ اور کون ہے؟ لیکن وہ کوٹھڑی نما نیم تاریک کمرہ خالی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس ننھی سی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

''تم کون ہو؟''

''میں چھیمو ہوں۔'' اس نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''بابا۔'' وہ بولی۔

''بابا...... کون بابا؟''

''میرا بابا۔'' اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر معصومیت سے کہا۔

''بابا؟ بابا تمہارا کیا لگتا ہے۔'' سجاول نے اس کے بارے میں مزید جاننے کیلئے استفسار کیا۔

''بابا...... میرا بابا لگتا ہے۔'' بھولا بھالا سا جواب ملا۔

''تم اس کی کیا لگتی ہو؟'' سجاول نے الٹ کر بات پوچھنی چاہی۔

''میں اس کی چھیمو لگتی ہوں۔'' اس نے بھولپن سے برجستہ کہا۔ تو سجاول کو ہنسی آ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ بچے کتنے سادہ اور انجان ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے سب

سے زیادہ سکھی، مگن اور مطمئن بھی۔ اپنی چھوٹی سی محدود دنیا میں محو۔ بچی نے اسے ہنستے ہوئے دیکھا تو خود بھی ہنس پڑی اور چہکتی ہوئی بولی۔

''شکر ہے جو تم جاگے ہو۔ بابا کہتا تھا کہ اگر تم نہ جاگے تو تم مر جاؤ گے۔ سچی مچی مر جاؤ گے۔''

سجاول کو سب کچھ یاد تھا لیکن بچی سے حالات جاننے کو اس نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''اچھا؟ کیوں مجھے کیا ہوا تھا؟''

''ہا...... تمہیں تو یاد ہی نہیں۔'' چھیمو نے بچگانہ تحیر سے کہا۔ ''تمہیں تو سانپ نے کاٹا تھا۔ میرا بابا سانپ کے زہر کا توڑ جانتا ہے۔ اس کے پاس منکا ہے۔ اس نے تیرے پیر پر منکا پھیرا تھا۔ نہیں تو تو نے نہیں بچنا تھا۔''

سجاول نے غیر ارادی طور پر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اس کے انگوٹھے پر پٹی بندھی تھی۔ اسے تاریکی میں ڈوبا ہوا وہ ہولناک منظر ایک بار پھر یاد آ گیا جب زندگی کی آس دم توڑ رہی تھی۔

اس کا دل اس شخص کے لئے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو گیا جس نے زندگی ایسی قیمتی شے اسے لوٹا دی تھی۔ اس نے بچی سے پوچھا کہ اس کا بابا کہاں ہے۔

''وہ قبروں پر پانی ڈالنے گیا ہے۔'' چھیمو نے بتایا۔

سجاول کو اطمینان ہو گیا کہ وہ قبرستان ہی میں گورکن کی کٹیا میں پڑا ہے۔ لیکن اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے۔ یقیناً اس بچی کے والدین بھی یہیں رہتے ہوں گے۔ یہی جاننے کو اس نے بچی سے پوچھ لیا۔ اس نے سینے پر ننھا سا ہاتھ رکھا۔

''صرف میں اور میرا بابا۔''

سجاول کو قدرے اطمینان ہوا کہ اسے یہاں فی الفور کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کچھ روز یہاں گزار سکتا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ اس کے حلق میں کڑواہٹ سی گھلی ہوئی تھی۔ اس نے سارے کمرے میں نظر دوڑائی کہ کہیں اسے کوئی پانی کا گھڑا وغیرہ نظر آ جائے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اسے چھوٹی سی بچی سے اپنے لئے پانی منگواتے ہوئے جھجک سی ہو رہی تھی۔ مجبوراً اسے چھیمو سے کہنا ہی پڑا۔

''چھیمو ذرا ایک گلاس پانی تو لا دے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔''

"اچھا۔" وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔

"بابا کہتا تھا کہ اگر تمہیں ہوش آ جائے تو تمہیں ایک کٹورہ دودھ کا دے دوں۔"

"دودھ۔" سجاول نے دہرایا۔

"دودھ ہوگا گھر میں؟"

"سندری ہے نا۔ ایک پیالہ دودھ تو دے ہی دے گی۔" چھیمو نے جوش سے کہا اور اپنی چھوٹی سی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی کوٹھڑی سے باہر نکل گئی۔ سجاول وہیں چٹائی پر بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔

چھیمو نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ دس پندرہ منٹ میں ہی دودھ کا کٹورہ ہاتھ میں لئے کمرے میں موجود تھی۔

"واہ چھیمو۔ تو تو بڑی ہوشیار ہے۔ اتنے بہت سے کام تو اکیلے ہی کر لیتی ہے۔"

سجاول نے کٹورہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اپنی تعریف سن کر وہ خوش ہوئی اور شرما کر اس نے اپنا سانولا چہرہ اپنے شانوں پر جھکا لیا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولی۔ "چاچا شکر ختم ہوگئی ہے۔ دودھ پھیکا ہے۔"

سجاول کو اس کے ننھے منے ہونٹوں سے اپنے لئے چاچا کا لفظ بے حد انوکھا لگا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں ہی رشتوں اور محبتوں سے اس طرح محروم ہوگیا تھا کہ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اپنی ذات کے ساتھ کوئی رشتہ جوڑ لینے سے جذبوں کا رنگ کس طرح نکھر جاتا ہے۔ دل میں کیسی گرم جوشی اور محبت کسی قدرتی چشمے کی طرح پھوٹنے لگتی ہے۔

معصوم سی چھیمو کے ہونٹوں سے پھوٹنے والا لفظ پیار اور سچائی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بغیر لالچ، بغیر کسی طلب کے اسے یہ رشتہ دے رہی تھی۔ اس نے دودھ کا کٹورہ اس کے ہاتھ سے یوں لے لیا جیسے وہ اسے کوئی خزانہ بخش رہی ہو۔ اسے دودھ کبھی اتنا خوش ذائقہ اور شیریں محسوس نہیں ہوا تھا۔ جتنا اس وقت محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں کٹورہ خالی کر دیا اور آستین سے منہ پونچھتے ہوئے اس نے کٹورہ اس کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ اپنی چمکیلی سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"چاچا...... اور لاؤں۔"

سجاول کو اس پر پیار سا آ گیا۔ وہ چھوٹی سی تھی لیکن اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی

طلب مٹی نہیں تھی۔ اس نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا اور محبت سے بولا۔

"کچھ اپنے بابا کیلئے بھی تو دودھ رکھ لے کہ سارا مجھے ہی پلا دے گی۔"

"کوئی بات نہیں چاچا۔ بابا چائے پی لے گا۔" اس نے جلدی سے کہا اور فوراً مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

سجاول بھی چٹائی سے اٹھا اور اس نے اس بے سروسامان بے ڈھنگے کمرے کا جائزہ لیا۔ جہاں ایک دو ٹین کے بکسوں اور چند برتنوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چھیمو تب تک دودھ سے بھرا کٹورہ پھر لے آئی۔ سجاول نے دودھ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کھڑے کھڑے ہی پینے لگا۔

چھیمو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مہین سی آواز میں بولی۔ "چاچا۔ بابا کہتا ہے دودھ اور پانی بیٹھ کر پیتے ہیں۔ تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا۔"

سجاول نے مسکرا کر پیالہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ "چھیمو۔ تمہارا بابا ٹھیک کہتا ہے۔ پر میں بیٹھ بیٹھ کر تھک گیا ہوں اس لئے کھڑا ہوگیا تھا۔ اچھا اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا بابا کب آئے گا۔ یا میں اسے قبرستان میں جا کر دیکھوں۔"

"وہ مغرب کی اذانوں کے وقت آتا ہے۔ پھر آ کر نماز پڑھتا ہے۔ میں روٹی پکاتی ہوں وہ کھاتا ہے۔" اس نے روانی سے بتایا۔

سجاول نے اس کے ننھے منے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی چھوٹی اور معصوم تھی۔ اس کے تو ابھی گڑیاں کھیلنے کے دن تھے کہ وہ گھرداری کے تھکا دینے والے دھندوں میں الجھ گئی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"چھیمو۔ آج میں بھی یہاں روٹی کھاؤں گا۔ تم اتنی ساری روٹیاں پکا لوگی؟"

"ہاں چاچا! میں پکا لوں گی۔ جب بھی بابا کے پاس کوئی مہمان آتا ہے تو ساری روٹیاں میں آپ پکاتی ہوں۔" اس نے بڑے جوش سے بتلایا۔

"او چھیمو...... او چھیمو...... دیکھنا۔ سندری نے رسی تڑا لی ہے۔ دیکھ دیکھ۔ ادھر آ۔"

دور سے کسی نے پکارا تو وہ چونک گئی۔ "ہائے میں مرگئی۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کسی عمر رسیدہ عورت کی طرح کہا۔ "یہ موت جوگی سندری تو کہیں ٹکتی ہی نہیں۔ پھر رسی تڑا بیٹھی ہے۔"

سجاول کو اس کی حرکتوں پر ہنسی آ گئی۔ اس نے دروازے سے اسے دوڑ کر نکلتے ہوئے

دیکھا اور سوچا کہ اس کا بابا آ گیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو اس سے ملنے کے لئے تیار کرنے لگا۔ اس کی بلغمی کھانسی کی آواز اور اس کے قدموں کی چاپ اسی کوٹھڑی کی جانب چلی آ رہی تھی۔ سجاول نے سنبھل کر دروازے کی طرف دیکھا۔

پھر جھکی ہوئی کمر اور بے ترتیب کھچڑی داڑھی والے بوڑھے نے کوٹھڑی میں سر ابھارا اور چندھی چندھی سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ سجاول نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور تعظیما جھک کر اس کے پیروں اور گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

بوڑھا اس کے اس تپاک اور تعظیم سے متاثر ہوا اور اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''سنا پتر۔ اب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟''

''ہاں بابا! تمہاری بڑی مہربانی۔ تم نے تو مجھے نئی زندگی دے دی۔''

''خدا کا شکر کر پتر! جس نے تجھے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ وہ سانپ تھا بڑا زہریلا۔ تیری تو قسمت اچھی تھی۔'' اس نے سر سے صافہ اتارتے، چٹائی کو گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ لگاتے اور لالٹین جلا کر اس کی لو مدھم کرتے ہوئے رک رک کر کہا۔

''ہاں بابا! حق ہے۔ اللہ کو منظور نہ ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

سجاول نے ایک طویل سانس کھینچی اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ بابا بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس سے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کدھر جانا چاہتا ہے۔ سجاول اس کی باتوں کے مناسب جواب دیتا رہا۔ پھر باتوں باتوں میں اس نے اسے یہ بھی دیا کہ وہ تلاش معاش کے سلسلے میں گاؤں گاؤں بھٹکتا پھرتا ہے۔ جہاں چار پیسے کی مزدوری جاتی ہے۔ وہیں کا ہو رہتا ہے۔ اگر وہ برا نہ مانے تو وہ کچھ روز اس کے یہاں قیام کر لے۔

بابا نے ایسی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو اسے اپنے دل میں جھانکتی ہوئی محسوس ہوئیں اور نپے تلے لہجے میں بولا۔ ''دیکھ جوان میں غریب آدمی ہوں۔ نہ کسی سے لینا نہ دینا۔ یہاں پر اکیلا پڑا ہوں۔ نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ تو نے اگر یہاں رہنا ہے تو سمجھ کر چلنا۔'' اس کے انداز میں واضح تنبیہ اور تشویش تھی۔

سجاول اسے مطمئن کرنے کیلئے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جھیمو ہانپتی ہوئی اپنی اوڑھنی سنبھالتی کمرے میں آئی۔ ''بابا...... سندری بڑی شیطان ہو گئی ہے۔ اس نے مجھے بہت دوڑایا ہے۔ ہاتھ ہی نہیں آتی تھی۔ بابا اس کی رسی بہت پرانی ہو گئی ہے تو اس کیلئے سنگلی لا دے نا۔'' اس نے پیشانی سے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے اپنا تمتمایا ہوا چہرہ اوڑھنی سے پونچھا۔

''اچھا...... اچھا لا دوں گا۔'' بوڑھے نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''چل تو ذرا آگے جا کر چلم تو بھر دے۔ روٹی بھی پکا دے۔''

جھیمو روٹی پکانے کے لئے کمرے سے باہر چلی گئی تو سجاول اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا کہ جھیمو کی ماں کدھر ہے جو اسے اتنی چھوٹی سی عمر میں گھر بار کے دھندے سنبھالنے پڑ گئے ہیں۔

بوڑھے نے ایک آہ بھری اور اس کا اداس چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور انگلی سے اشارہ کر کے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مرضی...... اس اوپر والے کی مرضی...... مرضی اس نیلی چھتری والے کی مرضی۔ یہی لفظ بار بار دوہراتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور جیسے اپنے آپ ہی سے باتیں کرتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں سے کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

0......0......0

اگلی صبح وہ بیدار ہوا تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ سیاہ دیواروں والی نیم تاریک کوٹھڑی کو بھی اس کی چمکیلی سیاہ کرنوں نے اجلا کر دیا تھا۔ رات وہ بڑی دیر تک جاگتا رہا تھا۔ بیداری کے ان بیکل لمحوں میں وہ اپنے ہی گورکھ دھندوں میں الجھا رہا تھا۔ یہ خوف اس کے اندر کسی جونک کی طرح چمٹا اس کا لہو چوس رہا تھا کہ ملاں اس کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے پر سکون سے نہیں بیٹھا ہو گا۔ اسے یہاں چند روز کیلئے پناہ تو مل گئی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک عارضی ٹھکانہ تھا۔ وہ یہاں کچھ روز ٹھہر کر رانی کی زندگی سے دکھوں کا سایہ دور ہٹانا چاہتا تھا۔ وہ استانی سے مل کر اسے مجبور کر دینا چاہتا تھا کہ وہ رانی کی زندگی میں زہر نہ گھولے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے اس مقصد کی طرف متوجہ ہو جانا چاہتا تھا۔ جس کے لئے اس نے زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی۔ اسے بھاگ بھری کو تلاش کرنا تھا۔ اس کے بعد خواہ وہ پھانسی چڑھ جاتا یا جیل کی سلاخیں اسے نگل لیتیں۔

وہ اپنے بستر سے اٹھا اور گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالی۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بابا بوڑھا گورکن اٹھ کر کسی کام دھندے سے لگ گیا تھا۔ اس چھوٹی سی چہکتی ہوئی چڑیا کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا تو اسے برآمدے میں برتن مانجھتے ہوئے دیکھا۔

''چاچا سلام۔'' اس نے گرمجوشی سے کہا۔

سجاول کو اس کے اپنائیت بھرے انداز نے تروتازہ کر دیا۔ وہ اس کے برابر ہی زمین پر بیٹھ گیا اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''چھیمو تو ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کتنے بڑے بڑے کام کرتی ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک شرمائی سی مسکراہٹ آئی اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس نے یہ بات کبھی نہ سنی ہو۔

''میرا دل چاہتا ہے چھیمو کہ میں تمہارے سارے کام کر دیا کروں۔ یہ برتن مانجھ دوں۔ ہانڈی پکا دوں۔ روٹیاں پکا دوں اور تم گڑیوں سے کھیلو۔ تم کیڑی کاڈا، پٹھوگول گرم، کوکلا چھپا کی کھیلو اور خوب مزے کرو۔''

''پر چاچا۔ میں کس کے ساتھ کھیلوں۔ میری تو کوئی سہیلی نہیں۔'' اس نے منہ سوکھا کر کہا۔ ''چاچا یہاں کوئی لڑکی مجھ سے نہیں بولتی۔ کوئی میری سہیلی ہی نہیں بنتی۔ سب کہتی ہیں یہ قبروں والے کی بیٹی ہے۔'' اس کی معصوم آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

سجاول کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس ننھی سی لڑکی کے بچپن کے دن ہمجولیوں کے بغیر کتنے تنہا اور بے رنگ تھے۔ وہ ماں اور باپ کے سائے سے خالی زندگی کی اذیت بغیر کوئی شکوہ کیے کتنے صبر سے جھیل رہی تھی۔ وہ آبادی سے، زندگی کے گوناگوں ہنگاموں سے، نت نئی آوازوں سے بہت دور یہاں اس شہر خموشاں میں پڑی تھی۔ سجاول اسے اس کی تنہائی کا احساس دلا کر اسے دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس ننھی سی معصوم جان کے لئے اس کی گوارا زندگی کو تلخ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بات بدل دی اور خوش دلی سے بولا۔ ''چھیمو۔ میں جو تیرا چاچا تیرے پاس آ گیا ہوں۔ میں تجھ سے کھیلا کروں گا۔''

''سچی چاچا۔'' چھیمو نے خوشی سے اپنی آنکھیں جھپکیں۔

''سچی مچی۔'' سجاول نے اس کے بالوں پر ہلکی سی چپت لگائی۔ اسے اپنا آپ بے حد ہلکا پھلکا اور کچھ بدلا بدلا سا معلوم ہوا۔ اس کے منہ کا مزہ جو ہمیشہ کڑوا اور تلخ رہتا تھا اس میں یک بیک شیرینی گھل گئی۔

چھیمو نے برتن دھو کر ایک طرف کھسکا دیئے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ چھیمو نے اٹھ کر کمرے میں لٹکتے ہوئے چھینکے میں سے روٹی نکالی اور اسے پکارا۔ ''آ جا چاچا روٹی کھا لے۔''

سجاول اندر آ کر چٹائی پر بیٹھ گیا جہاں چھیمو نے اس کے لئے روٹی اور گڑ ایک چنگیر

میں رکھ دیا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے باہر نکلا تو چھیمو پیڑھی پر بیٹھی دال صاف کر رہی تھی۔ اس کی آہٹ سنی تو اس نے سر اٹھایا۔

''چاچا...... کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی کوئی بزرگ ہو۔

''ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ جلدی آ جاؤں گا۔'' اس نے مسکرا کر بے حد نرمی سے کہا اور اس سے پوچھا کہ بابا کہاں ہے۔

''اپنی کیاری پر گیا ہے۔ گوڈی کرنے۔ پچھواڑے بابا نے سبزیاں اگائی ہوئی ہیں۔'' وہ تفصیل سے بتانے لگی۔

سجاول نے اسے خدا حافظ کہا اور ابھی اس نے برآمدے سے باہر پاؤں ہی دھرا تھا کہ چھیمو نے عقب سے چلا کر کہا۔ ''چاچا! دیر نہ لگانا جلدی آ جانا۔''

سجاول مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا اس کا یہ اپنائیت بھرا انداز اس کے دل میں اتر گیا۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا اور پلٹ کر اس کے قریب آیا اور اس کے برابر جھک کر بولا۔

''تو فکر نہ کر چھیمو۔ میں جلدی آ جاؤں گا اور تیرے ہاتھ کی پکی روٹی کھاؤں گا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگے۔ سجاول نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل کھڑا ہوا۔

۞......۞......۞

استانی کا دروازہ آج بھی بند تھا۔ نہ جانے وہ کہاں گئی ہوئی تھی جواب تک نہیں لوٹی تھی۔ اس نے ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی کو اس کے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ سجاول کو بڑی مایوسی ہوئی۔ آج کا دن بھی بیکار چلا گیا تھا۔ نا معلوم وہ آج واپس آتی بھی تھی یا نہیں۔

اس کے پاس مہلت کم تھی اور اس کے ذمے بہت سے کام تھے۔ وہ جلد سے جلد اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ آج اسے شہر چلا جانا چاہئے کہ وہاں کسی سے بھاگ بھری کے بارے میں کچھ معلوم کر سکے۔ کچھ لوگوں سے شہر میں اس کی شناسائی بھی تھی۔ مگر ان سے ملنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ملاں کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیں گے۔

وہ بے خیالی میں ایک رستے پر یوں ہی چلتا چلا گیا جو شہر کی طرف جانے کے بجائے کسی اگلے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ' لمبی لمبی گھاس اور ہرے بھرے کھیت نظر آ رہے تھے۔ یکایک اس کی نگاہ ایک شکستہ سے مکان پر پڑی۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہاں آبادی سے دور اس علاقے میں کون رہتا تھا۔ یا شاید وہ کوئی ویران مکان تھا۔ دور سے ایک شکستہ سی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔

بجلی کی سی سرعت سے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اگر آبادی سے دور یہ مکان خالی اور ویران تھا تو وہ یہاں بھی اپنا ٹھکانہ بنا سکتا تھا۔ اگر قبرستان میں اسے کوئی خطرہ ہوا تو وہ یہاں پناہ لے سکتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ اس شکستہ چار دیواری کی سمت چل پڑا۔

لمبی لمبی گھاس اور سرکنڈوں میں راستہ بناتا وہ آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ مکان کی کئی دیواریں گری ہوئی تھیں اور جو کمرے کھڑے تھے ان کی حالت بھی اتنی خستہ تھی کہ ایک زوردار بارش بھی نہ سہہ سکیں۔ دروازے جیسے چوکھٹ کے سہارے کھڑے تھے جن پر کائی جمی

ہوئی تھی۔ دہلیز کے ساتھ ساتھ گھاس اگ آئی تھی۔

سجاول نے اندازہ لگانے کو کہ دروازہ کھلا ہے کواڑ کو ہلکا سا دھکا دیا تو دروازہ ڈولتا ہوا ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ وا ہو گیا۔ آگے ویران سا صحن تھا۔ جہاں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اردگرد کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی جس سے اندازہ ہو سکتا کہ یہاں کوئی رہتا ہے۔

صحن کو پار کر کے وہ اس دروازے تک پہنچا جو بند معلوم ہوتا تھا۔ اس نے قریب جا کر اسے دھکا دیا لیکن وہ کھلا نہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔ سجاول ٹھٹک گیا۔ یقیناً اندر کوئی موجود تھا۔ اسے لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ لیکن اب وہ خطرہ مول لے چکا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

''یہاں کوئی ہے؟ میں مسافر ہوں۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ دو گھونٹ پانی پلا دو۔''

اس کی دستک کا کوئی جواب نہیں آیا لیکن اندر سے کچھ ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی وہاں موجود ہے۔ سجاول نے اس مرتبہ ذرا زور سے دستک دی اور پکار کر کہا۔ ''کوئی ہے تو دروازہ کھولو۔'' اس کی دستک سے بوسیدہ کواڑ زور سے ہلا، کنڈی شاید ڈھیلی تھی جو جھٹکا لگنے سے گر گئی اور کواڑ وا ہو گئے۔ سجاول نے اندر جھانکا۔

یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ وہ کمرہ چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ چولہے کے قریب میلے کپڑوں میں ایک عورت بیٹھی کوئی کام کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حیرت اور پریشانی میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی اور وحشت زدہ آنکھوں سے اس کی طرف ٹکر ٹکر تکتی رہ گئی۔

سجاول نے اس کی تسلی کیلئے جلدی سے کہا۔ ''بہن۔ مجھ سے ڈرو مت میں مسافر ہوں۔ پانی کے دو گھونٹ ہوں تو پلا دو۔ بڑی پیاس لگی ہے۔''

اس عورت کی آنکھوں کی وحشت کم نہیں ہوئی۔ اس نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے گھڑے کی طرف اشارہ کیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ سجاول نے آگے بڑھ کر گھڑے سے پانی انڈیل کر پیا۔ گھڑے کا ٹھنڈا پانی فرحت بخش تھا۔ اسے تازگی کا احساس ہوا اس نے کٹورہ گھڑے پر ڈھک دیا اور ایک نگاہ اس عورت پر ڈالی۔

وہ سیدھی سادی جوان دیہاتی عورت تھی۔ جس کے چہرے پر خوف اور پریشانی لکھی ہوئی تھی۔ وہ سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سجاول کو وہ عورت مصیبت زدہ سی معلوم

ہوئی جو نہ جانے کیوں آبادی سے دور یہاں تنہا رہنے پر مجبور تھی۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ اور کون رہتا تھا؟ وہ ڈری ہوئی سی کھڑی چور نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سجاول نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ ''بہن تو یہاں اکیلی رہتی ہے یا تیرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔''

اس نے گردن جھکا لی اور سر کو ایک مبہم سی جنبش دی جس سے سجاول کو کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بولنے سے ڈرتی ہے۔ سجاول نے پھر ہمدردی سے کہا۔ ''بہن تو مجھے پریشان لگتی ہے۔ کیا بات ہے؟ اس ویرانے میں اکیلی کیوں پڑی ہے؟ کوئی تیری خیر خبر لینے والا ہے یا نہیں؟''

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور سوالیہ سی نگاہ اس پر ڈالی یوں جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ چلا کیوں نہیں جاتا۔ سجاول کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کی موجودگی سے گھبرا رہی ہے۔ لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ جانے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی خیال سے اس نے ایک بار پھر پوچھا۔

''بہن یہاں تیرے ساتھ اور کون رہتا ہے۔ کوئی مرد بھی ہے۔''

عورت نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پھر ایک بے چین سی نظر اس پر ڈالی۔ سجاول کو محسوس ہوا جیسے وہ گونگی ہے۔

مگر وہ بہری نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی باتیں سن اور سمجھ رہی ہے۔ لیکن کوئی خوف اسے جواب دینے، بات کرنے سے روک رہا تھا۔ سجاول نے پھر ایک بار اپنی بات دہرائی اور اس سے پوچھا کہ وہ جواب کیوں نہیں دیتی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے اسے چلا جانے کیلئے کہہ رہی ہو۔ سجاول کو تشویش ہوئی۔ اس نے اشارے سے اس سے پوچھا کہ کیا وہ گونگی ہے۔

وہ کچھ اور پریشان ہو گئی۔ اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا پھر اسے اثبات میں جنبش دینے لگی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے پھر اسے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے خوف تھا کہ کوئی آ نہ جائے۔

سجاول کو اس پر بے حد ترس آیا۔ وہ نہ جانے کون تھی اور کن حالات میں گھری ہوئی تھی۔ اسے اس کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ اس مصیبت زدہ، پریشان

حال عورت کو تسلی اور اطمینان کیلئے کچھ کہے۔ اس کا حوصلہ بڑھائے، اس کا خوف دور کرے۔

غیر ارادی طور پر اس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پورے خلوص اور سچائی سے بولا۔

''دیکھ بہن! مجھے اپنا بھائی سمجھ۔ اگر کوئی دکھ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتا میں تیری مدد کروں گا۔''

وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو تیزی کے ساتھ اس کے سانولے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ اس کے لب یوں لرزے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن پھر اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا اور اوڑھنی سے بہتے ہوئے آنسو خشک کرنے لگی۔ سجاول کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں بولی۔

اس کے چہرے پر خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اور وہ پریشان نظروں سے اس کی طرف یوں دیکھتی تھی جیسے اس کی موجودگی سے بے حد پریشان ہو۔

سجاول بھی ان ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ اس کے دکھوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کس مجبوری نے اس کے ہونٹوں پر تالے ڈال دیئے تھے۔ وہ اس کی مجبوریوں کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے پھر ایک بار اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور اس ویرانے سے باہر نکل آیا۔

۞......۞......۞

وہ جذبات کی شدت میں ڈوبتا ابھرتا، لمبی لمبی گھاس میں سے راستہ بناتا جگہ جگہ گری ہوئی چار دیواری میں سے باہر نکلا ہی چاہتا تھا کہ یکا یک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے یہاں سے جانا نہیں چاہئے۔ یہ مصیبت زدہ عورت یہاں تنہا نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً یہاں کوئی اور بھی رہتا یا آتا جاتا تھا۔ اسے معلوم کرنا چاہئے تھا کہ یہاں اس کے ساتھ کون رہتا تھا؟ یا کس نے اسے یہاں قید کر رکھا تھا؟ عورت کی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کہیں سے اغواء کر کے لایا گیا ہے۔ اور یہاں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے متلاشی نگاہوں سے گردو پیش دیکھا کہ کہیں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں چھپ کر وہ اس شکستہ مکان کی نگرانی کر سکے۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور گھوم کر مکان کے پچھواڑے پہنچا۔ اس طرف لمبی لمبی گھاس جھاڑیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ شاید اس لئے کہ یہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔

اس طرف بھی ٹوٹی ہوئی دیواروں اور ادھ گری چھتوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ لمبی لمبی گھاس میں ڈر ڈر کر قدم رکھتا چاروں طرف دیکھنے لگا کہ اسے کہیں چھپنے کی محفوظ جگہ مل جائے۔ اچانک ٹوٹی ہوئی شہتیریوں اور بکھرے ہوئے سرکنڈوں کے درمیان اسے ایک روشن دان نظر آیا۔

وہ بکھرے ہوئے ملبے میں سے راستہ بناتا اس طرف بڑھا کہ شاید وہاں سے اندر کا کوئی منظر نظر آتا ہو۔ پانی کے بہاؤ سے مٹی جمع ہو جانے کے باعث زمین کافی اونچی ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی روشندان اس کے قد سے زیادہ بلند تھا۔ سجاول نے ایک بڑا پتھر گھسیٹ کر دیوار سے لگایا اور اس پر پتھر کی ایک سل رکھی۔ مضبوطی سے اس پر پاؤں جماتے ہوئے اس نے روشندان کے رستے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ روشندان سے کمرے کا سارا منظر صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

سجاول نے وہیں پتھر پر کھڑے کھڑے اپنے عقب میں دیکھا۔ اس کے پیچھے شہتیر اور ادھ گری چھت تھی۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے کسی آدمی کی نظر اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اسے قدرے تسلی ہوئی۔ وہ اس جگہ چھپ کر اس گھر کی نگرانی کر سکتا تھا۔ اس عورت کے دکھوں کا راز جان سکتا تھا۔

اس نے روشندان کے رستے پھر ایک بار کمرے میں جھانکا۔ اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ نیم تاریک کمرے میں وہی گونگی عورت بیکلی سے چکر کاٹ رہی تھی۔ وہ بار بار ہاتھ ملتی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی ہلکی سی سسکاری بھی اس تک آ جاتی تھی۔

پھر وہ کمرے کے دوسرے کونے کی طرف گئی۔ جو ترچھا ہونے کی وجہ سے سجاول کی نگاہوں کی پہنچ سے دور تھا۔ اسی لئے وہ چند لمحوں کیلئے سجاول کی نگاہوں سے اوجھل رہی۔ لیکن اس جانب سے ایسی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی ٹین کا بکس کھول رہی ہے۔ ان آوازوں کو سن کر سجاول کو یقین ہو گیا کہ وہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو کو بھی سننے میں کامیاب ہو جائے گا۔

وہ متجسس نگاہوں سے کمرے کے اس جانب تکتا رہا جہاں وہ عورت نہ جانے کیا چیز تلاش کر رہی تھی۔ یا شاید کچھ رکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر کمرے کے اس گوشے میں نمودار ہوئی۔ اس کی چادر میں کوئی چیز تھی جسے وہ زار و قطار روتی ہوئی بار بار چوم رہی تھی۔ پھر وہ

اسے یوں سینے سے لگا لیتی جیسے کوئی بے حد عزیز شے ہو۔

اس کے آنسوؤں کا کرب اس کی سسکیوں کی دبی دبی سی آواز بڑی اندوہناک تھی۔ اس کی ہچکیاں دل پر جا لگتی تھیں۔ سجاول کو ایک ناقابل فہم دکھ نے چھلنی چھلنی کر دیا۔ نہ جانے وہ کون تھی؟ کس سے بچھڑ گئی تھی؟ کس گھر کی بھاگ بھری تھی؟ جو یہاں قید تنہائی کاٹنے پر مجبور تھی۔ وہ اسے ہو بہو بھاگ بھری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سسکیوں، اس کی بے قراریوں میں اسے بھاگ بھری کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

بھاگ بھری بھی تو اپنوں سے بچھڑ کر نہ جانے کہاں دکھوں کے درمیان زندہ چنی گئی تھی۔ نہ جانے وہ کس ویرانے میں قید تنہائی کاٹ رہی ہو گی۔ نہ جانے کن ہاتھوں میں اسی طرح مجبور اور بے بس بنا دی گئی ہو گی۔ نہ جانے کس جبر نے اسی کی طرح اس کی قوت گویائی چھین لی ہو گی۔

سجاول کے اندر لاوا سا پکنے لگا۔ اس کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس گونگی عورت کی یہ حالت اس کے لئے ناقابل برداشت ہونے لگی۔ اس کا دکھ اور کرب بھاگ بھری کی اذیت کا روپ دھار کر اس کے اپنے اندر اترنے لگا۔ سجاول نے خود کو مار کر اپنے آپ پر قابو پایا اور اپنی نم آلود آنکھیں زور سے بھینچ کر پتھر سے نیچے اتر آیا۔

اس میں اس عورت کا کرب دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تو اس کے تڑپنے کا تماشا دیکھنے کا بھی اس میں یارا نہیں تھا۔ اس نے دیوار کی پشت سے اپنی پشت ٹکا دی اور بے آس و مغموم سا ہو کر سوچنے لگا کہ وہ کس طرف روانہ ہوا تھا اور کدھر آ نکلا تھا۔ اس کے سارے کام ادھورے تھے۔ اس کی ساری تگ و دو بے مراد اور لاحاصل تھی۔ وہ جہاں پہنچنا چاہتا تھا وہ رستہ اس سے دور ہی دور ہوتا چلا جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھول بھلیوں میں گھر کر رہ گیا ہے کہ بھٹکنے کے سوا زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جو بھی رستہ چنتا تھا۔ وہ اسے منزل سے دور لے جاتا تھا۔

اسے اسی طرح افسردہ اور مایوس کھڑے کھڑے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اچانک دو بلیاں ایک دوسرے پر جھپٹتی، غراتیں اور لڑھکتیں اس کے قدموں کے بیچ آ گریں۔ سجاول نے چونک کر انہیں زوردار ٹھوکر لگائی وہ دونوں اس اچانک افتاد سے گھبرا کر گرتی پڑتی اٹھیں اور ایک دوسری کے پیچھے بھاگتی ہوئی دور نکل گئیں۔

سجاول دکھ دینے والے تصورات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے سر جھٹک کر بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اردگرد دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ رات کو آ کر اس گھر کی نگرانی کرے گا۔ جن لوگوں نے بھی اس عورت کو یہاں رکھا ہوا تھا وہ یقیناً چھپ کر رات کو یہاں آتے ہوں گے۔ اس نے واپس جانے کے لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اسے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ وہیں ٹھٹک گیا۔ اس نے غور سے سنا۔ آوازیں مردانہ تھیں۔ شاید کچھ لوگ اس طرف آئے تھے۔ یا یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اس عورت کو قید کر رکھا تھا۔

وہ چند لمحے وہیں دبکا ان آوازوں کو سنتا رہا تاکہ ان کی سمت کا اندازہ کر سکے۔ جلد ہی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ آوازیں اس روشندان میں سے آ رہی تھیں۔ وہ بڑی احتیاط سے بنا کوئی آہٹ کئے اس پتھر پر چڑھا اور روشندان میں سے جھانکا۔

اس نے دیکھا عام دیہاتی وضع قطع کے دو آدمی چارپائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے نوالے چبانے کی مکروہ آواز سجاول تک بھی پہنچ رہی تھی۔ پھر ان میں سے ایک کھانسا۔ شاید اس کا نوالہ اٹک گیا تھا۔ دوسرا گالی دے کر زور سے دھاڑا۔ ”رجاں...... ! او رجاں۔ جلدی آ۔ پانی لے کر آ مر۔“

وہی گونگی عورت پانی کا کٹورہ ہاتھ میں لئے دوڑی ہوئی آئی۔ پہلے نے پانی کا کٹورہ پکڑ کر منہ سے لگا لیا۔ دوسرے نے دانت پیس کر اس عورت کو ٹھوکر لگائی۔ ”ہزار مرتبہ تجھے کہا ہے کہ پانی پہلے رکھا کر...... پتہ نہیں کس رنڈی رونے میں پڑی رہتی ہے۔ اثر ہی نہیں ہوتا۔“

اس عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی اور وہیں ڈھے گئی۔ چند لمحے دیوار کے ساتھ اسی طرح بے سدھ پڑی کانپتی رہی۔ دوسرے نے پانی پی کر کٹورہ منہ سے ہٹایا اور ایک غلیظ گالی کے ساتھ اس پر کھینچ مارا۔ ”یہ نخرے اب کس کو دکھا رہی ہے۔ چل اٹھ جا کر چائے بنا۔“

کٹورے کی چوٹ کے ساتھ اس نے ایک طویل سسکاری لی اور دیوار کا سہارا لے کر جلدی سے اٹھنے کی کوشش میں ایک بار پھر گر پڑی۔ پہلے نے اپنا بھاری جوتا اٹھا کر اس پر پھینکا۔ ”کیا ہو گیا ہے تجھے۔ ٹانگوں میں دم نہیں رہا۔ اٹھ جلدی۔“

وہ کراہتی ہوئی اٹھی اور پاؤں گھسیٹتی ہوئی جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی سجاول دانت پیس کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی مصلحت کی پروا کئے بغیر ان کے درمیان جا پہنچے

اور انہیں ایک بے بس عورت کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک کرنے کا مزہ چکھا دے۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا سوائے اس کے کہ وہیں کھڑا پیچ و تاب کھاتا اور غصہ پیتا رہے۔

انہوں نے کھانا ختم کر کے اسے پکارا تو وہ گھبرائی ہوئی، ڈری سہمی کمرے میں آئی۔ اور ان کے سامنے سے برتن سمیٹ کر لے گئی۔ وہ مکروہ آواز میں زوردار ڈکاریں لیتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگے۔ سستے تمباکو کی تیز بو اور دھواں ہوا کے ساتھ اوپر اٹھ کر روشندان تک آنے لگا۔

وہ ڈری ہوئی بے بس عورت اترے ہوئے چہرے کے ساتھ کمرے میں آئی اور ان کے سامنے چائے سے بھرے بھاپ چھوڑتے پیالے رکھ گئی۔ ان میں سے ایک نے پیالہ اٹھا کر منہ سے لگایا اور سڑاک کی سی آواز کے ساتھ گھونٹ بھرا۔ دوسرا بھی ویسی ہی مکروہ آواز میں چائے پینے لگا۔

چائے اور سگریٹ نے جیسے انہیں تازہ دم کر دیا۔ وہ اطمینان سے قہقہے لگا لگا کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

”یار گامی!...... چوہدری تو سنا ہے شکار پر چلا گیا ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا جس سے سجاول کو معلوم ہو گیا کہ اس کے مخاطب کا نام گامی ہے۔

”چل اچھا ہے یار کیمے وہ جب تک آئے گا ہم یہاں مال ٹھیک ٹھاک کر لیں گے۔ گامی نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

چوہدری کے نام پر سجاول چونکا اور غور سے ان کی باتیں سننے لگا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ وہی چوہدری ہے جو رانی کا شوہر تھا۔

کیمے نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے اس نے گردن پیچھے ڈالی اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ سجاول پلک جھپکنے میں روشندان سے پیچھے ہٹ گیا۔ چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہ روشندان پر بھی پڑ سکتی تھی۔ وہ روشندان سے پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن اس کے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے۔

خاصی دیر تک ان دونوں کی آواز سنائی نہیں دی صرف ہلکی ہلکی کھانسی کا شور اس کی سماعت سے ٹکراتا رہا۔ نامعلوم وہ دونوں کس سوچ میں گم تھے یا سو گئے تھے۔ اس نے پھر بڑی احتیاط سے جھانکا۔ وہ دونوں جھلنگا چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ لیکن ان کا رخ دوسری

طرف تھا۔ پھر گامی کہنی کے سہارے اٹھا اور کیمے سے مخاطب ہوا۔

''یار! کچھ شاہی محلے کی بھی خبر لی ہے۔ بڈھا کوئی گڑبڑ تو نہیں کرے گا۔''

''او نہیں...... اس میں دم نہیں ہے۔ بس اپنی جان کی خیر منا کر پڑا ہوا ہے۔'' کیمے نے کہا۔

''پڑا ہے تو ہمیں کیا دیتا ہے۔ اپنا ہی بھلا کر رہا ہے۔ کوئی چوں چاں کی تو مزار بنا دیں گے وہیں پر۔'' گامی نے ہنس کر کہا اور چارپائی سے تقریباً آدھا دھڑ اٹھا کر بولا۔ ''یار آج شمع کا مجرا دیکھنے چلیں گے۔''

''ہائے ہائے...... کس کا نام لے دیا یار۔'' کیمے نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کم بخت ناچتی ہے کہ دل نکال لیتی ہے۔''

وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر قدرے رازداری سے بولا ''یار استانی کہاں غائب ہوگئی ہے کچھ اس کا بھی پتہ کرنا تھا۔''

''مجھے تو لگتا ہے چوہدری اسے بھی اپنے ساتھ شکار پر لے گیا ہے۔ جس دن سے چوہدری گیا ہے وہ بھی اس دن سے نظر نہیں آئی۔''

سجاول بھی چونک گیا۔ تو گویا نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ اسی لئے استانی کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔

''ہاں بھئی کیا پتہ۔ ان بڑے لوگوں کا کیا ہے جو ان کا دل چاہتا ہے کرتے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مصیبت تو ہم لوگوں کی ہے۔''

وہ دونوں آپس میں یونہی گپیں لڑاتے رہے۔ لیکن کوئی ایسی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی جس کے ذریعے ان پر گرفت کی جاسکتی۔ نہ ہی اس عورت کے بارے میں کچھ پتہ چلا کہ وہ کون تھی۔ اور دونوں اسے کہاں سے لائے تھے؟ ایک ہی جگہ بے حس و حرکت کھڑے کھڑے سجاول اکڑ کر تختہ ہوگیا تھا۔ ان ڈوبتی ابھرتی آوازوں کی طرف کان لگائے لگائے وہ ذہنی طور پر چور چور ہوگیا تھا۔ اس کے اعصاب جیسے ٹوٹ رہے تھے۔

وہ دونوں ٹانگیں پسارے پڑے یونہی بک بک کر رہے تھے۔ سجاول اکتا گیا۔ اس نے یہ ٹھکانہ تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ اس مظلوم عورت کی مدد کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہی سوچتا ہوا وہ آہستگی کے ساتھ اس پتھر سے اتر کر پچھلی جانب

سے ہی چپکے سے نکل گیا تاکہ اس مکان کی طرف آنے والے سبھی راستوں کو دیکھ بھال لے۔

اسے پتہ چلا تھا کہ استانی واپس آگئی ہے اور سکول کھل گیا ہے۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ کب استانی واپس آتی ہے۔ البتہ اسے یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ چوہدری بھی واپس آگیا ہے یا نہیں۔ اس نے بچوں کی چھٹی ہو جانے کا انتظار کیا تاکہ اسے وہاں آتے جاتے کوئی نہ دیکھے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو دروازہ کھلا تھا۔ سجاول نے دستک دی۔

دروازہ پہلی ہی دستک کے جواب میں کھل گیا اور ایک سفید بالوں والی عمر رسیدہ عورت نے کواڑوں میں سے جھانکا اور اجنبی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ یہاں نووارد تھا۔ اسی لئے اس عورت کے چہرے پر حیرت ابھر آئی۔ سجاول نے مؤدب سلام کیا تو اس کے چہرے کی سختی قدرے کم ہوئی اور اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا کہ وہ کون ہے۔

سجاول نے گلا صاف کیا اور محتاط لہجے میں استانی کے بارے میں پوچھا۔

''کیوں؟ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔'' اس نے کڑے تیوروں سے کہا۔

''مجھے استانی سے ضروری کام ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا ضروری کام ہے پہلے مجھے بتاؤ۔ وہ ہرایرے غیرے سے نہیں ملتی۔'' اس نے رعونت سے جواب دیا۔

''بڑی ضروری بات ہے اماں۔'' سجاول نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ''میں کوئی مذاق نہیں کر رہا اور نہ ہی میرے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ تمہارے ساتھ سوال و جواب کروں۔''

اس کے بدلے ہوئے لہجے پر اس عورت نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''بات سن کاکا یہاں اندر ڈیوڑھی میں آکر بتا کہ کیا بات ہے؟ مجھ سے اس کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں۔''

سجاول نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی گلی میں موجود تو نہیں اور پھر اس کی ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوگیا۔ عورت نے اس کے پیچھے دروازہ بند کر دیا اور بولی۔

''ہاں۔ اب بتا کیا بات ہے؟ استانی سے تجھے کیا کام ہے؟''

''اماں یہ استانی تیری کیا لگتی ہے۔'' سجاول نے پوچھا۔

''تجھے اس سے کیا؟'' وہ اکھڑ پنے سے بولی۔ ''تو بات کر بات کیا ہے؟''

''بات یہ ہے کہ استانی سے کہہ دے کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ عورت ذات ہے اس کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس علاقے سے کہیں اور چلی جائے۔ پڑھی لکھی ہے تو اسے اور بھی نوکریاں مل جائیں گی۔ یہاں اس کے لئے خطرہ ہے۔ یہ اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتانا پڑے۔''

''تیرے منہ میں خاک۔ یہ کیا بجھارتیں بجھوا رہا ہے تو۔ اللہ اسے سے خیراں رکھے۔ تو ہے کون؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ پتہ نہیں کیا بک رہا ہے؟ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔'' بڑھیا نے بھڑک کر کہا تو سجاول چڑ گیا۔

''اسی لئے تو کہا ہے کہ استانی کو بلا دے۔ تیری سمجھ میں میری بات نہیں آئے گی۔''

بڑھیا الجھ کر کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ڈیوڑھی میں کھلنے والے دروازے کے پٹ وا ہوئے اور ایک نوجوان لڑکی نے جھانک کر پوچھا۔

''کون آیا ہے اماں؟''

بڑھیا نے پلٹ کر دیکھا اور پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''لے نور تو آپ ہی اس سے پوچھ لے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔''

''کیا بات ہے جی۔'' اس کا انداز مہذب تھا۔

سجاول نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کا روشن چہرہ بے حد پرکشش اور دلربا تھا۔ اس نے بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھ رکھا تھا جس میں گلابی ربن بندھے ہوئے تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اپنا گلابی آنچل سر پر ڈال لیا تھا۔

سجاول نے اپنے لہجے کو شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اچھے لفظوں کا انتخاب کیا۔ وہ اس سے براہ راست بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''آپ چند منٹ کیلئے ایک ضروری بات سن لیں۔ اس اماں کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔''

اس نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر دروازے سے پیچھے ہٹ گئی۔ ''آپ اندر کمرے میں آ جائیں۔''

سجاول جھجکا نہیں اور دہلیز پار کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ استانی نور نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ بڑھیا بڑبڑاتی ہوئی پیچھے رہ گئی۔

سجاول کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بی بی میں یہ بات تمہارے بھلے کیلئے کہہ رہا ہوں۔ تم یہاں سے فوراً کہیں چلی جاؤ۔''

''لیکن کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کیوں کو تم رہنے دو۔'' سجاول نے قدرے اکھڑپن سے کہا۔ ''بس جو میں کہہ رہا ہوں اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ تو شریف گھر کی لڑکی ہے۔ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ یہاں سے چلی جا۔ اگر تجھے اپنی عزت عزیز ہے تو اس جگہ سے کوئی تعلق نہ رکھنا۔''

اس لڑکی کے دلکش چہرے پر حیرت اتری۔ اس نے اضطراب میں اپنی انگلیاں مروڑیں۔ پھر مدھم سے لہجے میں بولی۔ ''اگر میں تمہاری بات پر اعتبار کر لوں تو بھی مجھے اتنا تو پتہ چلنا چاہئے کہ آخر مجھے یہاں سے کیوں چلے جانا چاہئے اور پھر دیکھو نا مجھے تو یہاں محکمے نے بھیجا ہے وہ جب تک مجھے واپس نہیں بلاتے میں کس طرح جا سکتی ہوں؟''

''تمہیں محکمے کی اور نوکری کی پڑی ہے۔'' سجاول نے قدرے درشتی سے کہا۔ ''اور اپنی عزت کی تمہیں کوئی فکر نہیں۔ اپنے ماں باپ کی۔ اپنے خاندان کے وقار کی تمہیں کوئی پروا نہیں؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بھی قدرے تلخ ہوئی۔

''مطلب یہ کہ یہاں کے چوہدری سے خود کو جتنی جلد بچانا چاہتی ہو بچا لو۔ وہ مشکوک آدمی ہے۔'' سجاول نے اچانک ڈرامائی لہجے میں کہا۔

وہ یکدم چونکی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس نے تلخی سے کہا۔ ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ چوہدری سے میرا کیا تعلق؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ چوہدری سے تمہارا جو تعلق ہے وہ گاؤں میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ سنا ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ شکار پر بھی لے گیا تھا۔''

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی ملائم انگلیوں کو ایک دوسرے میں

الجھا کر جیسے خود پر قابو پایا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''آپ بہت غلط باتیں کر رہے ہیں۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' اس کے لہجے میں لرزش تھی۔

سجاول بڑے غور سے اس کی اضطراری حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کم عمر، ناتجربے کار اور بھولی تھی۔ اسے اپنے جذبات چھپانے کا فن بھی نہیں آتا تھا۔ سجاول کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے اور چوہدری کے درمیان کوئی بات ضرور تھی اسی لئے اس نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

''دیکھ بی بی! میں تو یہاں سے چلا ہی جاؤں گا۔ لیکن میں تجھے یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اگر چوہدری نے تجھے کوئی چکر دے رکھا ہے تو تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم سمجھداری سے کام لو۔ اس کی تین بیویاں حویلی میں اس کی جان کو رو رہی ہیں۔ تو چوتھی بن کر ان میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ کچھ عقل سے کام لے ورنہ پچھتائے گی۔'' وہ اتنا کہہ کر اٹھ آیا۔ استانی وہیں ہکا بکا بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

۞......۞......۞

وہ واپس آیا تو قبرستان کی فضا ویسی ہی اداس اور پرہیبت تھی۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی چپ گمبھیر اور مغموم تھی۔ سوکھے پتے اس کے پیروں تلے چرمرا رہے تھے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی اداسیاں جیسے روح میں اتر آتی تھیں اور دل میں جیسے کوئی ...لو دنے لگتا تھا۔

اس نے ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ دور تک پھیلی ہوئی قبروں پر ڈالی۔ کسی قبر پر بھی کوئی ...ی روح نہیں تھا۔ اس نے دکھی دل کے ساتھ سوچا کہ موت انسان کو زندوں سے کس طرح ...ٹ دیتی ہے۔ معاً اسے خیال آیا کہ رانی کئی روز سے قبرستان میں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید اس ...ے گھر والوں نے اسے روک رکھا تھا ورنہ تو وہ کیسی بیقراری کے ساتھ اپنے بچے کی قبر سے ...ائی رہتی تھی۔

اس کے دل کو جیسے کوئی کچوکے لگانے لگا۔ وہ رانی کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ نہ جانے کس حال میں تھی۔ زندگی کے دیئے ہوئے صدموں کو کس طرح جھیل رہی تھی۔ وہ ...ے اکھڑے سے قدم لیتا گورکن کی جھونپڑی کے قریب پہنچ گیا۔ زندگی سے تہی گم صم سی فضا میں اس کی یہ کٹیا اور ٹوٹے ہوئے چھپر میں سے اٹھتا ہوا دھواں زندگی اور حرارت کا احساس دلاتا تھا۔ جھیمو کے خیال نے اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی افسردگی اور پژمردگی کو ...ے کم کر دیا۔ اس نے ملامت بھرے انداز میں اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا اور اسے ...وس سا ہوا۔ وہ اس ننھی منی سی تنہا لڑکی کیلئے کوئی سوغات نہیں لا سکا تھا۔ کوئی گڑیا، کوئی گیند، ...ئی چھوٹا سا مٹی کا کھلونا جسے دیکھ کر اس کے بھولے بھالے چہرے پر بچپن کا نٹ کھٹ پن ...ا جائے۔ وہ بچپن کے ان سہانے دنوں کا لمس محسوس کر سکے۔

یہی سوچتا ہوا وہ اس کچے برآمدے میں داخل ہو گیا۔ جو اس کٹیا کا باورچی خانہ بھی ...لیکن چولہے کے پاس جھیمو نہیں تھی۔ اپلوں کی راکھ ابھی تک سلگ رہی تھی اور پاس کچھ

جھوٹے برتن اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی کسی نے کھانا کھایا ہو۔ سجاول نے سوچا شاید بابا نے کھانا کھا لیا ہے۔ لیکن چھیمو تو اس کے بغیر نہیں کھاتی تھی وہ یہیں کہیں اس کے انتظار میں منہ بسور رہی ہوگی کہ اس نے آنے میں دیر کر دی ہے۔ اور وہ اس کے انتظار میں بیٹھی سوکھ رہی ہے۔ پھر اسے منانے اور اس کی ننھی منی گھرکیاں سننے میں مزہ آئے گا۔

چھیمو کو تلاش کرتا ہوا وہ برآمدے میں سے ہوتا کمرے کی طرف بڑھا۔ لیکن دفعتاً اسے پلٹ جانا پڑا۔ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اناج رکھنے والے بڑے مٹکے کی اوٹ میں ہوگیا۔ دروازے میں سے بابو اور شاہو بوڑھے گورکن کے ساتھ باہر آ رہے تھے۔ سجاول سانس روک کر اور دبک گیا۔ گویا ملاں اسے بھولا نہیں تھا۔ تب ہی بابو اس کی تلاش میں یہاں تک آ گیا تھا۔ لیکن وہ ملاں کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننا چاہتا تھا۔ اسے اپنے لئے بہت کچھ کرنا تھا۔ اسے اپنے گھر کی عزت کو بازار کی دلدل سے نکالنا تھا۔ وہ ایک بار پھر ملاں کے سامنے مجبور نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وہ بالکل دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ وہ دونوں اس کے برابر سے گزرنے والے تھے۔ اسی وقت برآمدے کے دوسرے کونے سے چھیمو دوڑتی ہوئی اس طرف لپکی اور دور ہی سے پورے جوش سے چلائی۔ ''چاچا...... چاچا......!''

شاہو اور بابو نے یکدم پلٹ کر دیکھا لیکن خیر گزری کہ ان کی نگاہ اس تک نہیں پہنچی۔ سجاول نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور چہرے کے پورے تاثرات کے ساتھ اسے خاموش ہو جانے کے لئے کہا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنی رو میں بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ سجاول اضطراری کیفیت میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے کہ اچانک بوڑھے گورکن کی بلند آواز نے چھیمو کے قدم روک لئے۔

''چھیمو...... او چھیمو...... مر جائیے۔'' بوڑھے کے پکارنے پر وہ وہیں تھم گئی اور اس نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

''جھلی ہوئی ہے۔'' بوڑھے نے غصے اور کرختگی سے کہا۔ ''چل جا کے سندری کو اندر کوٹھڑی میں باندھ دے۔ چوہدری کا کتا ہلکا ہوگیا ہے۔ کہیں اس طرف نہ نکل آئے۔''

چھیمو ٹھٹک سی گئی۔ اس نے ایک نگاہ سجاول پر ڈالی۔ ''بابا...... بابا...... وہ چاچا......!'' لفظ اس کے منہ میں ہی رہے اور بڈھے نے اسے جھڑک دیا۔ ''سنتی نہیں تو میں کہہ رہا ہوں۔ وہ ہلکا کتا اس طرف نکل آیا تو بکری بھی ہاتھ سے جائے گی۔''

چھیمو کا معصوم چہرہ پژمردہ سا ہوگیا۔ وہ منہ بسورے پلٹ گئی اور پیر پٹختے ہوئے برآمدے کے ساتھ پڑے ہوئے پتھر پر سے نیچے اتر گئی جو بطور سیڑھی استعمال ہوتا تھا۔ سجاول کی جان میں جان آئی۔ اس نے آسودگی کا لمبا سانس کھینچا۔ اس کا مطلب تھا کہ بوڑھا اسے ان لوگوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''یہ لڑکی کس کو چاچا چاچا کہہ رہی ہے۔'' کھردرے سے لہجے میں اٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ سجاول نے پہچان لیا وہ بابو کی آواز تھی۔ وہ چوکنا ہوگیا اور انتظار کرنے لگا کہ بوڑھا اس کے جواب میں کیا کہتا ہے۔ بوڑھا کھانسا یوں جیسے سوچنے کیلئے وقت لینا چاہتا ہو۔ پھر ہانپتے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

''بالڑی ہے۔ نہ بے چاری کی ماں نہ باپ۔ اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی ماں کو آواز مارتی ہے کبھی باپ کو۔ کبھی مامے کو، کبھی چاچے کو۔ اللہ لوکی ہے۔ اللہ لوکی۔''

''اچھا......'' بابو کی آواز میں بے یقینی تھی۔ ''تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''میری نواسی ہے۔'' بوڑھے کا لہجہ غمگین تھا۔

''تمہیں کچھ ہو جائے تو اس کا کیا بنے گا؟''

''اللہ مالک ہے۔ وہی کوئی سبیل کر دے گا۔''

''اچھا بابا ہم پھر آئیں گے۔ اگر کوئی اس حلیے کا بندہ نظر پڑے تو اطلاع دینا۔ بہت کچھ ملے گا۔ سمجھے، بہت کچھ۔'' بابو نے کہا۔

سجاول ہوشیار ہوگیا۔ لمحے بھر کو اسے خیال آیا کہ کہیں بوڑھا لالچ میں نہ آ جائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود پر شرمندہ سا ہوگیا۔ بوڑھے نے اگر اسے ان لوگوں کے حوالے کرنا ہوتا تو کبھی کا کر چکا ہوتا۔ وہ دونوں بوڑھے کو سلام کر کے برآمدے سے نیچے اتر گئے۔

سجاول تھوڑے انتظار کے بعد مٹکے کی اوٹ سے نکلا۔ بوڑھا پاؤں گھسیٹتا اسی طرف آ رہا تھا۔ سجاول کو اس طرح سامنے کھڑا دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اور اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ غالباً وہ اس بات سے خوفزدہ ہوگیا تھا کہ کہیں وہ لوگ واپس ہی نہ آ جائیں۔

سجاول نے اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے سر ہلا کر بے رخی سے جواب تو دے دیا۔ لیکن اس کے چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ وہ ہانپتا ہوا برآمدے میں داخل

ہوا۔ سجاول اس کے ساتھ ہولیا۔ نہ اس نے کچھ پوچھا' نہ بوڑھے نے کچھ کہا۔ وہ تھکے تھکے سے انداز میں آن کر چٹائی پر بیٹھ رہا۔ ایک بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''جوان! بس اب تو یہاں سے کنارہ کر۔ ہم اپنا بوجھ آپ نہیں اٹھا سکتے تیرا بوجھ کس طرح اٹھائیں۔ تو ہماری جان چھوڑ دے۔ جا تیری بڑی مہربانی۔ کہیں اور اپنا ٹھکانہ کرلے۔''

سجاول نے پہلے ہی سونگھ لیا تھا کہ بوڑھا کیا کہنے والا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہی چٹائی پر بیٹھ گیا اور انجان بن کر بولا۔ ''کیوں بابا مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوگئی ہے۔ کیا قصور ہوگیا ہے جو تو مجھے صاف جواب دے رہا ہے۔''

بوڑھے نے چندھی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ باندھ کر بولا۔

''قصور تو ہم سے ہوگیا ہے یار! جو ہم نے تجھے یہاں اپنے پاس رکھ لیا۔ پر اب تو ہمیں معاف کردے۔ میرے بندھے ہاتھوں کی طرف دیکھ۔ دیکھ اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ تیرے پیچھے آنے والوں کے ساتھ جواب دہی کرسکوں۔ میں یہاں دنیا کے بکھیڑوں سے الگ ایک کونے میں پڑا ہوں۔ میں یہ گواہیاں روز نہیں بھگتا سکتا۔''

''تو میرے باپ کی جگہ ہے بابا۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ میں تو دو گھڑی تیرے سائے میں پناہ لینے آگیا تھا۔ کچھ میرے دل کا تو خیال کر۔'' سجاول نے اپنی آواز میں جذبات کی آمیزش کرتے ہوئے کہا تاکہ بوڑھے کے ہمدردانہ احساسات کو چھیڑ سکے۔ لیکن بوڑھا سر جھکائے بیٹھا زمین پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتا رہا۔ اس نے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں کہا نہ ہی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

سجاول اپنی جگہ سے اٹھا۔ ''اچھا بابا اگر میں تجھ پر اتنا ہی بوجھ بن گیا ہوں تو میں چلتا ہوں۔ چل کر کہیں اور ٹھکانہ کرتا ہوں۔ خدا کی زمین تنگ تو نہیں ہے کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی۔''

''کہاں......؟ کہاں چاچا!؟ تم کہاں جارہے ہو۔ ابھی تو تم آئے ہو اور ابھی پھر جا رہے ہو۔'' چھیمو اس کی آواز سن کر اس طرف لپکی۔

اس کے اس اپنائیت بھرے انداز نے سجاول کو جیسے نئی زندگی دے دی۔ اس کی امید ایک بار پھر بندھ گئی۔ اس نے چھیمو کا ننھا ہاتھ تھام لیا اور جھک کر اس کے بھولے بھالے چہرے کے برابر اپنا چہرہ لاتے ہوئے بولا۔ ''چھیمو تیرا بابا مجھے یہاں نہیں رہنے دیتا۔''

''ہا...... ہائے۔ کیوں بھلا؟'' چھیمو نے حیرت سے کہا اور جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر

وہ بڈھے کی طرف لپکی اور اسے جھنجھوڑ دیا۔ ''بابا...... بابا۔ تو چاچے کو یہاں کیوں نہیں رہنے دیتا۔ کیوں نہیں رہنے دیتا۔''

بوڑھے نے اس کا بازو پکڑ کر اسے پرے دھکیلا۔ ''چل ہٹ آرام کر۔ دیکھا ہوا ہے میں نے تیرا چاچا۔''

اس کے کرخت لہجے پر چھیمو بھونچکی رہ گئی اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف بے یقینی سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً بلند آواز میں رو پڑی۔

سجاول نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''چپ ہو جاؤ چھیمو۔ شاباش دیکھ مت رو۔''

چھیمو نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''چاچا!...... چاچا! بتا تو جائے گا تو نہیں۔ بتا چاچا۔ تو نہیں جائے گا نا...... بتا۔''

سجاول کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان روتی ہوئی آنکھوں کو کیا جواب دے۔ اس کے آنسوؤں سے اس کا دل دکھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ان آنسوؤں کو بہنے سے روک دے یا پھر یہاں ایک منٹ ٹھہرے بغیر چل دے کہ ان التجا کرتے آنسوؤں کو یوں بہتے دیکھنا سہل نہیں تھا۔

سجاول نے بوڑھے گورکن کی طرف دیکھا کہ اندازہ لگا سکے کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ چھیمو کے آنسوؤں اور ہچکیوں نے اس پر کوئی اثر کیا ہے یا نہیں۔ بوڑھا اپنے شانے پر پڑا ہوا رومال سر پر لپیٹتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ سجاول بدستور اس کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ اٹھ کر کہاں جاتا ہے۔ اور اس سے بھی کوئی بات کرتا ہے یا نہیں۔ چھیمو نے ابھی تک اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اپنی بات دوہرائے جا رہی تھی۔

بوڑھا پاؤں گھسیٹتا ہوا اس کے نزدیک آیا اور بیزاری سے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔

''رہ لے بھئی۔ رہ لے۔ تو یہاں رہ لے۔ پر اتنا سن لے کہ اگر اب کوئی تیرے پیچھے آیا تو میں نے جھوٹ نہیں مارنا۔ سیدھا صاف تیرا پتہ بتا دینا ہے پھر تو جانے اور تیرا کام۔ سمجھا تو۔''

سجاول ایک ناقابل بیان خوشی میں اندر ہی اندر بھیگ گیا۔ بوڑھا اتنا کہہ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ چھیمو نے مسکرا کر اس کا بازو تھام لیا۔ ''دیکھا۔ دیکھا چاچا! بابا مان گیا نا۔ بس

چاچا اب تو کہیں نہ جانا۔ یہیں رہنا۔ نہیں تو میں اکیلی رہ جاؤں گی۔''

قبرستان میں صبح کسی اور رنگ میں آتی تھی۔ اداس اور پھیکی پھیکی سی۔ نہ کوئی آواز نہ صدا۔ نہ پانی گرنے کی آواز۔ نہ برتنے کھنکنے کی صدا۔ نہ بچوں کے رونے کا شور اور نہ ہی کوئی دوسری انسانی آواز۔ بس ایک گھمبیر خاموشی، پرندوں کی بولیوں اور ان کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی زندگی آمیز صداؤں سے گونجتی اور پھر سناٹا چھا جاتا۔

وہ بوڑھے گورکن کی بلغمی کھانسی کی آواز سن کر جاگ تو جاتا۔ لیکن پڑا کروٹیں بدلتا رہتا یا تھوڑی تھوڑی سی آنکھیں کھول کر ننھی سی چھیمو کو گھر کے سارے کام کاج نپٹاتے ہوئے دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ وہ پھول سی ننھی بچی قبرستان کی خاموش ڈراؤنی فضا میں کس طرح پھلے پھولے گی۔ کس طرح اپنے ارمانوں کو سنوارے گی۔ اپنی کومل تمناؤں کے رنگ کس طرح سجائے گی۔ اجلے اجلے سپنے کیونکر دیکھے گی۔

کاش وہ اس کے لئے محبت بھرا گھر، رنگ برنگے کھلونے سکھیاں سہیلیاں، زندگی اور آوازیں مہیا کر سکتا اور اس کی جھولی کو شادمانیوں اور مسرتوں سے بھر دیتا۔

وہ گھر کے کام کرتے ہوئے جب بھی اس کے برابر سے گزرتی اس کو پکار لیتی۔

''چل چاچا! اب اٹھ جا۔ دیکھ دن نکل آیا ہے اب اٹھ جا۔''

مگر وہ اسی طرح پڑا کروٹیں بدلتا رہتا۔ وہ بوڑھے کو روٹی کھلا کر اس کے پاس آ کھڑی ہوتی اور پوری آواز میں چلاتی۔

''چاچا روٹی کھانی ہے تو کھا نہیں تو میں سندری کو کھلا دوں گی۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جائے گی تو میں گرم نہیں کروں گی۔''

وہ فوراً ہی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا اور ہنس کر کہتا۔

''نہ نہ چھیمو۔ تو نے اگر میری روٹی سندری کو کھلا دی تو میں کیا کروں گا۔''

وہ باہر جانے کیلئے کٹیا سے نکلتا تو چھیمو کی شیریں آواز اس کے ساتھ ساتھ ہوتی جو اسے جلدی واپس آ جانے کیلئے کہتی رہتی۔ یہ سہانی آواز زندگی کی کڑی دھوپ کو گوارا بنا دیتی تھی۔ وہ یہی سوچ کر نکلا تھا کہ آج وہ اس گونگی عورت سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان جرائم پیشہ لوگوں کا تعلق گاؤں کے چوہدری سے تھا۔ اور وہ ان کی پشت پناہی کرتا تھا۔

وہ گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر ہو لیا تا کہ اس شکستہ مکان تک پہنچ سکے۔ وہ اپنی دھن میں چلا جاتا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پکارا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا سرسوں کے کھیت میں ساگ چنتی ایک عورت اسے اشارے سے بلا رہی تھی۔

سجاول نے غور سے دیکھا اور اسے یاد آیا کہ وہ استانی نور کی ملازمہ تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب چلا گیا اور اسے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور بولی۔ ''تو وہی ہے نا جو استانی نور سے ملنے آیا تھا۔''

سجاول نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بڑھیا رازداری سے بولی۔ ''تو جو بات اس دن کان میں پھونک آیا تھا اس نے تو میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔ میں نے تیری اور نور کی ساری باتیں بھی سن لی تھیں۔ پتر یہ فکر تو میری جان کو لگ گئی ہے۔''

''اماں! خالی تیرے فکر کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ استانی کو بھی تو سمجھا۔'' سجاول نے زور دے کر کہا۔

''میں کیا سمجھاؤں پتر! وہ آپ سیانی ہے۔ چار جماعتیں پڑھ گئی ہے تو اب وہ ہمیں بھی پڑھاتی ہے۔ اس نے ہماری کیا سننی ہے۔ نا سمجھ ہے۔ لڑکی ذات ہے۔ اس موت جوگے کی باتوں میں آ گئی ہے جو پہلے ہی تین تین بیویاں کر کے بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ یہ نا سمجھ بیوقوف لڑکی اس کے سامنے کیا ہے۔ اس نے اسے ایسے سبز باغ دکھائے ہیں کہ وہ دیوانی ہو گئی ہے۔ آگے پیچھے کی اس کو کوئی خبر ہی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا ہو سکتا ہے اماں۔'' سجاول نے مایوسی سے کہا۔ ''جب لڑکی آپ ہی اپنی بیری ہو رہی ہے تو میں یا تو کیا کر سکتے ہیں؟''

بڑھیا پریشانی سے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''میں اور تو تو کچھ نہیں کر سکتے لیکن وہ کر سکتا ہے۔''

''وہ کون؟'' سجاول نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''دلشاد اس کے چاچے کا پتر ہے۔ اس کے بچپن کا منگیتر ہے۔ اگر وہ کالے منہ والا شیطان کا بچہ ہوتا تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔''

''وہ ہے کہاں؟''

''اس کی بھی خوب پوچھی۔'' بڑھیا نے غصے سے سر جھٹکا۔

''بس ماں پیو مر گئے سر پہ کوئی بڑا نہیں۔ وہ کلم کلا جائیداد کا مالک ہو گیا ہے۔ دن

رات پیسہ اڑانے پر اس نے کمر باندھی ہے۔ ایک کلموہی رنڈی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ نور کو تو پوچھتا تک نہیں۔ سو سو طعنے دیتا ہے۔ اس نے عرضی پرچہ کر کے یہاں نوکری کر لی اور وہاں سے نکل آئی۔ دلشاد نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ کہاں گئی۔"

"میں نے بچپن سے اسے پالا ہے۔ گودیوں کھلایا ہے۔ اس کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ لگی رہتی ہوں۔ پر کہاں کہاں اسے بچاؤں۔ جوان جہان لڑکی ہے۔ وہ موت جوگا دلشاد اسے سنبھال لیتا تو میری روح بھی آرام سے نکلتی۔ مجھے بھی سکھ کا سانس آتا۔"

سجاول نے غور سے اس کی بات سنی اور بولا۔ "تم تو کہتی ہو کہ وہ کسی بازاری عورت کے پیچھے پڑا ہوا ہے پھر وہ کہاں اس کی پروا کرے گا۔"

"پر میں کہتی ہوں اگر اسے پتہ چلے تو کیا خبر اسے غیرت آ ہی جائے۔ یہ اس کے خاندان کی عزت ہے۔ اس کے تائے کی بیٹی ہے۔ اچھی بھلی پڑھی لکھی ہیرا لڑکی ہے۔ پر اس کمینے کی نظر میں نہیں جچتی۔ اس کم ذات رنڈی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔"

"تو پھر؟" سجاول نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور رازداری سے بولی۔

"پتر! تو بس اتنا کر دے کہ ایک بار اس سے جا کر مل لے۔ میں تجھے اس کا پتہ دے دوں گی۔ تو اس کے سامنے جا کر میرا نام لینا اور اسے تمام معاملہ سمجھا دینا۔ وہ کچھ بھی سہی اسے خاندان کی غیرت تو ہو گی۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔ میں اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ نہیں تو میں آپ چلی جاتی۔ پتر تو یہ کام کر دے تیرا دو جگ میں بھلا ہو گا۔ مجھ غریب سے دعائیں لے گا۔"

سجاول نے لمحے بھر کو سوچا اور سر جھٹک کر بولا۔

"اماں! میں سوچتا ہوں کہ اس معاملے میں پڑ کر کہیں کوئی اور مصیبت نہ گلے پڑ جائے۔"

"نہیں۔ نہیں پتر۔ ایسی بات نہیں ہو گی۔ تو دلشاد کے سامنے میرا نام لے گا تو وہ لحاظ کرے گا۔ اسے میں نے گودیوں کھلایا ہے۔ تو صرف میرا پیغام اسے دے دینا۔ بس۔ تیرا کام تو اتنا ہی ہے۔ باقی وہ خود سنبھال لے گا۔" وہ پرامید آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

سجاول کو انکار کر کے اس کی آس توڑنا اچھا نہیں لگا۔ ابھی اس نے طے نہیں کیا تھا کہ وہ یہ کام اپنے ذمے لے گا یا نہیں۔ لیکن بڑھیا کی تسلی کیلئے اس نے دلشاد کا پتہ اس سے معلوم کر لیا۔ بڑھیا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دعائیں دینے لگی۔

بڑھیا آگے بڑھ گئی۔ لیکن سجاول کو ایک نئی سوچ کے حوالے کر گئی۔ وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ رانی کا خیال اب بھی اس کے دل سے محو نہیں ہوا تھا۔ اس کی روتی ہوئی آنکھیں اب بھی اس کی یادوں میں جھانکتی تھیں۔ وہ اسے سکھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے دکھ اپنی جھولی میں ڈال لینا چاہتا تھا۔ اسے رانی کی خاطر بڑھیا کی بات پر عمل کرنا تھا۔ دلشاد یقیناً اپنے خاندان کی عزت کی خاطر استانی نور کو یہاں سے لے جائے گا۔

استانی نور کے منظر سے اوجھل ہو جانے سے شاید رانی کا شوہر گھر واپس آ جائے۔ یہی سوچ کر وہ قبرستان واپس جانے کے بجائے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن راہ میں اس کا خیال بدل گیا۔ اس نے دلشاد کے ڈیرے پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس بازار میں جا پہنچا جہاں دلشاد کا آنا جانا تھا اور جس کی وجہ سے دلشاد استانی نور کی پروا نہیں کرتا تھا۔

اماں نے اس عورت کا نام نیلم بتایا تھا۔ اس کے یہاں تماش بینوں کی کثرت دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ دلوں پر حکومت کرتی تھی۔

ساری فضا گھنگروؤں کے چھناکوں سے گونج رہی تھی۔ ایک بے حد حسین اور نازک اندام لڑکی کے گورے گورے پاؤں قالین پر متحرک رہے تھے۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدموں اور تھرکتے ہوئے زاویوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رقص میں کتنی مہارت رکھتی ہے۔ وہ اشتیاق بھری بے باک نگاہوں میں ڈوبی ہوئی اپنی قاتل اداؤں سے ہر جانب سحر پھونک رہی تھی۔ ساری محفل جیسے اس کی مٹھی میں تھی۔ وہ جیسے دلوں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔

سجاول نے سوچا شاید یہی نیلم ہو گی۔ اگر نور کا منگیتر اس کا دیوانہ تھا۔ تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ نور جیسی سیدھی سادھی گھریلو لڑکی کے پاس نہ یہ ادائیں تھیں۔ نہ حسن نہ دلکشی۔ اہل محفل کی نگاہیں اس کی دلکشی میں جذب ہوئی جاتی تھیں۔ اچانک ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے سجاول کے ذہن میں آیا اور اسے چور چور کر گیا۔ نہ جانے اس کی بہن بھاگ بھری کہاں تھی؟ اور کس حال میں تھی؟ کہیں وہ بھی کسی بازار میں اسی طرح تماشے کی چیز بن گئی ہو۔ کہیں اس کی مجبوری بھی اسے اسی طرح نہ نچوا رہی ہو۔

سجاول کے روئیں روئیں میں ایک عجیب بے چینی جاگ اٹھی۔ لمحے اسے زخمی کر کر کے گزرنے لگے۔ اس کی نغمے چھلکاتی آواز اسے کچوکے لگانے لگی اسے وہاں پل بھر ٹھہرنا بھی دشوار ہو گیا۔

گانا ختم ہو گیا اور وہ گھنگھرو چھنکاتی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ ناز آفریں ادائیں لئے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر اہل محفل کی داد سمیٹنے لگی۔ اس کے چاروں طرف قالین پر نوٹ ہی نوٹ بکھرے پڑے تھے اور وہ گرد و پیش کو ایک عجیب فاتحانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

ایک اور رقص کے لئے لوگوں کا اصرار بڑھنے لگا۔ وہ مسکرا مسکرا کر برابر انکار کرتی رہی۔ قریب ہی پاندان کھولے بیٹھی ادھیڑ عمر نائیکہ نے ایک سازندے کو اشارہ کیا۔ اس نے اٹھ کر قالین پر سے سارے نوٹ سمیٹ لئے۔ ناچنے والی کی شفاف پیشانی پر بل سا آ گیا۔

نائیکہ نے اس کا زیورات سے سجا ہوا خوبصورت ہاتھ تھاما اور اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر ابرو سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مچل کر اٹھی اور اس نے گھنگھروؤں میں ڈوبے ہوئے بلوریں پاؤں غصے میں قالین پر پٹخے۔ جس سے ساری محفل میں گھنگھروؤں کے چھناکے سے بکھر گئے۔

اہل محفل نے داد دی۔ سازندوں نے ساز درست کئے۔ گانے والی نے ایک شوخ سی غزل کا مصرعہ اٹھایا اور اس کے پیروں میں حرکت ہوئی۔ وہ ایک بار پھر محفل کے درمیان آ کر اپنی اداؤں کا جادو جگانے لگی۔ اس کا جلوہ حسن اور ناز و ادا کی بجلیاں چاروں اور تڑپنے لگیں۔ اہل محفل جھوم جھوم اٹھے۔ بعض اس کا نام لے کر بھی داد دے رہے تھے جسے سن کر سجاول کو مایوسی ہوئی۔ وہ نیلم نہیں تھی۔ وہ بے چین سا ہو گیا اور ادھر ادھر نظر بچا کر دیکھنے لگا کہ کوئی اور چہرہ نظر آئے جسے نیلم کہا جا سکے۔ اہل محفل اس رقص میں اس قدر گم تھے کہ وہ کسی سے کوئی استفسار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

نغمہ ختم ہو گیا۔ وہ گھنگھرو چھنکاتی۔ مخروطی انگلیوں والے حنائی ہاتھ سے آداب کرتی مسکراتی ہوئی ایک چلمن کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اہل محفل اس کے حسن کے قصیدے گاتے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اٹھنے لگے۔ سجاول سوچنے لگا کہ ان ہی تماش بینوں میں کوئی دلشاد بھی ہو گا لیکن وہ اسے پہچانتا نہیں تھا۔

نائیکہ لوگوں کو ہنس ہنس کر رخصت کر رہی تھی۔ وہ کسی پر کوئی فقرہ کستی کسی سے کوئی

ذو معنی جملہ کہتی۔ کسی کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ کسی کو کوئی اشارہ کرتی۔ کسی سے کوئی فرمائش اور کسی سے کوئی وعدہ۔ سجاول اس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کی جیب میں اسے دینے کیلئے کچھ نہیں تھا نہ وہ اس کی کوئی فرمائش ہی پوری کر سکتا تھا۔ وہ اس کی نظروں سے بچتا۔ ان کمروں کی طرف دیکھ رہا تھا جن پر چلمنیں پڑی ہوئی تھیں تا کہ اندازہ لگا سکے کہ نیلم کا کمرہ کون سا ہے لیکن اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا اور ہجوم چھٹتا جا رہا تھا۔

اچانک اس کے پہلو میں کسی نے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔ سجاول نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سازندہ اسے آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا۔ سجاول نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرایا اور اس کے قریب ہو کر ہولے سے بولا۔ ”تمہیں نیلم نے بلایا ہے۔ دائیں سے تیسرا کمرہ۔“ وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

سجاول کے سارے وجود میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر کمروں کی قطار کی طرف گئی۔ پھر اس نے داہنے طرف دیکھا۔ تیسرے کمرے کے دروازے پر بھی ویسی ہی چلمن پڑی ہوئی تھی۔ جیسی دوسرے کمروں پر تھی۔ وہ من ہی من میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ نیلم نے ازخود اسے بلا بھیجا تھا۔ پھر اسے خیال آتا کہ کہیں سازندے کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے کمرے میں چلا جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

اتنے سے وقت میں اس کے ذہن میں ہزاروں خیال آئے اور سینکڑوں اندیشوں نے اسے دہلایا لیکن اس کا یہ ارادہ سب پر بھاری تھا کہ اسے ہر صورت نیلم سے ملنا ہے۔ خواہ اس کی اسے کتنی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ وہ تو پہلے ہی اس جستجو میں تھا۔ اس پر یہ سبب اپنے آپ ہی بنا تھا۔ خواہ حقیقت تھی یا کوئی غلط فہمی کم از کم از اسے اس کا موقع مل رہا تھا کہ وہ نیلم کے ساتھ بات کر سکے۔

سجاول نے ماحول کا جائزہ لیا۔ سبھی اپنے آپ میں مگن تھے۔ نائیکہ پان لگا لگا کر کچھ لوگوں کو دیتے ہوئے ابروؤں کی جنبش اور آنکھ کے اشاروں میں رمز و کنائے کی گفتگو کر رہی تھی۔ دالان میں بھی کچھ لوگ بیٹھے آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سجاول نے موقع غنیمت جانا اور دوسروں کی نظر بچاتا وہ داہنی طرف سے تیسرے کمرے کے دروازے کے باہر جا پہنچا۔ اس نے جلدی سے چلمن ہٹائی۔ دروازے کے کواڑ ڈھیلے سے بند تھے۔ اس نے ذرا سا دھکیلا تو در وا ہو گیا۔ جالی کے مہین گلابی پردوں کے آر پار وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ سجاول نے پردہ ہٹایا اور اس کا عکس ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں

ابھرا۔ نیلم کے حسین عکس نے اسے آئینے میں سے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ''آ جاؤ۔''

سجاول کو قدرے حوصلہ ہوا اور اس نے ایک تیز نگاہ سارے کمرے پر ڈالی۔ وہ اس کی جانب پشت پھرائے بیٹھی تھی۔ اس کی پشت پر پڑی ہوئی لمبی سیاہ چوٹی میں موتیے کے گجرے گندھے ہوئے تھے۔ سارے کمرے میں موتیے کی سوگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سرخ دبیز قالین پر گن گن کر قدم رکھتا اس کے قریب پہنچا۔ وہ کچھ ہچکچا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح سے شروع کرے۔

وہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ آتشی بھڑکیلے لباس کو سمیٹتے ہوئے اٹھی۔ سجاول نے بغیر کسی تمہید کے چھوٹتے ہی کہا۔ ''تم نے مجھے بلایا تھا؟''

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور اس نے بغیر کوئی لفظ کہے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیوں......؟'' سجاول نے اکھڑ پنے سے پوچھا۔

''بس۔'' وہ مترنم ہنسی کے درمیان کہنے لگی۔ ''دل چاہ رہا تھا۔''

سجاول نے کچھ حیرت۔ کچھ چڑچڑے پن سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب......'' وہ دھیرے سے گنگنائی اور اپنے وجود کی دلآویز خوشبو لئے ہوئے اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ''لو...... مجھے پہچانو۔''

سجاول غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ ایک خوبصورت چہرہ تھا جس کے دلآویز نقوش کو سنگھار نے اور بھی سنوار دیا تھا۔ سجاول کے لئے وہ ایک حسین چہرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں اس کی شناخت کسی نام یا کسی یاد کے حوالے سے نہیں تھی۔

''نہیں۔ میں تمہیں نہیں پہچانتا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جیسے اسے اطلاع دی۔

اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اداس سا ہو گیا۔ ''اچھا تم بھول گئے ہو۔ میں تو تمہیں کبھی نہیں بھولی۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ ہوتے ہو۔''

سجاول نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور کھردرے سے لہجے میں بولا۔ ''سیدھی طرح بات کرو۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ اور یہ مکر کسی اور کے ساتھ کرنا۔ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ یہ سب تم کس کے اشارے پر کر رہی ہو۔''

''مجھے غلط نہ سمجھو۔'' اس نے سیاہ گھنیری پلکوں کو ہولے سے جنبش دی۔

''میں بھلا تمہارے ساتھ مکر کیوں کروں گی۔ آج اگر قسمت سے مل گئے ہو تو اتنی بے رخی سے بات نہ کرو۔''

سجاول مشکوک سا ہو گیا کہ وہ کسی جال میں تو نہیں پھنس گیا۔ یہ عورت نہ جانے کون تھی؟ وہ اس کو جانتا تک نہیں تھا۔ وہ کئی بار بھاگ بھری کی تلاش میں یہاں وہاں گیا تھا۔ کتنی ہی ایسی عورتوں سے ملا تھا۔ شاید یہ انہی میں سے کوئی ایک تھی۔ لیکن وہ اس کو نہیں پہچانتا تھا۔

سجاول نے متجسس نگاہیں سارے کمرے میں دوڑائیں تاکہ ماحول اور فضا کا جائزہ لے سکے۔ اس نے غالباً اس کی تشویش کو پہچان لیا اور ہنس کر کہنے لگی۔

''تم اتنے فکرمند کیوں ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہاں تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سجاول چوکنا ہو گیا اس نے آگے بڑھ کر نیلم کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی اور دانت پیس کر بولا۔ ''یہ کون ہے باہر...... بتا۔ یہ کون ہے؟''

نیلم نے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اور گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''شاید۔ شاید خالہ...... خالہ ہو گی۔''

''کون خالہ؟''

''میری گردن تو چھوڑو نا کہ میں کچھ بول سکوں۔''

سجاول کو یکلخت احساس ہوا کہ اس کی گرفت کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی تھی۔ نیلم کی شفاف پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ اس نے عجلت میں اس کی گردن چھوڑ دی اور خونخوار لہجے میں بولا۔ ''اگر تو نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو یاد رکھنا۔''

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی اور اس کے ساتھ ہی نائیکہ کی آواز بھی سنائی دی۔ ''نیلم او نیلم۔ جواب کیوں نہیں دیتی۔ دروازہ کھول باؤ دلشاد آیا ہے۔''

وہ ناراض یا خفا ہونے کے بجائے مسکرا دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی مرمریں گردن سہلاتے ہوئے اس نے لمبا سانس لیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ باہر خالہ ہے۔''

دستک پھر ہوئی اور نائیکہ کی آواز سنائی۔ ''نیلم دروازہ کیوں نہیں کھولتی۔ باؤ دلشاد تجھے پوچھ رہا ہے۔''

دلشاد کے نام نے پھر سجاول کو چونکایا۔ اس نے نیلم کی طرف دیکھا کہ اس کے انداز

کیا کہتے ہیں۔ دلشاد کا نام اس کے حسین چہرے پر کیسے رنگ بن کر چمکتا ہے لیکن اس نے دیکھا کہ اس کا رنگ کچھ خاص نہیں بدلا۔ اس نے اسے اشارے سے ایک طرف ہو جانے کو کہا اور خود جا کر دروازہ کھولنے لگی۔

سجاول جلدی سے کمرے کے ایک ایسے گوشے میں ہو گیا کہ اگر کوئی اچانک کمرے میں داخل ہو تو اسے نہ دیکھ سکے۔ اس نے خود کو کسی غیر متوقع صورتحال کیلئے تیار کر لیا۔

''خالہ۔ اس سے کہہ دے کہ میری طبیعت اچھی نہیں۔'' نیلم نے دروازے میں سے جھانک کر کہا۔

''وہ کب مانے گا۔'' نائیکہ کی آواز سنائی دی۔

''خالہ تو اس سے کہہ دے کہ آج میں نہیں مل سکتی۔ ٹال اسے کسی طرح۔'' نیلم کی آواز میں بیزاری کی جھلک تھی۔

''کچھ عقل سے کام لے نیلم۔ وہ روز کا آنے والا ہے۔''

''روز کا آنے والا ہے تو میں کیا کروں۔ کسی دن جان بھی تو چھوڑے نا۔ بس میں نے کہہ دیا ہے کہ میں آج اس سے نہیں مل سکتی۔'' نیلم کا لہجہ قطعی تھا۔

''تیرے پاس اندر ہے کون جو آج تیرے تیور ہی بدلے ہوئے ہیں۔'' وہ جہاندیدہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''تو خوامخواہ شک نہ کیا کر خالہ! بس کہہ دیا ہے نا کہ آج میرا جی اچھا نہیں ہے۔ بس کسی طرح اسے ٹال دے۔'' نیلم نے اتنا کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔ کنڈی لگائی۔ پردے برابر کئے اور چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

سجاول نے کان باہر کی آوازوں کی طرف لگا دیئے کہ دلشاد خاموشی سے چلا جاتا ہے یا کوئی ہنگامہ کھڑا کرتا ہے۔ لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ نیلم اس کی طرف متوجہ ہوئی اور ملائمت سے بولی۔ ''آؤ بیٹھ جاؤ۔''

دروازے پر پھر زوردار دستک ہوئی۔ سجاول نے مستفسرانہ نگاہوں سے نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھٹک کر غصے میں اٹھی اور دھڑ سے دروازہ کھول کر چلائی۔ ''کیا مصیبت ہے خالہ! دو گھڑی آرام کرنا بھی حرام ہو گیا ہے۔ اب کیا ہوا ہے؟''

''ہونا کیا ہے۔ وہ تیرا یار نہیں مانتا۔ دھرنا دے کر بیٹھا ہوا ہے۔ کہتا ہے دیدار کئے بغیر نہیں جاؤں گا۔ چل آ۔ تھوڑی دیر اس سے بات کر لے۔'' نائیکہ کی آواز سنائی دی۔

''کیا مصیبت ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔ پھر اس نے پلٹ کر سجاول کی طرف دیکھا اور آنکھ سے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ اپنے پیچھے کواڑ بند کرتی ہوئی وہ باہر نکل گئی۔

سجاول نے آگے بڑھ کر چٹخنی لگا دی۔ وہ عجیب گومگو کے عالم میں تھا۔ حالات کا یہ رخ اور نیلم کا التفات دونوں اس کے لئے ناقابل فہم اور حیران کن تھے۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ نیلم سے کہاں ملا تھا۔ اور وہ اسے اتنی اچھی طرح سے کیسے جانتی تھی۔ اس نے گہری نگاہ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک عام سی سجی سجائی خوابگاہ تھی جہاں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں تھی۔ اس نے دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف بھی دیکھا کہ اگر کوئی ہنگامہ ہو جائے تو کس طرف سے نکلنے میں آسانی ہو گی۔

دروازے پر کھٹکا سا ہوا۔ سجاول چوکنا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں سوچ کی ایک تیز رو دوڑی۔ کیا خبر دروازے کے اس طرف نیلم ہے یا کوئی اور۔ کہیں یہ کسی سازش کی کڑی تو نہیں تھی۔ وہ مستعدی سے چاروں طرف دیکھتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ دروازے پر پھر ہلکی سی دستک ہوئی اور نیلم کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''میں نیلم ہوں۔ دروازہ کھول دو۔''

سجاول نے چٹخنی گرائی اور خود ایک طرف ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور نیلم اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ سجاول نے اطمینان کا سانس لیا۔ نیلم نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''آؤ بیٹھو۔'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ کچھ تھکی تھکی سی لگتی تھی۔ سجاول نے اس کی پیش کش کو نظر انداز کر دیا اور کھڑے کھڑے بولا۔

''یہ دلشاد کون ہے؟''

نیلم نے کمان ایسے ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولی۔

''آؤ آرام سے بیٹھو تو سہی۔ پھر یہ بھی پوچھ لینا کہ دلشاد کون ہے؟''

سجاول ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیلم نے ریشمی پلنگ پوش پر اپنا مرمریں گداز ہاتھ پھیرا اور شوخی سے بولی۔ ''یہاں آ کر بیٹھو نا میرے پاس۔''

''فضول بک بک نہ کرو۔ سیدھی طرح سے میری بات کا جواب دو۔'' سجاول نے تیوری چڑھا کر برہمی سے کہا۔

وہ دھیمے سے ہنس پڑی۔ ''تم تو مجھ سے بہت ہی بے رخی برتتے ہو۔ خیر جیسی تمہاری مرضی۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ تمہیں تمہاری بہن بھاگ بھری مل گئی ہے؟''

سجاول پر جیسے بجلی سی آن گری۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا نہ رہ سکا اور تیزی سے اٹھ کر بولا۔ ''تمہیں یہ سب کس نے بتایا ہے؟'' وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور مفاہمت کے انداز میں بولی۔ ''اتنے پریشان کس لئے ہوتے ہو۔ مجھے تم ہی نے تو بتایا تھا۔ تمہیں یاد نہیں؟ جب تم نے آ کر میرا گلا دبا دیا تھا۔''

سجاول کو خوف سے پھیلی ہوئی ہراساں آنکھیں یاد آ گئیں۔ پلکوں پر چمکتا ہوا بھیگا ستارہ یاد آ گیا۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں اب بھی اس کی طرف ایک عجیب سی حسرت لئے دیکھ رہی تھیں۔ سجاول نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر ڈھے سا گیا۔ اسے اپنی ناکامی کے احساس نے جیسے مار دیا۔ اتنے طویل سفر میں اسے بھاگ بھری کہیں نہیں ملی تھی۔ اتنا کچھ جھیلنے کے باوجود وہ بھاگ بھری کے سختیوں کے دن نہیں کاٹ سکا تھا۔

نیلم کچھ دیر یونہی اسے مغموم سا بیٹھے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ہولے ہولے پاؤں دھرتی اس کے قریب آئی اور اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیرنے لگی۔ سجاول کو اس کے اس لمس میں ایک ملائم سی شفقت کا گداز محسوس ہوا۔ اس کا یہ التفات اسے ایک ڈھارس، ایک سہارا محسوس ہوا۔ اب سے چند لمحے پیشتر اس سے جو نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک نئی نئی سی موانست اور ایک انجانے تعلق میں بدل گئی۔ دکھ، مایوسی اور ملال کے اس لمحے میں وہ جیسے دکھ بانٹنے والی، مایوسیوں کو زائل کرنے والی اور ملائل میں شریک ہو جانے والی لگنے لگی۔

وہ اسی طرح سر پکڑے بیٹھا رہا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

وہ اس کے قریب کھڑی اس کے بالوں کو ملائمت سے سہلاتی رہی۔ نہ اس نے کچھ کہا نہ سجاول نے ہی اسے مخاطب کیا۔ وہ اپنے دکھوں میں گھلتا رہا۔ وہ اس کے دکھوں میں چپکے چپکے گھلتی رہی۔

پھر اس نے ہولے سے اس کا شانہ چھوا اور اتنی مدھم آواز میں بولی جیسے سناٹا ٹوٹ جانے سے ڈرتی ہو۔

''کچھ کہو تو سہی۔''

سجاول نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کیا کہوں۔ کہنے کو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ کہنے کو میں نے اتنا لمبا سفر کیا ہے۔ لیکن منزل کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا۔''

''بھاگ بھری کا کچھ پتہ نہیں چلا؟'' اس نے پوچھا۔

سجاول نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے ناخن چبانے لگا۔

''کھوئے ہوئے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ کبھی کبھی تو انہیں ڈھونڈنے میں عمریں بیت جاتی ہیں۔'' وہ افسردگی سے کہنے لگی۔

سجاول پر مایوسی کا غبار چھا گیا۔ بھاگ بھری کا مغموم چہرہ۔ اس کی آنسو بھری نگاہیں اس کی نگاہوں میں پھر گئیں۔ نہ معلوم اس کی قسمت میں اس سے ملنا تھا بھی یا نہیں۔ وہ کبھی اسے دنیا کے بے رحم ہاتھوں سے چھڑا بھی پائے گا یا نہیں۔

نیلم کچھ لمحے اس انتظار میں رہی۔ شاید وہ کچھ بولے گا۔ پھر خود ہی پوچھنے لگی۔ ''تم بھاگ بھری کے بارے میں سوچ رہے ہو نا۔''

سجاول نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ پر اسے تو جیسے زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے۔ کہیں اس کی خبر نہیں ملتی۔ کسی طرف اس کا کوئی نشان۔ کوئی اتہ پتہ نہیں۔''

''تم ہمت نہ ہارو۔ مایوس نہ ہو جاؤ۔ کوشش کرتے رہو۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تم اسے تلاش کرتے رہے تو کبھی نہ کبھی اسے ضرور پا لو گے۔ میرا دل کہتا ہے وہ تمہیں ضرور ملے گی۔'' نیلم اسے تسلی دینے لگی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ بغیر یہ سوچے، بغیر یہ جانے کہ یہ الفاظ کن ہونٹوں سے ادا ہو رہے ہیں۔ وہ لفظ اسے سکون دے رہے تھے۔ اسے ہارنے، اسے ٹوٹ کر بکھر جانے سے روک رہے تھے۔

وہ کچھ دیر یونہی بالکل چپ بیٹھا رہا۔ اچانک اس کی نگاہ گھڑی پر گئی۔ وہ چونکا۔ اسے یہاں آئے ہوئے کافی وقت ہو گیا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر اس پریشان خیالی سے پیچھا چھڑایا اور نیلم سے براہ راست ہی پوچھ لیا۔ ''یہ دلشاد کون ہے؟''

وہ اس غیر متعلق ذکر پر چونکی۔ ''تم دلشاد کا کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کوئی وجہ ہے تو پوچھ رہا ہوں۔'' سجاول نے سنجیدگی سے کہا۔

لیکن وہ ہنس پڑی۔ ''میں نے سمجھا شاید تم اس سے رقابت محسوس کر رہے ہو۔''

سجاول ہنس پڑا۔ ''تم اس بازار اور اس کے طور طریقوں سے کبھی باہر نہ نکلنا۔ اب جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا مجھے سیدھا سیدھا جواب دو۔''

''کیا؟'' اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''بھئی اس دلشاد کا پوچھ رہا ہوں جو تمہارے دیدار کے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔''

''اسی سے تم اندازہ لگا لو کہ وہ میرا کتنا بڑا پرستار ہے۔''

''ہوں..... اور تم۔'' سجاول نے ہلکی سی طنز کے ساتھ کہا۔

''میں۔'' وہ زخمی سی ہنسی ہنس کر بولی۔ ''میرا تو اعتبار ہی نہیں۔''

''نہیں۔ تم ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ وہ تو تمہارا دیوانہ ہے۔ کچھ تمہارے دل میں بھی اس کی جگہ ہے۔'' سجاول نے اس کے خوبصورت چہرے میں اس کے دل کو پڑھنے کی کوشش کی۔

وہ یکبارگی اداس سی ہوگئی۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتی رہی پھر شرمیلی دوشیزاؤں کی طرح آنچل کا پلو اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی بولی۔

''اگر میں کہوں کہ میرے دل میں کسی کی جگہ ہے تو وہ تم ہو تو تم کبھی نہیں مانو گے۔ ہے نا۔ کبھی میری بات پر یقین نہیں کرو گے۔ تم کبھی مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔'' اس نے دراز گھنیری پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی گہری اداسی جھیلوں میں ایک پیاسی آرزو کا کنول تیرنے لگا۔

کوئی اور لمحہ ہوتا تو شاید سجاول اسے جھڑک دیتا یا ڈانٹ دیتا۔ لیکن اب سے کچھ دیر پہلے جو اس کے ساتھ انجانا سا تعلق پیدا ہوگیا تھا اس نے اس کی بات کو التفات کے قابل بنا دیا۔ اس کے لہجے کے گداز اور اس کی آنکھوں کی التجا اس پر اعتبار کر لینے کو کہنے لگی۔ سجاول بے التفاتی نہ برت سکا اور ملائمت سے بولا۔ ''ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں نیلم۔ نہ تمہیں نہ مجھے۔''

''یہ کوئی کاروبار تو نہیں ہے جس میں نفع نقصان دیکھا جاتا ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ میں اس لئے نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم پر اپنا حق جتانا چاہتی ہوں۔ یہ تو میرے دل کی بہت گہری بات ہے۔ جسے میں صرف تمہیں بتانے کو ترس رہی تھی۔''

سجاول نے سر کو یونہی بے معنی سی جنبش دی۔ اسے ان لطافتوں میں الجھنے کی فرصت ہی کب تھی۔ وہ لمحے کے ایک بے حد چھوٹے سے حصے میں بھی کسی زلف کے سائے میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا تھا۔ وہ ہر طرح کے حالات اور جذباتی لمحوں سے گزرا تھا۔ اس کے نزدیک اب ان باتوں کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''نیلم! بس اس بات کو یہیں چھوڑ دو اور مجھے دلشاد کے بارے میں بتاؤ۔''

نیلم نے اپنے سیاہ گھنیرے بالوں میں انگلیاں الجھائیں اور غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جیسے ہارے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم دلشاد کے بارے میں اتنا کیوں پوچھ

رہے ہو؟''

''بس ایک وجہ ہے نا۔''

''اگر میں وجہ پوچھوں تو۔''

''وہ بھی تمہیں بتا دوں گا۔ لیکن تم پہلے میری بات کا تو جواب دو۔''

''تمہاری بات کا جواب۔'' اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

''تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ وہ مجھے ایک گھر دینا چاہتا ہے۔''

''واقعی۔''

''ہاں واقعی۔ کہتا تو وہ یہی ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ قول کا پکا ہے۔ وہ مجھے کوٹھے کی اس حالت سے نکال کر گھر کی عزت دینا چاہتا ہے۔'' وہ لفظ تول تول کر کہنے لگی۔

''تو پھر۔ اس میں دیر کیا ہے۔'' سجاول نے کریدا۔

''دیر۔'' اس نے ایک طویل سانس لیا اور تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔

''دیر تو میری طرف سے ہی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ ہم جیسی عورتوں پر مرد کبھی اعتبار نہیں کرتا۔ پھر معاشرہ کہاں جینے دیتا ہے۔ طعنے ملتے ہیں۔ لوگ سارے خاندان پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ یہ بات تو نسلوں تک چلتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں شرافت کی زندگی گزاروں لیکن ہر لمحے شبہات دور کرتی رہوں۔ اپنے ماتھے سے طوائف کا لیبل ہی مٹاتی رہوں۔ کل کو اگلی نسل پر بھی یہی الزام لگے گا کہ وہ طوائف کی اولاد ہیں۔ سجاول! میں اپنا عذاب آپ جھیلنا چاہتی ہوں۔ اکیلی۔ تنہا۔ میں اسے اگلے زمانے۔ اگلی نسل تک نہیں پہنچانا چاہتی۔''

سجاول کو اس کی باتوں میں حقیقت کی آنچ محسوس ہوئی۔ اس نے افسردہ ہو کر سوچا کہ یہاں ہر کوئی اپنی ہی مجبوریوں میں یوں زندہ چنا ہوا ہے کہ چاہے بھی تو اس حصار سے نہیں نکل سکتا۔ اس نے تاسف سے سر جھکا اور چند لمحے خاموش ہی رہا۔

نیلم بھی چپ بیٹھی رہی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب آ کر اپنا کنول ایسا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر بولی۔

''سجاول۔ آؤ کچھ اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آج تم اتفاقاً مل گئے ہو تو اس وقت کو یوں سوگ میں برباد نہ کرو۔ اسے کم از کم میرے لئے ایک حسین یاد بنا دو جس کے آسرے میں زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنا لوں گی۔''

وہ نیلم سے جلد ہی رخصت ہو گیا۔ حیات کی تلخیوں کا ذائقہ اس کے رگ و پے میں اس طرح گھلا ہوا تھا کہ اسے معنبر زلفوں کی چھاؤں، گداز بانہوں کا سایہ اور کسی دلنشیں پہلو کی ہم نشینی اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے نیلم کی باتیں کچھ سنیں کچھ ان سنی کر دیں۔ وہ نہ جانے کب سے کسی دل کے محرم کو ترسی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دل کی ساری باتیں، اپنے سب سے میٹھے نغمے اور محبت کے سب سے اجلے لفظ اس کے ہمراہ کر دیئے۔ وہ چلنے لگا تو وہ جلدی سے اٹھی۔

''ذرا ٹھہرنا۔''

سجاول نے مڑ کر دیکھا۔

''کیوں! کیا کچھ اور بھی کہنے کو رہ گیا ہے۔''

''ہاں۔ ایک بہت ضروری بات۔'' اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سے اپنے زیورات کا بکس کھولتے ہوئے کہا۔

سجاول نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ اس بکس میں سے کوئی چیز نکال کر اس کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک سستا سا دھات کا چھلا اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولی۔

''سجاول۔ یہ میرا چھلا ہے۔ یہ میں نے اس وقت ایک میلے سے خریدا تھا جب میں ابھی ستارہ نہیں بنی تھی۔ یہ چھلا مجھے یاد دلاتا رہتا ہے کہ کبھی میں بھی ایک سیدھی سادی شریف لڑکی تھی۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے سجاول۔ میں نے تمہیں بھاگ بھری بن کر چاہا ہے اور بھاگ بھری کی سب سے قیمتی متاع یہی ہے۔ اسے تم رکھ لو۔ میری نشانی سمجھ کر۔ شاید یہ کبھی تمہیں میری یاد دلا دے۔''

سجاول نے اسے انگلیوں میں تھام کر دیکھا اور اپنی چھوٹی انگلی میں پہننے کی کوشش کی

لیکن وہ ننھا سا چھلا اس کی بھاری کھردری انگلی میں پھنستا بھی نہیں تھا۔ نیلم کی چمکتی آنکھوں کی جوت مدھم سی پڑ گئی۔ وہ اداسی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

سجاول نے چھلا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''نیلم! میں اسے کہاں سنبھالتا پھروں گا۔ تم اسے اپنے پاس ہی رہنے دو۔ اگر یہ میری انگلی میں آ جاتا تو ٹھیک تھا مگر اب میں اسے کہاں رکھوں گا۔ تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ میرے پاس تو یہ گم ہو جائے گا۔''

نیلم نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گئی۔ سجاول بھی کوئی لفظ بولے بغیر پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے دن کی روشنی میں کوئی نیلم کے کوٹھے سے اترتا دیکھے۔ اسی لئے وہ اندھیرے اندھیرے ہی نکل آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے واپس قبرستان پہنچ جائے گا۔ نیلم نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ دلشاد سے بات کر کے اسے قائل کرے گی کہ وہ نور کی طرف لوٹ جائے۔ اسی لئے اس نے دلشاد سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور تیز قدموں کے ساتھ بازار میں سے گزرا۔ بازار میں اس وقت اکا دکا لوگ ہی تھے۔ اور ان میں سے اکثر نشے میں دھت لڑکھڑاتے ہوئے راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سر جھکایا اور قدموں کو کچھ اور تیز کیا وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جائے۔

دفعتاً پان سگریٹ کے ایک کھوکھے کی اوٹ میں سے کوئی بھاری شے اس کی گدی پر اتنے زور سے لگی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے شرارے سے ناچ اٹھے۔ اسے چکر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا ایک وار اور ہوا۔ اس کے ہونٹوں سے آواز بھی نہیں نکلی اور وہ وہیں ڈھے گیا۔

⁂

دروازہ کھلتے ہی بلند آہنگ موسیقی کا شور، تمباکو کی خوشبو اور سگریٹ کے دھوئیں کا ایک مرغولا سا ان کی طرف لپکا۔ بخت آور یہ سوچ کر سنبھل گئی کہ اس کمرے میں اس گھر کے مکین موجود ہوں گے۔ شہر یار اسے ہمراہ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور کمرے میں موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''ہیلو بوائز۔''

قالین پر اوندھے، سیدھے، آڑھے ترچھے لیٹے اور بیٹھے ہوئے لڑکوں کی آنکھیں ان پر مرکوز ہوئیں۔ ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ لہرایا جس میں اس نے جلتا ہوا سگریٹ پکڑ رکھا تھا اور زور سے چلایا۔

''ویل کم۔ ویل کم۔ خوش آمدید۔ چشم ماروشن دل ماشاد۔''

''آپ ہیں۔ میڈم بخت آور۔'' اس نے بخت آور کو دونوں شانوں سے پکڑ کر سب کے سامنے کر دیا۔ وہ سب سیدھے ہو بیٹھے اور اشتیاق اور دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بخت آور نے دیکھا کہ وہ تعداد میں چار تھے۔ اور سب کے سب شہریار کے ہم عمر تھے۔

''یہ ہماری مہمان ہیں۔ کچھ روز ہمارے ساتھ رہیں گی اور اب تم سب انہیں الوؤں کی طرح دیکھنے کے بجائے اپنا اپنا تعارف کراؤ۔ جلدی جلدی۔ فٹا فٹ۔''

صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے ایک عام شکل وصورت کا لڑکا ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔

''مجھے شجاع کہتے ہیں۔'' اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

''میں پاشا ہوں جی۔'' ننھی منی داڑھی والا ایک لڑکا بولا۔

''میرا نام بوبی ہے۔'' تیسرے نے کہا۔ اس کی گھنی مونچھیں اس کے ہونٹوں پر جھکی ہوئی تھیں اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے کو چونکایا جو تھوڑی گردن میں گھسائے بیٹھا تھا۔ وہ کشادہ پیشانی اور گھنگھریالے بالوں والا وجیہہ نوجوان تھا۔

''یہ سمارٹ ہے جی۔'' بوبی نے اس کے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوا۔ اسی طرح بیٹھا رہا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' شہریار نے پوچھا۔

''یہ آج لمبی پرواز پر ہے۔ اس نے دو سگریٹ چڑھائے ہیں۔''

بخت آور اندر ہی اندر پریشان سی ہوگئی۔ لیکن اس نے ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسے اس بات نے شدید الجھن میں ڈال دیا تھا کہ وہ سب کے سب لڑکے یہاں کیا کر رہے ہیں۔

''تشریف رکھئے۔'' بوبی نے خوش اخلاقی سے کہا۔

شہریار نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ بخت آور کچھ متذبذب سی اس پر بیٹھ رہی۔ شہریار پاس ہی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ تینوں بھی کھسکتے ہوئے قریب آ گئے صرف سمارٹ دیوار کے سہارے اسی طرح گرد و پیش سے بے خبر رہا۔

''میڈم! ہم یہاں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' پاشا نے مسکرا کر کہا۔

''میڈم! آپ کے آنے سے ہمارے اس غریب خانے میں بہار آ گئی ہے۔'' شجاع بولا۔

''میڈم۔ آپ بہت خوبصورت ہیں۔'' بوبی نے کہا۔

بخت آور ان کی بھانت بھانت کی بولیوں اور بے باک نگاہوں سے پریشان سی ہو گئی۔ شاید وہ کسی غلط جگہ آ گئی تھی۔ شاید اس نے شہریار کے ساتھ آ کر غلطی کی تھی۔ لیکن اب تو وہ یہ قدم اٹھا چکی تھی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ نباہ کرنا تھا۔ اس نے اپنے لہجے کو نارمل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''شہریار! تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کس کا گھر ہے؟ یہاں کون لوگ رہتے ہیں؟ اور تم سارے شریر بچے یہاں اکٹھے ہو کر کیا کر رہے ہو۔''

اس نے جان بوجھ کر انہیں کم عمری کا احساس دلانے کی کوشش کی تا کہ ان کے اور اس کے درمیان ایک بزرگانہ فاصلہ برقرار رہ سکے۔

''ایک۔ دو۔ تین۔ آپ نے تین سوال کئے ہیں۔'' پاشا نے انگلیوں پر گن کر بتایا۔

''آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ مالک مکان کا گھر ہے۔'' شجاع بولا۔

''دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں صرف ہم لوگ ہی رہتے ہیں۔'' شہریار نے کہا۔

''اور آپ کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت ہم سارے شریر بچے اکٹھے ہو کر صرف اور صرف آپ کا انتظار فرما رہے تھے کیونکہ شیری نے ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ آپ کو لینے جا رہا ہے۔'' بوبی گویا ہوا۔

''لیکن۔ تم لوگ یہاں اکیلے...... میرا مطلب ہے بالکل اکیلے رہتے ہو؟'' بخت آور نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' پاشا نے سعادت مندی سے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''اکیلے۔ بالکل اکیلے۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں۔''

''اور تمہارے والدین۔ بہن بھائی۔ گھر کے دوسرے لوگ......؟''

''گھر، والدین۔ بہن بھائی وغیرہ وغیرہ یہ سارے لفظ۔ یہ سارے رشتے ہماری اشیری اور ہماری زندگی میں نہیں۔ بالکل نہیں۔'' بوبی نے ہاتھ بلند کر کے نفی میں سر ہلاتے

ہوئے کہا۔

"نہ ہماری کسی کو ضرورت ہے نہ ہمیں کسی کی ضرورت ہے۔" شجاع نے ہانک لگائی۔

"دیکھئے میڈم۔ سارٹ کو ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ بوبی کو اس کے ڈیڈی نے دھکے دے کر گھر سے باہر کر دیا۔ اس بچارے پاشا کے گھر کی آبادی ہی اتنی ہے کہ اس کے لئے اس کے گھر میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ شجاع کو ویسے ہی اپنے گھر کی فضا راس نہیں آتی۔ رہ گیا یہ خاکسار۔ آپ کا خادم تو یہ تو بنجارہ ہے۔ کبھی یہاں...... کبھی وہاں...... کبھی کہاں۔"

شہریار نے بڑے ڈرامائی انداز میں تفصیل سے بتایا۔

"مگر اس جگہ کا کرایہ۔ تمہارے کھانے پینے کا کیا ہوتا ہے؟" بخت آور نے سوال کیا۔

"وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔" پاشا بولا۔

"چھوڑیئے میڈم اس ایک دو کے چکر کو۔ یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔" بوبی لاابالی پن سے بولا۔

"نہیں بھئی۔ اب مجھے یہاں کچھ روز رہنا ہے تو مجھے اس بارے میں کچھ معلوم تو ہونا چاہئے نا۔"

"سمندر میں غوطہ لگا کر ہی اس کے اسرار سمجھ میں آتے ہیں۔ آپ بھی یہاں رہیں گی تو رفتہ رفتہ سب کچھ جان جائیں گی۔ ابھی سے کیوں فکر میں پڑتی ہیں۔" شہریار نے لقمہ دیا۔

بخت آور کو اطمینان نہیں ہوا۔ وہ ابھی کچھ کہا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ایک آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"روشی...... روشی۔ تم اب تک کہاں تھیں میری جان۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" سارٹ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" بخت آور نے پریشان ہو کر کہا۔

"بتایا نہیں آپ کو۔ یہ سارٹ ہے۔ بے چارہ...... محبت کا مارا ہے۔" شہریار نے اطلاع دی۔

"روشی...... مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا تم سب کچھ ٹھکرا کر میرے پاس ضرور آؤ گی۔ مجھے یقین تھا۔" وہ سرخ آنکھوں سے اس کی طرف ایک ٹک دیکھتا اسی طرف لڑکھڑاتا ہوا چلا آتا تھا۔

"شہریار! سمجھاؤ اسے کچھ۔" بخت آور نے گھبرا کر کہا۔

"آپ گھبرائیں نہیں۔ یہ یوں ہی بک جھک کر خاموش ہو جائے گا۔ اسے دن میں ایک آدھ مرتبہ روشی کا دورہ ضرور پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

اس نے قریب آ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "روشی! میری جان! شکر ہے تم آ گئیں۔"

"کٹ۔" شجاع نے نعرہ مارا۔

"بس۔ بس یار اب ہوش میں آ جا۔ سین او کے ہو گیا ہے۔" بوبی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"اوئے یار اب اس روشی کی تسبیح کرنا چھوڑ دے نہیں تو اس کا باپ تیری ٹانگیں توڑ دے گا۔" پاشا نے اس کا شانہ ہلایا۔

"نہیں نہیں۔ تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ دیکھو روشی آ گئی ہے۔ اب اس کا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ خود میرے پاس آ گئی ہے۔" اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بس کر یار! یہ روشی روشی سن کر تو کان پک گئے ہیں۔" بوبی نے بیزاری سے کہا اور اسے پھر وہیں بٹھاتے ہوئے بولا۔

"چلو یار! اچھی سی چائے کا انتظام کرو۔ میڈم کا آج یہاں پہلا دن ہے۔"

بخت آور نے ان کے اور اپنے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ زیادہ گھلی ملی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اسے ان سب کے درمیان رہنا بہت عجیب اور پراسرار سا لگتا تھا۔ وہ سب کے سب لڑکے عمر میں بھی اس سے چھوٹے تھے اسی لئے وہ ان پر اپنے بڑے پن کا رعب بھی جما لیتی تھی۔ وہ سب کے سب اس کے التفات کے خواہاں تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

اسے بظاہر یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن اس کے لئے دن بھر بیکار بیٹھنا بھی دوبھر تھا۔ کھانا وہ بازار سے لے آتے تھے۔ صفائی کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔ دوسرے تیسرے دن ایک صفائی کرنے والا آتا جو تمام گھر کو اچھی طرح جھاڑ پونچھ دیتا۔ مالی باہر لان میں کام کرتا رہتا۔

ان سب کی دنیا عجیب تھی۔ چھوٹی سی آزاد دنیا جس میں سب آزاد منچلے اور اپنی مرضی کے مالک تھے۔ نہ کوئی روک ٹوک، نہ کسی کا ڈر نہ خوف۔ وہ سب کے سب اپنے پسندیدہ انداز میں زندگی گزار رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں کوئی فکر، کوئی اندیشہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ

اپنی مرضی سے سوتے، مرضی سے جاگتے۔ کبھی دن بھر سوتے رہتے اور راتوں کو جاگتے۔ کبھی تاش کھیلتے، کبھی ناچتے، کبھی گاتے، کبھی اودھم مچاتے اور ایک دوسرے سے بات بے بات لڑتے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ لیکن بخت آور ایک جگہ پر ٹھہر گئی تھی۔ مستقبل کی فکر اسے ہر لمحہ پریشان رکھتی تھی۔ مگر شہریار اس سلسلے میں زیادہ سنجیدہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جب بھی اس موضوع کو چھیڑتی وہ بات گھما پھرا کر کہیں اور لے جاتا۔ بخت آور اکتا جاتی۔

''شیری تم بھی اپنے اس انکل کی طرح مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ یاد رکھو اب میں تمہاری پروا بھی نہیں کروں گی۔ میں خود ہی کسی طرف نکل جاؤں گی میں تمہاری محتاج بن کر نہیں رہ سکتی۔''

''اوہو ہو ایسی حماقت نہ کیجئے گا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''آپ کو پتہ ہے کہ اسی بلاک میں قبلہ وکعبہ انکل بھی رہتے ہیں۔ کہیں ملاقات ہوگئی تو پھر آپ ہی بھٹکیے گا۔''

''کیا مطلب؟'' بخت آور الجھی۔

''آسان لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ قبلہ وکعبہ انکل اس کوٹھی سے کوئی پانچ چھ نمبر پرے رہتے ہیں۔ کہیں آپ کی ان سے ہی ملاقات نہ ہو جائے۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔'' بخت آور کو یقین نہیں آیا۔

''یہ ہوسکتا نہیں ہو رہا ہے اور اس لئے ہو رہا ہے کہ جس چیز کو چھپانا ہو اسے بالکل عین سامنے رکھ دینا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے یہاں کھوئی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈنے کے لئے دور تک جانے کا رواج ہے۔ نزدیک کوئی نہیں دیکھتا۔ قبلہ انکل تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آپ ان کی ہمسائی بھی ہوسکتی ہیں۔''

بخت آور حیران رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شہریار اتنا ہوشیار ہوسکتا ہے۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلا اور بوبی اندر داخل ہوا۔

''شیری...... باس آرہا ہے۔''

''باس۔'' شہریار گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''ہاں باس۔'' بوبی نے دہرایا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' شہریار نے عجلت میں سوال کیا۔

''پیغام آیا ہے۔'' بوبی نے آنکھ سے کوئی اشارہ کیا۔

''اوئے۔ مارے گئے۔'' شہریار نے سر جھٹکا۔

''مجھے ابھی تھوڑا اکاؤنٹ بھی چیک کرنا ہے۔''

''جلدی کرو۔ جلدی۔ دوڑو نہیں تو چمگادڑ بنے نظر آؤ گے۔'' بوبی نے چٹکی بجائی۔ تو شہریار واقعی دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

بخت آور کو ان کی گفتگو سن کر تعجب ہوا۔ باس کا ذکر آج اس نے پہلی بار سنا تھا۔ شہریار جس طرح اس کا نام سن کر بدحواس ہوا تھا اس سے بخت آور کو اس کی شخصیت کے بارے میں اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی۔ وہ متفکر سی ہوگئی۔ وہ لوگ اسے کچھ زیادہ ہی پراسرار معلوم ہونے لگے۔ اس نے غور سے بوبی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی گھنی مونچھوں کو بل دیتا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سرد کر دینے والی چمک تھی۔ اس کی سیاہ مونچھوں میں چھپا ہوا ہونٹ مسکرایا۔

''آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

بخت آور نے اس کی بات کو نظرانداز کر دیا۔

''باس کون ہے؟''

''باس کو گولی ماریں۔'' اس کی نگاہیں اس کے وجود کو کھردرے پن سے چھونے لگیں۔ وہ اس کے عین مقابل کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''میڈم! کبھی تھوڑا سا وقت ہمیں بھی تو دیا کریں نا۔''

بخت آور کو جھرجھری سی آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک ڈرا دینے والی وارفتگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''یہ گھر صرف شہریار ہی کا نہیں۔ آپ یہاں رہتی ہیں تو آپ کو ہم سب کو وقت دینا چاہئے۔ ہم سب یہاں اکٹھے رہتے ہیں۔ ہم ہر چیز میں برابر کے حصے دار ہیں۔ آپ پر ہمارا بھی حق ہے۔ آپ اکیلے شہریار کی ملکیت نہیں ہیں۔''

''میں کسی کی ملکیت نہیں ہوں سمجھے تم۔'' بخت آور نے پیچھے ہٹ کر درشتی سے کہا۔

''نہ ہی میں کوئی چیز ہوں جسے تم برابر سے تقسیم کرلو۔ آئندہ اس قسم کی بات نہ کرنا۔''

وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

''آپ جہاں تھیں نا اور جو کچھ تھیں ہمیں سب معلوم ہے۔ سب جانتے ہیں ہم۔ اس لئے آپ کو زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔'' اس کا چہرہ اس کے لہجے کی ملائمت سے میل نہیں کھا

رہا تھا۔ اس کی نظروں میں سختی اور بے رحمی تھی۔

بخت آور کو اس کی بات نے چور چور کر دیا۔ رسوائیوں کے یہ داغ شاید اس کی پیشانی سے کبھی نہیں مٹ سکتے تھے۔ وہ کتنا بھی سفر کیوں نہ طے کر لیتی اس بازار میں گزرے ہوئے دنوں سے بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور تپتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں تمہاری کسی نیچ بات کا جواب نہیں دینا چاہتی۔ ہاں اتنا سن لو کہ میں بہت جلد یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

وہ حقارت سے ہنسا۔ ''آپ کہیں نہیں جا سکتیں۔''

''میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔'' بخت آور نے غصے سے کہا۔

''آپ پابند ہیں۔'' وہ جیسے چڑاتے ہوئے بولا۔

''میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔'' بخت آور نے شدید غصے میں کہا۔

''کہاں ہے شہریار! اسے بلاؤ۔ میں ابھی یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

بوبی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''میڈم! اب آپ کے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا۔ شہریار کیا اس کا باپ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب آپ کے متعلق باس فیصلہ کرے گا کہ آپ کو کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔''

بخت آور بھونچکی سی رہ گئی اس نے پریشانی سے بوبی کی طرف دیکھا۔ وہ اونچا لمبا مرد جیسے ایک دیوار کی طرح اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ بخت آور کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی جال میں پھنس گئی ہے۔ کسی شکنجے میں کس دی گئی ہے۔ بے بسی کی کیفیت میں اس نے سر پکڑ لیا۔

''میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ آپ ہم سب کے ساتھ بہت خوش رہیں گی۔'' بوبی نے اس کے بالوں کو ہلکے سے چھو کر کہا۔ بخت آور نے سر جھکا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور شجاع نے اندر جھانکا۔

''کن چکروں میں ہو تم۔'' اس نے پاجی پن سے آنکھ دبائی۔

''کیا خبر ہے؟'' بوبی نے پوچھا۔

''باس پانچ منٹ میں پہنچنے والا ہے۔ تم انہیں لے کر چلو۔ جلدی۔ جلدی...... جلدی۔'' اس نے چٹکی بجائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''چلئے میڈم۔ پلیز۔'' بوبی نے طنزیہ لہجے میں خم ہو کر کہا۔

بخت آور کیلئے انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی اور بوبی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ نہ انکار کر سکتی تھی نہ کوئی اعتراض۔ نہ کچھ پوچھ سکتی تھی نہ کچھ کہہ سکتی تھی۔ شہریار پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا اور وہ بوبی کے ساتھ چلنے پر مجبور تھی۔

یہ سوچتی ہوئی کہ باس نہ جانے کون ہے؟ نہ جانے اس نے اس کے لئے کون سا جال تیار کر رکھا ہے۔ قسمت کے ترکش میں اب اس کے لئے کون سا تیر تھا۔

طویل راہداری طے کر کے بوبی نے ایک کونے میں پڑی ہوئی الماری کو کھولا اور اس کے اندر یوں داخل ہو گیا جیسے کوئی دروازہ ہو۔ بخت آور حیران سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بوبی نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور بولا۔

''آجایئے۔''

بخت آور نے ڈرتے ڈرتے الماری کے اندر قدم رکھا۔ بظاہر وہ الماری ہی معلوم ہوتی تھی لیکن اس کے اندر ایک خفیہ دروازہ تھا۔ بخت آور کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک ایسی بھول بھلیاں میں پھنس گئی ہے جس سے باہر نکلنے کا شاید اسے کوئی راستہ نہ ملے۔ وہ بددل اور پژمردہ سی اس کے پیچھے پیچھے یوں پاؤں دھر رہی تھی جیسے موت کے سفر پر جا رہی ہو۔

یہ دروازہ ایک تہہ خانے کے زینے پر کھلتا تھا جس کی نیم تاریک فضا سگریٹوں کے دھوئیں اور تمباکو کی بو سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سب کے سب قالین پر یہاں وہاں بکھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ بخت آور نے ایک تیز نظر سے چاروں طرف باس کی جستجو میں دیکھا لیکن ابھی اس کی آنکھیں نیم تاریکی میں صاف طور پر دیکھنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں اس لئے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا۔

''آجاؤ۔'' ایک بھاری آواز کی گونج سارے تہہ خانے میں پھیل گئی۔

0......0......0

سجاول غفلت سے ہوشیار ہوا تو اس کے سر کے پچھلے حصے میں درد تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور منہ کا ذائقہ کسیلا سا ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن ابھی تک ماؤف تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش دیکھا وہ ایک بے سر و سامان کمرے میں پڑی ہوئی چارپائی پر پڑا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کی۔ اسے ایک ایک کر کے سارے واقعات یاد آنے لگے کہ کس طرح

اس پر حملہ ہوا تھا اور پھر سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

اس وقت بھی اس کے چاروں طرف نیم تاریکی ہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی تہہ خانے میں ہے۔ سجاول کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس خیال نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے کہ بالآخر وہ دشمنوں کے ہاتھ آ ہی گیا تھا۔ پر یہ کون لوگ تھے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ ملاں کے لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ وہی اس کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر گھبرایا ہوا سا رہا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ سارے وسوسوں اور اندیشوں کو ذہن سے جھٹک کر اپنے حواس بحال کئے اور یہ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس نے اپنے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا۔ نہ ہی خوف اور پریشانی کو خود پر مسلط ہونے دیا۔ اس نے خود کو ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کیلئے تیار کر لیا اور اٹھ کر دروازے پر دستک دے ڈالی تا کہ تذبذب اور بے یقینی کی اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کر کے اور اسے اندازہ ہو سکے کہ وہ کن لوگوں کے چنگل میں ہے۔

دروازہ فوراً ہی یوں کھل گیا جیسے کوئی دروازے کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ سجاول چوکنا ہو گیا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور اس کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ ایک ملازم پیشہ شخص اندر آیا۔ اس کے کاندھے پر رائفل تھی اور اس کے چہرے پر درشتی۔ اس کی بھنویں جیسے بدمزاجی سے تنی ہوئی تھیں۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے سختی سے حکم دیا۔

سجاول اپنے بے ضرر ہونے کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے بغیر کسی تعرض کے تعمیل کی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔

”کچھ روٹی پانی چاہئے؟“

اس کے پوچھنے پر سجاول کو بھی بھوک کا خیال آیا۔ لیکن اس سے بڑھ کر سگریٹ کی طلب تھی۔ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”یار! پہلے ایک سگریٹ تو پلاؤ۔ پھر کھانا بھی لیں گے۔“

اس شخص کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت ابھری۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال کر اس کی طرف اچھالی۔ سجاول نے سگریٹ سلگایا اور دو تین لمبے لمبے کش لئے اور اس سے بولا۔

”ہاں یار! اب کوئی روٹی پانی کا بندوبست بھی ہو جائے تو کیا ہی کہنے۔“

وہ شخص اب بھی اس کے اطمینان پر کچھ متعجب سا اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ سجاول کو کچھ تسلی ہوئی کہ وہ جن لوگوں کے چنگل میں بھی تھا۔ وہ کم از کم اس سے شریفانہ برتاؤ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن ابھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔

سجاول کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ شخص جلد ہی ایک ٹرے میں کھانا لے آیا اور اس کے سامنے رکھ کر پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔ کھانا کچھ زیادہ برا نہیں تھا۔ پھر سجاول کو بھوک بھی لگی تھی۔ اس نے رغبت سے کھایا اور برتن ایک طرف رکھ کر پھر دروازے پر دستک دے ڈالی۔ اس کا پہرے دار شاید چوکنا تھا۔ کیونکہ اس کی دستک کے جواب میں اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے اکھڑ پن سے سوال کیا۔

”یہ برتن لے جاؤ۔“ سجاول نے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور مجھے بتاؤ کہ میں کس کا مہمان ہوں؟“

اس نے برتن اٹھاتے ہوئے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بے رخی سے کہنے لگا۔

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

”اچھا۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں۔“ سجاول نے تمسخر سے کہا۔

”تو بھولے بادشاہو۔ ان سے پوچھ کر آؤ جنہوں نے تمہیں میرے پہرے پر بٹھایا ہے۔ میرا وقت بڑا قیمتی ہے۔“

اس نے تیوریوں پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے جانے کیلئے مڑا۔ سجاول نے عقب سے کہا۔

”یار! ایک چائے کا پیالہ بھی لیتے آنا۔“

کھانا کھانے اور سگریٹ پینے کے بعد وہ تازہ دم ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ روشندان کی بلندی کا اندازہ لگایا لیکن کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے وہ باہر نکل سکتا۔

مقدر کی عنایت نے اسے اس جال میں لا پھینکا تھا۔ وہ کہاں سے چلا تھا؟ اور کہاں آن پہنچا تھا؟ اس کے سارے کام ادھورے اور تکمیل کو ترس رہے تھے۔ اس خیال نے اسے

افسردہ اور بددل کر دیا۔ وہ بے چین سا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا کہ دروازہ کھلا اور اونچے قد کا ایک خوش پوش آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

سجاول نے تنقیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے کس طرح مخاطب کرتا ہے۔ اس شخص نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

''اوئے سردارے۔ چائے لے آ۔''

اس نے سجاول کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سردارا چائے کے دو کپ انہیں تھما کر کمرے سے باہر نکل گیا تو وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔

''تم نے چائے مانگی تھی نا۔ لو پیو۔''

سجاول نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔

''تمہاری مہربانی لیکن یہ تو بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ تم کس کے بندے ہو؟''

''ہم اللہ کے بندے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

سجاول کو بھی اس برجستگی پر ہنسی آ گئی۔

''بندے تو سب ہی اللہ کے ہیں۔ مگر یہاں اللہ کی مخلوق کے بندے بننے کا زیادہ رواج ہے۔ تم میری مہمان داری کرنے تو مجھے یہاں لائے نہیں ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ نہ تمہارا وقت ضائع ہو نہ میرا۔''

''تو ٹھیک ہے بھائی! تجھے جلدی ہے تو ہمارے پاس بھی وقت نہیں۔ بس تم بھی سیدھے سیدھے یہ بتاؤ کہ نیلم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' اس کے چبھتے ہوئے لہجے کا انداز تحکمانہ تھا۔

سجاول نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان لوگوں کا تعلق ملاں سے نہیں تھا۔ ورنہ وہ نیلم کی بات نہ کرتے۔ یقیناً وہ نیلم کے چاہنے والوں میں سے کوئی تھا۔ جو نیلم کو اس پر مہربان دیکھ کر برہم ہو گیا تھا۔ سجاول نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم دلشاد تو نہیں؟''

دلشاد کے نام پر وہ شخص چونک سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ اس

کے جواب میں فوراً ہی کچھ نہیں کہہ سکا۔ لیکن اس نے کچھ عجیب، کچھ متذبذب اور پرتشویش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سجاول کو اندازہ ہو گیا کہ وہ دلشاد نہیں ہے۔ وہ شخص فوراً ہی سنبھل گیا اور دبنگ لہجے میں بولا۔

''تم میری بات کا جواب دو۔ جو میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ۔''

''اگر تم دلشاد نہیں ہو تو دلشاد سے کہو کہ خود مجھ سے ملے۔ اور جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لے۔''

اس شخص نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہی رہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

۞......۞......۞

چوڑی پیشانی، گھنگھریالے سیاہ بالوں اور بل کھائی ہوئی گھنی مونچھوں والا اونچا لمبا شخص دلشاد تھا۔ اس کی سرخ ڈوروں والی خمار آلود آنکھوں میں رقابت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ اس نے حقارت سے سجاول کی طرف دیکھا اور ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن اس کی کڑی نگاہوں نے اس کی غرور سے تنی ہوئی گردن نے سجاول پر ظاہر کر دیا کہ وہ دلشاد ہے۔

وہ بیٹھا نہیں۔ کرسی پر پاؤں دھر کر کھڑا ہو گیا اور اکھڑ پنے سے بولا۔

''ہاں کہو۔ کیا کہتے ہو۔ میں دلشاد ہوں۔''

سجاول نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔ وہ بہترین لباس پہنے ہوئے تھا جو اس کے وجیہہ سراپے پر بہت جچ رہا تھا۔ سجاول کو اس کا یہ پرغرور انداز اچھا نہیں لگا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس سے بالکل مرعوب یا متاثر نہیں ہوا اور پراعتماد لہجے میں بولا۔

''مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم دلشاد ہو۔ اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو آرام سے بیٹھ کر کرو۔ یہ فرعونوں کی طرح کسی اور کے سامنے کھڑے ہونا۔''

دلشاد کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگے۔ اس نے ایک طویل سانس یوں کھینچا جیسے سانپ پھنکار مارتا ہے۔ اس نے پاؤں سے ہی ایک کرسی کو دھکیلا اور بڑے ٹھسے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

سجاول نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

''ہاں یار! پوچھو۔ تم نیلم کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتے ہو۔'' وہ اس کی دکھتی رگ

چھیڑ کر اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ نیلم کے بارے میں کس حد تک سنجیدہ ہے۔

دلشاد نے دانت پیسے اور لفظ چبا چبا کر بولا۔

''میں بات میں ہیر پھیر کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ تم مجھے سیدھی طرح بتا دو کہ نیلم سے تمہارا کیا معاملہ ہے؟''

''معاملہ کچھ نہیں ہے یار! ہم تو اس لین کے بندے ہی نہیں۔'' اس نے بے نیازی سے اسے الجھانے کو کہا اور عمداً خاموش ہو گیا۔

دلشاد تلملایا اور اس نے بیکلی سے پہلو بدلا اور دانت بھینچ کر بولا۔

''تمہاری اس سے کوئی پرانی جان پہچان ہے؟''

''تم اس بات کو چھوڑو۔ جان پہچان ہے یا نہیں میں تو یہاں تمہاری کھوج میں آیا تھا۔ اسی لئے اس کے کوٹھے پر چلا گیا تھا کہ پتہ چلا تھا کہ تمہارا وہاں بہت آنا جانا ہے۔''

دلشاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''سنا ہے تمہاری استانی نور سے رشتہ داری ہے؟''

دلشاد بڑے زور سے چونکا اور ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

''تم نور کو کس طرح جانتے ہو؟ کہاں ہے وہ؟''

سجاول کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس بات سے بے خبر ہے کہ نور گاؤں میں پڑھاتی ہے۔ شاید وہ اس سے چھپ کر وہاں پہنچی تھی۔ وہ قدرے محتاط ہو گیا اور سنبھل سنبھل کر بولا۔

''وہ بہت اچھی بی بی ہے۔ سب اس کی قدر کرتے ہیں کہ اس نے گاؤں کے سکول کو آباد کیا ہے۔ لیکن۔''

''لیکن کیا؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

''یار ذرا تحمل سے سننا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ گاؤں کے چوہدری اور جاگیرداروں کے وطیرے کیا ہوتے ہیں۔ بس چوہدری اس کے سکول کے چکر لگانے لگا ہے۔ استانی نور کی ملازمہ اس کی طرف سے بہت فکرمند ہے۔ اس نے مجھے تمہارا پتہ دیا تھا کہ میں جا کر تمہیں بتاؤں۔ وہ تمہارے خاندان کی عزت ہے اور شاید تمہاری منگیتر بھی ہے۔ تم اس کو سنبھال لو تو اچھا ہے۔''

''چوہدری کی ایسی کی تیسی۔'' دلشاد نے منہ ہی منہ میں کوئی گالی بکی۔

''یہ بڑھیا پھاپھے کٹنی ہی پہلے اس کو لے کر غائب ہوئی تھی۔ یہ اس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ یہاں سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی اور اب پیغام بھیجتی ہے۔ میں ان دونوں کو سیدھا کر دوں گا۔ شام سے پہلے پہلے اسے یہاں نہ لے کر آ جاؤں تو دلشاد نام نہیں۔''

''یار ذرا صبر سے۔ تحمل سے۔ استانی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تو بڑی شرافت سے رہتی ہے۔ معاملہ چوہدری نے ہی......''

''میں سمجھتا ہوں قصور کس کا ہے؟ نہ وہ گھر سے قدم باہر نکالتی نہ یوں دوسروں کی نظروں میں آتی۔ پر تم فکر نہ کرو میں سب سمجھ لوں گا۔ تمہارے واپس پہنچنے سے پہلے پہلے ہی میں سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک کر لوں گا۔''

۸......۸......۸

وہ گاؤں پہنچا تو رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری تاریخوں کے چاند کی روشنی زرد بہار اور مدھم تھی۔ رات کی سیاہی میں ستارے چھوٹے چھوٹے سنہری دھبوں کی طرح جا بہ جا ٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ قبرستان کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر پاؤں رکھے ہوئے اس کی آنکھوں میں چھیمو کا تر و تازہ چہرہ چمک اٹھا۔ اسے اس ساری تگ و دو میں دو اڑھائی دن لگ گئے تھے۔ چھیمو یقیناً روز اس کا انتظار کرتی ہوگی۔ اس کے لئے کھانا پکا کر رکھتی ہوگی اور رات گئے مایوس ہو کر رو پڑتی ہوگی۔ اور اسے کوستی کوستی نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہوگی۔ اس کے وجود میں ایک نا قابل فہم دکھ سرایت کر گیا۔ وہ آج بھی خالی ہاتھ ہی تھا۔ شہر جا کر بھی وہ اس کے لئے کوئی تحفہ، کوئی سوغات نہیں لا سکا تھا۔ وہ الٹے سیدھے قدم رکھتا قبرستان میں داخل ہوا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت بوڑھے گورکن کو بے آرام کرنا مناسب نہیں ہوگا وہ چپ چاپ جا کر برآمدے میں ایک طرف پڑا رہے گا۔ صبح جب اچانک چھیمو اسے دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔ پھر اس سے روٹھے گی۔ اسے کوسے گی۔ اسے کھری کھری سنائے گی اور پھر آپ ہی آپ من جائے گی اور اس سے پوچھے گی۔ ''چاچا۔ روٹی کھاؤ گے؟''

قبرستان پر ہو کا عالم طاری تھا۔ وہ پچھلی طرف کی ٹوٹی ہوئی دیوار میں سے اندر داخل ہوا۔ صدر دروازے کی طرف سے چکر کاٹ کر آتے ہوئے کسی سے سامنا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ سوکھے پتے اس کے قدموں تلے چرمری آواز دینے لگے تو اس نے اپنی رفتار کو اور دھیما کر دیا۔

رات کی تاریکی میں گھلی ملی زرد چاندنی نے قبرستان کے پرہول منظر میں خوف اور ہیبت کو گوندھ دیا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی قبروں کو دیکھ کر دل میں ہول سے اٹھتے تھے۔ سجاول نے اپنی نگاہوں کو دور تک دیکھنے سے روکا اور اپنے راستے پر نظر کرتا ہوا چلنے لگا۔

اچانک کچھ دور اسے ایک سایہ سا حرکت کرتا نظر آیا۔ پہلے تو اس نے اپنا وہم سمجھتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا لیکن پھر اس کا دھیان اس جانب گیا۔ وہ سایہ اب بھی وہاں موجود تھا۔

سجاول یکدم جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا اور سانس روک کر اس طرف تکنے لگا۔ یہ دیکھ کر وہ لمحے بھر کو کانپ گیا کہ دو سائے سفید کفن میں لپٹے ایک قبر پر جھکے ہوئے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ نہ معلوم یہ کوئی آسیبی منظر تھا یا اس کا حقیقت سے بھی کوئی تعلق تھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ساکت سا کھڑا اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

اچانک ان میں سے ایک کفن پوش قبر کی پائنتی کے اندر اتر کر غائب ہو گیا۔ دوسرا بھی جیسے ہوا میں تیرتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے قبر کے اندر چلا گیا۔ خوف اور دہشت سے سجاول کو ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ وہ اس خوفناک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

وہ دم سادھے وہیں کھڑا رہا۔ ایک کفن پوش قبر کے اندر سے نکلا اور اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر اسے سیٹی کی سی آواز سنائی دی۔ سجاول چونکا۔ اس کا دماغ جسے منظر کی ہولناکی نے ماؤف سا کر دیا تھا یکا یک بیدار ہو گیا۔ خوف اور ہیبت کی کیفیت رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی اور وہ بڑے غور سے اس طرف دیکھنے لگا۔ قبر میں سے ایک سر ابھرا اور آہستہ آہستہ یوں باہر آیا جیسے سیڑھیاں طے کر رہا ہو۔ اس نے ایک بڑا بکس ایک جانب سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے بکس کو دوسری جانب سے پکڑے ہوئے دوسرا شخص بھی باہر نکل آیا۔ ان کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بکس کافی بھاری ہے۔ ان دونوں نے بکس کو ایک جانب رکھا اور پتھر کی سلیں رکھ کر قبر کو بند کر دیا۔ پھر بکس کو اٹھایا اور بے ترتیب قبروں میں سے راستہ بناتے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

سجاول خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کا یہ وہم تو نکل گیا تھا کہ وہ کوئی بدروحیں یا آسیب تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ایک بار قبر کے قریب جا کر دیکھے کہ اس میں کیا ہے۔ لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اگر وہ لوگ کسی کام سے دوبارہ آ گئے تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

اس نے قبرستان کے اس گوشے کو نگاہ میں رکھ لیا اور کچھ نشانیاں بھی ذہن نشین کر لیں اور گورکن کی کٹیا کی طرف چل پڑا۔ وہاں بھی سناٹے کا راج تھا۔ گورکن اندر کمرے میں سو رہا تھا۔ سجاول کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر برآمدے میں ننگے فرش پر لیٹ رہا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ برآمدے میں ننگے فرش پر لیٹے لیٹے اس کے کپڑے مٹی سے بھر گئے تھے۔ کمر اکڑ کر تختہ ہو گئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش دیکھا لیکن دور و نزدیک کوئی نہیں تھا۔ اسے یاد پڑتا تھا کہ ایک دو بار جھمو نے اسے جگانے کو پکارا تھا۔ لیکن اس پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ اٹھ نہیں سکا تھا۔ اب تو جھمو کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

سجاول نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور چھینکے میں سے روٹی نکال کر کھائی جو غالباً جھمو نے اسی کی خاطر پکائی تھی۔ رات کا سارا واقعہ کسی فلم کے مناظر کی طرح ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ اسے قبر اور اس تک جانے والا راستہ بھی یاد تھا۔ اس نے کچھ دیر جھمو اور بابا کا انتظار کیا لیکن جب وہ کہیں نظر نہیں آئے تو وہ اٹھ کر اس جانب چل پڑا جہاں رات اس نے قبر کھلی ہوئی دیکھی تھی۔

رات کی پراسرار تاریکی کی نسبت دن کی روشنی میں سب چیزیں بہت مختلف نظر آرہی تھیں۔ وہ راستہ جو اس کے ذہن میں تھا اس جیسے کتنے ہی راستے جابجا بکھرے پڑے تھے۔ مٹی کی ڈھیریاں سب ایک جیسی تھیں۔ سجاول کچھ چکرا سا گیا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک پکی قبروں کا ایک ایک کر کے جائزہ لینے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس قبر کے پتھروں کو قدرے ڈھالا ڈالا ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان کفن پوشوں نے قبر کو بند کرنے والی سلوں کو یونہی ایک دوسرے پر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک ایک قبر کو چھو کر دیکھنے میں اس قدر مگن ہوا کہ اسے پتہ نہیں چلا کہ قریب ہی ایک آدھ کھدی قبر کی مٹی کے ڈھیر میں سے بوڑھا گورکن ہاتھ میں کدال پکڑے اس کے قریب آن رکا اور کرختگی سے بولا۔

''اوئے جواناں! تو یہاں قبروں کے بیچ کیا کر رہا ہے؟''

''کچھ نہیں بابا!'' سجاول نے عجلت میں جواب دیا۔

''کوٹھڑی میں نہ تو تھا نہ جھمو۔ میرا دل نہیں لگا۔ میں تم دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔''

گورکن نے قدرے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ سورج کی گرم چمکیلی کرنوں سے اس کا پسینے میں بھیگا ہوا سانولا چہرہ عجیب عجیب زاویوں میں ڈھل رہا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''پکی قبریں ساری چوہدریوں کی ہیں۔ کوئی باہر کا بندہ یہاں پھرے تو وہ برا مناتے ہیں۔ اعتراض کرتے ہیں۔ زمین جو ان کی ہے۔ مالک جو ہیں وہ اس قبرستان کے۔''

سجاول ٹھٹکا۔ اس نے بوڑھے کی بات پر غور کیا۔ اسے شک سا ہوا کہ اسے بوڑھے

نے یہاں پھرنے پر کیوں ٹوکا ہے۔ شاید وہ بھی اس بارے میں کچھ جانتا تھا لیکن اتنی آسانی سے وہ اسے یقیناً کچھ نہیں بتائے گا۔ اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ اسے باتوں میں لگانے کو وہ آگے بڑھا اور بوڑھے کے ہاتھ سے کدال لیتے ہوئے بولا۔

''لا بابا۔ باقی کام میں کر دوں۔ تو تھک گیا ہے اب۔''

بوڑھے نے بے نیازی سے سر جھٹکا اور کدال ہاتھ سے نہیں چھوڑی۔ ''نہیں بچہ۔ ابھی میرے ہڈ گوڈوں میں پانی نہیں بھرا۔ میری تو عمر گزری ہے اسی مٹی سے گل بات کرتے، اس مٹی سے کھیلتے۔ اس کے ساتھ رہتے بستے۔''

''چھوڑ نا بابا۔ تو تھوڑی دیر آرام کر لے۔ باقی قبر میں کھود دیتا ہو۔''

''رہنے دے بیٹا۔ اب کام ہی کتنا رہ گیا ہے۔'' وہ بے دلی سے بولا۔

''نہیں بابا۔ لا دے نا یہ کدال۔ میں کھود دیتا ہوں۔'' سجاول نے اصرار کیا۔

''تو نے پہلے کبھی یہ کام کیا ہے؟'' اس نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بابا۔'' سجاول نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پر یہ کون سا مشکل کام ہے۔ زمین ہی تو کھودنی ہے۔''

''زمین ہی تو کھودنی ہے۔'' بابا نے خفگی سے اس کی بات دہرائی۔

''یہ مذاق نہیں ہے۔ سمجھا تو۔ کوئی گڑھا نہیں کھودنا۔ قبر کھودنی ہے جو بندے کو پیار سے سنبھال لے جیسے ماں کی گود سنبھال لیتی ہے۔''

''اچھا۔ اچھا بابا۔ ٹھیک ہے۔ تو ناراض کیوں ہوتا ہے۔ تم بتاتے جانا میں کام کرتا جاؤں گا۔ اچھا ہے یہ ہنر بھی سیکھ لوں۔'' سجاول نے بوڑھے کا موڈ درست کرنے کو جلدی جلدی چند جملے کہے۔

بوڑھا تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ تھوڑی پس و پیش کے بعد رضامند ہو گیا۔ اس نے کدال سجاول کے حوالے کی اور ہانپتا ہوا وہیں مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ سورج کی تپتی شعاعیں انہیں پسینے میں نہلا رہی تھیں۔ سجاول نے آگے بڑھ کر آدھ کھدی قبر میں جھانکا۔ بوڑھے نے خاص گہرائی تک کھدائی کر لی تھی۔ شاید وہ صبح سے ہی اس کام میں لگا ہوا تھا۔ سجاول بوڑھے سے پوچھ کر کہ کھدائی کس طرف سے کی جائے گی قبر کے اندر اتر گیا۔ زمین کی گہرائی میں اسے ایک نامعلوم سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی خوف کی ایک تیز

لہرنے اسے کپکپا دیا۔ اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے ابھرنے لگے۔ قبر کے اندر ہونے کی دہشت نے اسے گلے گلے خوف میں دھنسا دیا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے ذہن میں اس کی ساری بداعمالیاں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوڑ گئیں۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کدال اسے منوں بھاری محسوس ہونے لگی۔

''شاباش جواناں۔'' بوڑھے کی آواز پر وہ چونکا۔ وہ قبر کے منہ پر کھڑا اسے ہدایات دینے لگا کہ اسے کس طرف اور کتنی کھدائی کرنی ہے۔ سجاول سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گیا اور اس نے اپنا دھیان کھدائی کی طرف لگا لیا۔

کام خاصا وقت طلب تھا۔ پھر سجاول کو مشقت کی عادت بھی نہیں رہی تھی۔ جلد ہی اس کا سانس پھول گیا اور وہ تھکاوٹ بھی محسوس کرنے لگا۔ زمین کے اندر ہونے کی وجہ سے اسے کچھ گھٹن سی بھی محسوس ہونے لگی۔ اتنا بھی غنیمت تھا کہ کام کچھ زیادہ نہیں تھا۔ بوڑھا آدھے سے زیادہ کام تو پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔

''چل۔ آ جا باہر کاکا۔ بس ہو گیا کام۔'' اسے بوڑھے کی صدا سنائی دی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ قبر پر ایک الوداعی نگاہ ڈال کر اس نے سوچا کہ انسان کا زندگی سے ناطہ ٹوٹ جائے تو بھی دھرتی سے اس کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ اسے پناہ میں لینے کے لئے دھرتی اپنی آغوش کتنے پیار سے کھول دیتی ہے۔ وہ کدال کو ٹکا کر اس کا سہارا لیتا ہوا اچک کر قبر سے باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ، پیر اور کپڑے سب مٹی مٹی ہو رہے تھے۔

بوڑھے نے جھک کر قبر میں جھانکا اور جیسے اپنے آپ سے بولا۔

''چلو کام ختم۔ بیڑا پار۔ اب قبر جانے اور اس کا مہمان۔ ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔''

''بابا۔ کون مر گیا ہے۔ یہ کس کی قبر بنائی ہے۔'' سجاول نے پوچھا۔

بوڑھے نے ایک آہ سی بھری اور افسردگی سے بولا۔ ''یہاں ایک جھلی تھی نا۔ سارا دن اپنے بچے کی قبر پر روتی رہتی تھی۔ وہ مر گئی ہے۔ بچے کے پیچھے بیچاری پاگل ہو گئی تھی۔''

''کون؟ کون...... وہ لڑکی رانی؟'' سجاول نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں...... وہی رانی۔ کیا اونچی لمبی سوہنی کڑی تھی پر نصیب سوہنے نہیں لائی تھی۔ غموں نے اسے کھا لیا۔''

بوڑھا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا لیکن سجاول کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ایک ایک

لفظ اس پر قیامت بن کر ٹوٹ رہا ہے۔ اس کے قدموں تلے جیسے زمین دھنستی جاتی تھی۔ اس پر جان کنی کا سا عالم طاری تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ رانی کی قبر خود اپنے ہاتھوں سے کھود کر آیا ہے۔ اپنی محبت کا مدفن اس نے آپ تیار کیا ہے۔

اس کے سارے وجود سے جیسے کوئی زندگی کی حرارت، قوت اور سارے ولولے کھینچ کر لے گیا تھا۔ وہ ایک کھوکھلے وجود کے ساتھ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ کس طرح ہوا ہے؟ کس نے کیا ہے؟ کس کے ساتھ ہوا ہے؟

''یار! تو کیوں اتنا بدحواس ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے؟'' بوڑھے نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے چونکایا۔

''کچھ نہیں بابا! کچھ نہیں۔'' اس نے اذیت سے ہونٹ کاٹے اور مرے ہوئے قدموں کے ساتھ گورکن کی کٹیا تک پہنچا۔ اس کے دھوئیں سے سیاہ پڑے ہوئے تنگ سے کمرے میں چٹائی پر ڈھے گیا۔

وہ گورکن کے نیم تاریک کمرے میں یوں پڑا رہا جیسے راکھ کا ڈھیر ہو۔ اس کے اندر نہ کوئی آس تھی نہ تمنا، نہ آرزو۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر شے ختم ہو گئی ہے۔ سارے جذبے مر گئے ہیں۔ زندگی سے سارے رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ انسانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ جنازہ لانے والوں کی آوازیں اسے سنائی دیتی رہیں۔ لوگوں کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی رہیں۔ اس کی کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ اس کے دل و دماغ میں جیسے جھکڑ سے چلنے لگے۔ باہر لوگ رانی کو زمین کی گہرائی میں اتار رہے تھے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر اس کے جنازے کو کندھا ہی دے دے۔ اس کی قبر پر ایک مٹھی مٹی ہی ڈال دے۔ کسی طرح اس کی ایک آخری جھلک ہی دیکھ لے۔ لیکن اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ وہ اسی طرح دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے چور چور سا بیٹھا رہا۔ اور لوگ باہر رانی کو مٹی کے حوالے کرتے رہے۔

''چاچا! چاچا!'' جھیمو دوڑتی ہوئی آئی اور دھپ سے اس کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئی۔

سجاول کو جیسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح غم میں ڈوبا ہوا بیٹھا رہا۔

''چاچا! چاچا!'' اسے متوجہ نہ پا کر جھیمو نے اس کا بازو ہلایا اور اشتیاق سے بولی۔

''چاچا! چاچا! باہر جنازہ آیا ہے۔ بڑے دنوں بعد۔ آج بابا کو پیسے ملیں گے تو وہ شہر جا

کر میرے لئے بہت ساری چیزیں لائے گا۔ چوڑیاں۔ پراندہ۔ لال چنی۔"

سجاول نے سر اٹھا کر افسردگی سے اس کے معصوم چہرے پر چمکتی ہوئی خوشی کو دیکھا اور سوچا کہ وہ ننھی معصوم لڑکی کو کس طرح سمجھائے کہ اس کی زندگی بھر کی متاع لٹ گئی ہے۔ اس کا کچھ بولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ یونہی گم سم بیٹھا رہا۔ اس نے نہ ہوں کی۔ نہ ہاں۔ یونہی بے سمت نہ جانے کہاں دیکھتا رہا۔

اس کی لاتعلقی نے چھیمو کو ناراض کر دیا۔ وہ برا مانتے ہوئے بولی۔

"چاچا! تو تو میری بات ہی نہیں سنتا۔"

"سن رہا ہوں بھئی۔ سن رہا ہوں۔" سجاول نے بے دلی سے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

چھیمو نے اپنا سانولا چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے حیرانی سے تکتی رہی پھر اس نے اپنا ملائم ہاتھ اس کے رخسار سے لگایا۔ کچھ دیکھا اور حیرت سے بولی۔

"ہا...... ہائے چاچا...... تو رو رہا ہے۔"

سجاول چونک گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنی آنکھوں اور رخساروں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کے رخسار گیلے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ چھیمو نے بڑے لگاؤ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور معصومیت سے کہنے لگی۔

"چاچا...... کیا بات ہے؟ بتا نا چاچا! تو کیوں رو رہا ہے۔ تو اتنا بڑا ہو کر روتا ہے۔"

سجاول کو اس کے معصوم انداز میں چھپے ہوئے لگاؤ نے ایک چوٹ سی لگائی۔ اس کا جی چاہا کہ ایک بار پھر رو پڑے۔ پریشانی سے اس نے اپنے بال نوچے اور اپنے برابر کھڑی ہوئی چھیمو کی طرف دیکھا جو فکر مندی سے اپنا معصوم چہرہ اٹھائے اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ محبت سے بولی۔

"بس چاچا! اب نہ رونا۔"

سجاول کو اس کی معصومیت پر پیار سا آ گیا۔ لمحے بھر کو اس کے اندر کی تپش کو قرار سا آ گیا۔ اس نے ملائمت سے اس کے بالوں کو سہلایا۔

"نہیں چھیمو۔ میں رو نہیں رہا۔ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ اسی لئے پانی نکل رہا ہے۔"

"لا چاچا۔ میں دیکھوں۔" چھیمو نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

وہ اس کا دل رکھنے کو اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کی آنکھ کھول کر دیکھی۔ اپنے دوپٹے کو اپنی سانس سے گرم کر کے باری باری اس کی دونوں آنکھوں پر رکھا اور اس سے پوچھنے لگی۔

"کیوں چاچا۔ کچھ آرام آیا؟"

سجاول کے رستے زخموں پر جیسے کسی نے ایک پھاہا سا رکھ دیا۔ اس نے پیار سے اس کے پھولے پھولے گال تھپتھپائے۔

"ہاں چھیمو۔ اب میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔"

"شکر ہے۔" چھیمو نے جلدی سے کہا۔ پھر اسے معاً کچھ یاد آیا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑی بوڑھیوں کی طرح بولی۔

"ہا...... ہائے۔ چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے کہیں جل ہی نہ جائے۔" وہ دوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

سجاول پھر اپنے ساتھ کمرے میں تنہا رہ گیا۔ غموں، پشیمانیوں اور پچھتاؤں میں گھرا ہوا۔ اکیلا۔ سرکنڈوں سے بنی ہوئی چھت جیسے اس کے سر پر آ رہی تھی۔ دھوئیں سے سیاہ پڑی ہوئی دیواریں ہر لمحے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ گہری شام۔ رات کی طرح سیاہ اور افسردہ ہو گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اندھیری قبر میں تنہا ہے۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اسے رانی کا خیال آیا جو بھری جوانی میں دکھ سہہ سہہ کر قبر میں اتر گئی تھی۔ اور وہ زندگی سے کوئی ننھی سی خوشی چھین کر بھی اس کی جھولی میں نہیں ڈال سکا تھا۔ اس نے اپنی سی کوشش کر کے سکھ کے جو دن اس کے آنگن میں اتارنا چاہے تھے۔ وہ تو ابھی انہیں تراش بھی نہیں سکا تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ سوائے اپنے اناڑی ہاتھوں سے اس کی قبر کھودنے کے اس سے کچھ بھی نہیں بن پایا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر اٹھا اور بے ترتیب قدموں کے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ گہری شام رات میں بدل چکی تھی۔ جنازے کے ساتھ آنے والے لوگ تدفین کے بعد واپس جا چکے تھے۔ قبرستان کے سناٹے میں اداسی کے رنگ گھلے ملے تھے۔ خاموشی موت کی طرح پر ہول اور غمگین کر دینے والی تھی۔ وہ قبروں میں سے راستہ بناتا خود میں کھویا اندر ہی اندر آنسو بہاتا اس قبر کی طرف چلا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھودی تھی۔ جو اس کی ناتمام آرزوؤں اور ناکام حسرتوں کا مدفن تھی کہ اسے زوردار ٹھوکر لگی۔ وہ بے خیالی میں سنبھل نہیں سکا۔ ایک قبر کے

تعویز کا سہارا لیکر وہ بمشکل منہ کے بل گرنے سے بچا۔ ٹھوکر سے اس کے انگوٹھے کا ناخن اکھڑ سا گیا۔ درد کی شدید ٹیس نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے پاؤں اٹھا کر اوپر رکھا اور درد کی ٹیس کو کم کرنے کے لئے اسے دبایا۔ اچانک اس کی نظر قبر کے تعویز پر پڑی جو اس کا دھکا لگنے سے ٹیڑھا سا ہو گیا تھا۔ سجاول نے کچھ گھبرا کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو یوں معلوم ہوا جیسے وہ اپنی جگہ سے اکھڑ سا گیا ہے۔ سجاول نے غور سے دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ پتھر کی سلوں کے درمیان بغیر مصالحے کے پھنسا دیا گیا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ معاً اسے کھلی ہوئی قبر اور کفن پوش پراسرار سائے یاد آئے۔ تو رات کا سارا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

اس نے ذرا سا زور لگا کر دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ پکی قبر میں سنگ مرمر کی سلیں ایک دوسرے کے ساتھ یوں ہی اٹکا کر رکھی گئی تھیں۔ وہ ٹھٹک گیا۔ یہ قبر یقیناً وہی تھی جس میں سے ان پراسرار سایوں نے بکس نکالا تھا۔ لمحے بھر کو اسے جھرجھری سی آ گئی لیکن تجسس نے اسے مہمیز دی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک سل کو ہلانے کی کوشش کی۔ اسے کافی زور لگانا پڑا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور ایک سل کو کھسکانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ قبر کے اندر کا خلاء نظر آنے لگا۔ لیکن تاریکی نگاہ کے راستے میں حائل تھی۔ اس نے دوسری سل کو دھکیلنے کے لئے زور لگایا ہی تھا کہ اسے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ خطرے کی بو سونگھ کر یکدم پیچھے پلٹا۔

اسے حیرت ہوئی۔ بوڑھا گورکن اپنی کدال سر سے بلند اٹھائے اس پر وار کرنے ہی والا تھا کہ اس کے اچانک پلٹ جانے سے اس کے ہاتھ اوپر کے اوپر اٹھے رہ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور غصہ تھا۔

''اوئے ظالما......'' وہ دانت پیس کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اس نے یوں غصے سے کدال زمین پر پھینک دی جیسے اپنی ناکامی پر اسے بہت صدمہ ہوا ہو۔ سجاول نے زمین پر پڑی ہوئی کدال کو دیکھا۔ بوڑھے کے تیور دیکھے اور سوچا کہ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر بھی کرتا تو پوری قوت سے اٹھی ہوئی کدال اس کے جسم پر کوئی نہ کوئی زخم چھوڑ چکی ہوتی۔

سجاول نے حیرت سے پھر بوڑھے کے غصے کو دیکھا۔ اسے یقین نہ آیا کہ بوڑھا بھی کسی ایسی ویسی سرگرمی میں ملوث ہو سکتا ہے۔ بوڑھا بھی خشمگیں نظروں سے اس کو گھور رہا تھا۔

''اوئے جواناں۔ کیوں مرے ہوؤں کی مٹی پلید کرتا ہے۔ کچھ خدا کا خوف کر قبروں کی بے حرمتی نہیں کرتے۔ اس پتھر کو اٹھا کر واپس رکھ دے جہاں سے اٹھایا ہے۔''

سجاول نے پھر غور سے بوڑھے کی طرف دیکھا کہ وہ کس انداز میں یہ بات کر رہا ہے۔ کیا وہ اس تمام واقعے سے بے خبر ہے یا اس میں شریک ہے لیکن وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ تب تک بوڑھا پھر اسے ملامت کرنے لگا۔

''او یار!...... تجھے اپنی موت یاد نہیں جو دوسروں کی قبروں کی بے حرمتی کرتا پھرتا ہے۔ مسلمان کی قبر کھولنے کا حکم نہیں۔ اللہ سے ڈر۔ اٹھا...... رکھ اس پتھر کو واپس میرے سامنے۔ جلدی کر جلدی۔''

سجاول بوڑھے کے قریب ہوا اور رازداری سے بولا۔

''بابا میری ایک بات تو سن لے۔ میں تجھے ابھی بتاتا ہوں کہ میں نے یہاں کیا دیکھا ہے۔''

''نہیں نہیں۔ باتوں میں ٹائم ضائع مت کر۔ تو قبر بند کر جلدی۔ بات پھر کر لینا۔''

بوڑھے نے دھائی دی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔

سجاول نے جلدی سے کہا۔ ''بابا میں نے رات دو تین بندوں کو قبر میں اترتے دیکھا ہے۔ انہوں نے یہاں سے کوئی بکس نکالا ہے۔ تجھے کیا پتہ بابا آج کل کیا کچھ نہیں ہوتا۔ تو تو اندر اپنی کوٹھڑی میں ہوتا ہے اور لوگ یہاں نہ جانے کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں۔ میں یہی چاہتا ہوں......''

''بس کر یار! بس کر۔ بڑی ہو گئی۔'' بوڑھے نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹ دی۔

''تجھے میں نے کہا جو ہے کہ قبر بند کر دے۔ تو سنتا کیوں نہیں۔''

سجاول کو اچنبھا ہوا کہ اس کی بات سن کر بوڑھا گورکن بالکل حیران نہیں ہوا بلکہ کچھ اور گھبرا گیا۔ یوں معلوم ہوا تھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو قبر بند کر دی جائے۔ سجاول نے قدرے ہمدردی سے کہا۔

''کیوں بابا! تو کیوں چاہتا ہے کہ میں یہ قبر نہ کھولوں۔ مجھے پتہ تو کرنے دے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے میں اسے اپنی ذمہ داری پر کھولوں گا۔ تیرا نام نہیں آئے گا۔''

''اوہو۔ یار! تو باز کیوں نہیں آتا۔ مجھ غریب پر ترس کھا اوئے جا۔ اپنا راستہ لے۔ چل یہاں سے۔ کیوں اپنی اور ہماری جان کا دشمن ہو رہا ہے۔''

بوڑھے کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ سجاول نے اصرار نہیں کیا اور بغیر کچھ کہے

پتھر کی سل اٹھا کر قبر کو بند کر دیا۔ تعویز کو سیدھا کر کے جمایا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا بوڑھے کے قریب آ کر بولا۔

''بابا مجھے لگتا ہے کہ کوئی بات ہے جو تیرے اندر خوف بن کر بیٹھی ہوئی ہے۔ جو تجھے اندر ہی اندر کھاتی رہتی ہے۔ آخر کیا بات ہے؟ جس نے تجھے اتنا پریشان کر دیا ہے۔ کہیں ان لوگوں نے تجھے کوئی دھمکی تو نہیں دی۔''

''چل اوئے یار! خوانخواہ بات نہ بڑھا۔ تو کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ بس اپنے کام سے کام رکھ تو یہ تیرے حق میں اچھا ہے۔''

اس نے کدال اٹھائی اور چل پڑا۔ سجاول بھی تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے برابر آ گیا اور اس کے ہاتھ سے کدال لیتے ہوئے بولا۔

''بابا! کچھ تو بتا۔ میں بھی تیرے بیٹوں جیسا ہوں۔ تجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھتا ہوں۔ تجھے کیا دکھ ہے۔ کیا پریشانی ہے۔ کچھ بتا تو سہی۔''

بوڑھے نے سر جھٹک کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے جنہیں اس نے ہتھیلی کی پشت سے بار بار صاف کیا لیکن وہ اس کے رخساروں پر بہہ بہہ کر اس کی سفید داڑھی میں جذب ہوتے چلے گئے۔

سجاول کو بوڑھے کی کسمپرسی پر ترس آیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بوڑھے کے اندر پلنے والا دکھ اس کی آنکھوں کے رستے آنسو بن کر بہہ رہا ہے۔ سجاول کا دل احساس ہمدردی اور جذبہ ترحم سے بھر گیا۔ وہ اس کی تسلی کے لئے کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس نے ہولے سے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے کئی بار نرمی اور ملائمت سے تھپتھپایا۔

بوڑھا خاموشی کے ساتھ ڈولتے ہوئے قدموں سے اپنی کٹیا کے قریب پہنچ گیا۔ برآمدے میں بیٹھی ہوئی چھیمو کو دیکھ کر بوڑھے نے جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کر لیں چھیمو لپک کر اٹھی اور بوڑھے کے قریب آ کر چہکی۔

''بابا۔ پیسے مل گئے؟''

اکتائے ہوئے دکھی بوڑھے نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اس کے سر پر ہلکی سی تھپکی لگا کر آگے بڑھ گیا۔ چھیمو نے سجاول کا ہاتھ پکڑ لیا اور منہ بسور کر بولی۔

''چاچا! بابا بولتا کیوں نہیں؟''

سجاول نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''وہ تھکا ہوا ہے نا چھیمو! سارا دن تو محنت کرتا ہے تو بس جلدی سے روٹی پکا دے۔ بابا کو بھوک لگی ہے۔''

''اچھا چاچا! اس نے فرماں برداری سے کہا اور دوڑ کر پھر چولہے کے پاس جا بیٹھی اور اپنے ننھے منے ہاتھوں سے سارے کاج سنوارنے لگی۔

سجاول اندر کمرے میں چلا آیا جہاں بابا چٹائی پر یوں بیٹھا تھا جیسے اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا ہو۔ اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے سر اٹھایا۔

''آ جا پتر۔'' اس نے یوں کہا جیسے اسی کے انتظار میں ہو۔

سجاول اس کے برابر ہی چٹائی پر چپ چاپ بیٹھ گیا اور سعادت مندی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بوڑھے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں کے گوشوں پر آنسو ٹکے ہوئے تھے۔

''پتر تو نے مجھ سے پوچھا تھا نہ کہ چھیمو کی ماں کدھر ہے۔''

سجاول نے پوری طرح سے متوجہ ہو کر ہنکارا بھرا۔

''ہاں بابا۔''

بوڑھے نے تاسف سے سر ہلایا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اس نمانی کو وہ ظالم لے گئے ہیں اپنے ساتھ۔ زور زبردستی سے۔''

''کون؟'' اس نے پوچھا۔

بوڑھے نے اپنے میلے صافے سے اپنی افسردہ آنکھیں پونچھیں۔

''وہی کمینے جنہوں نے قبر میں اڈا بنایا ہوا ہے۔ ان بدمعاشوں نے تو قبروں کو بھی نہیں چھوڑا۔ موت بھول گئی ہے انہیں اپنی۔ قبریں تو ان کے لئے مخول ہو گئی ہیں۔''

''پر وہ چھیمو کی ماں کو کیوں لے گئے؟''

''کیا بتاؤں پتر۔'' اس نے آہ سی بھری۔ ''بس نصیبوں کے چکر ہیں۔ ہم غریبوں کی قسمت میں ٹھوکریں ہی لکھی ہیں۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے قبر کھدائی تھی۔ میں شام تک انتظار کرتا رہا پر وہ جنازہ لے کر نہیں آئے۔ میں نے کہا شاید وہ جنازہ درگاہ شریف لے گئے ہیں۔ صبح جو میں قبروں کو پانی دیتا ٹھیک ٹھاک اس طرف آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کھلی قبر بند ہو گئی ہے۔ اوپر پکا چبوترہ بن گیا ہے۔ تعویز لگا ہوا ہے۔ میری تو زندگی یہاں گزری ہے۔ میں اس کے چپے چپے کو جانتا ہوں۔ ایک پتھر بھی ادھر سے ادھر ہو جائے تو مجھے پتہ چل جاتا ہے۔

میں نے قبر کو دیکھنے کی کوشش کی کہ یہ معاملہ کیا ہے کہ ان کا بندہ پہنچ گیا۔"

وہ یکلخت چپ ہو گیا جیسے گلے میں پھندا سا آ پڑا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک بار پھر ٹپک پڑے۔ سجاول کو اس پر بے حد ترس آیا۔ وہ بوڑھا اور ناتواں شخص حالات کی سختیوں اور زمانے کی ستم رانیوں کے مقابلے میں بہت کمزور تھا۔ سجاول نے اس کی تسلی کیلئے ہمدردی کے کچھ لفظ کہے تو وہ آنسو پونچھنے لگا اور دکھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"خدا انہیں غارت کرے۔ وہ میرا منہ بند رکھنے کو چھیمو کی ماں کو اپنے ساتھ لے گئے زبردستی۔ انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔ نہ اس غریبنی کی فریاد پر کان دھرا۔ میری معصوم دکھی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ تو ابھی چھیمو کے باپ کا غم نہیں بھولی تھی کہ ان ظالموں نے۔"

وہ ایک بار پھر رو پڑا اور ہچکیوں کے درمیان جیسے اپنے آپ سے بولا۔

"پتہ نہیں وہ بچاری کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ کیا بیت رہی ہے اس پر۔"

سجاول تڑپ اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ زخم تنہا اس کے سینے پر ہی نہیں ہر دوسرا شخص ایک ایسا ہی گھاؤ اپنی چھاتی پر لئے بیٹھا ہے۔ بوڑھے کے دکھ کا وار اس کے اپنے وجود پر بھی پوری شدت سے پڑا تھا۔ اس کے سینے کا ناسور بھی رسنے لگا تھا۔ اسے چھیمو کی ماں کے روپ میں بھاگ بھری نظر آنے لگی۔ بوڑھے کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو اسے اپنے باپ کی روتی ہوئی آنکھوں کا منظر دکھانے لگے۔

بوڑھا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ "میں تو مردوں میں مردہ ہو گیا ہوں۔ پتہ نہیں وہ بچاری کس حال میں ہے۔ مجھے چھیمو کی فکر نہ ہوتی تو میں کب کا پولیس میں بیان داخل کرا دیتا۔ میرا کیا ہے۔ مجھے اور جی کر کیا کرنا ہے۔ میرا تو دنیا سے دل ہی بھر گیا ہے۔ پر چھیمو کی ماں بچاری پتہ نہیں کہاں ہے؟"

سجاول نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"بابا تو حوصلہ رکھ۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ تیری ضرور سنے گا۔ تیرے دکھ کے دن ضرور کٹیں گے۔"

بوڑھے نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اللہ ہی اللہ۔ بس اللہ ہی اللہ۔"

O.....O.....O

سجاول کی آنکھ کھلی تو بوڑھے کی کوٹھڑی سیاہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میلی کچیلی

والی لالٹین کبھی کی بجھ چکی تھی۔ تاریکی کی سیاہ دبیز تہہ نے سب کچھ نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ بوڑھا گورکن تھکا ہوا سو رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دیتی تھی۔ سجاول نے اپنی قمیض کا کف ہٹا کر گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی سوئیوں نے بتایا کہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ بوڑھا خوب گہری نیند سو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کچھ بڑبڑانے بھی لگتا تھا۔ سجاول رات کے ابتدائی پہر میں اس لئے بھی سو گیا تھا کہ بوڑھے کو اطمینان ہو جائے کہ وہ بے خبر سو رہا ہے۔

وہ ہاتھ کا تکیہ بنا کر چت لیٹا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ بوڑھے کی پریشانیوں نے اسے اپنے غم بھلا دیئے تھے۔ اس کے سینے پر بھی ویسے ہی زخم تھے جن سے بوڑھے کا سینہ داغ داغ تھا۔ وہ بوڑھے کی پریشانیوں اور غموں کو بہت قریب سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ ہر صورت اس کی مدد کرنا چاہتا تھا اور دل ہی دل میں کتنے ہی منصوبے بناتا اور توڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ جرائم پیشہ لوگ تھے اور انہیں یقیناً چوہدری کی پشت پناہی حاصل تھی ورنہ وہ اتنی دیدہ دلیری سے بوڑھے کی بیٹی کو یرغمال نہ بنا لیتے۔ ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے بڑی احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔

سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف سا ہو گیا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ بالآخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر اپنے جوتے تلاش کئے اور بغیر کوئی آواز پیدا کئے ننگے پاؤں بوڑھے کے برابر سے گزر کر باہر آ گیا۔ جوتے اس نے باہر آ کر پہنے اور قبرستان پر ایک نگاہ ڈالی۔ اسے خیال آیا کہ مٹی کی ان ڈھیریوں تلے کہیں رانی بھی سو رہی ہے۔ اس کے تن میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پھولوں ایسی رانی یوں خاک میں مل جائے گی۔ اس کے اندر ایک جوالا مکھی کروٹیں لینے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اس چوہدری کی گردن دبوچ لے جس نے رانی کو بھری جوانی میں قبر میں اتار دیا تھا۔ جس نے زندگی بھر اسے کانٹوں کی سولی پر چڑھائے رکھا تھا۔

اس نے سر جھٹک کر دل میں کچھ ٹھانا اور ہونٹ چباتا ہوا قبرستان میں گھس گیا۔ وہ تول تول کر قدم رکھتا اس قبر کی طرف بڑھ گیا جو پراسرار سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اسے دور سے ہلکی سی کھسر پھسر اور سلوں کے ٹکرانے اور رگڑ کھانے کی آواز سنائی دی۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ ل ہو کر آہستہ آہستہ بنا آہٹ کے آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ کچھ فاصلہ طے کر کے اس نے گھنی جھاڑیوں میں سے نگاہ کا رستہ تلاش کیا اور قبر کی سمت دیکھا۔

۔تین کفن پوش قبر پر سے سلیں ہٹا رہے تھے۔ وہ دم سادھے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ان میں سے پہلے ایک قبر کے اندر اترا۔ دوسرے دونوں باہر کھڑے رہے۔ پھر اس کا سر قبر میں سے باہر نکلا اس نے غالباً ان دونوں سے کچھ کہا یا کوئی اشارہ کیا اور دوسرا کفن پوش بھی اس کے پیچھے پیچھے قبر میں اتر گیا۔ باہر کھڑا ہوا شخص چاروں طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ اردگرد کوئی خطرہ تو نہیں۔

اچانک ایک خیال سجاول کے دل میں آیا۔ اس نے ایک پل بھی نہیں سوچا اور بجلی کی سی تیزی سے اس پر عمل کر گزرا۔ اس نے چیتے کی سی پھرتی سے لپک کر اس شخص کو عقب سے دبوچ لیا۔ وہ اس اچانک افتاد سے بری طرح گھبرا گیا۔ اس کے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ قبرستان کی فضا کے اثر سے شاید وہ یہ سمجھا تھا کہ وہ کسی آسیب یا بدروح کی گرفت میں آ گیا ہے۔ اس کے حلق سے کچھ عجیب و غریب آوازیں نکلیں اور اس نے خود کو چھڑانے کیلئے مزاحمت کی۔ سجاول اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے ایک زوردار ہاتھ اس کی گدی پر رسید کیا۔ نشانہ صحیح بیٹھا تھا۔ کوئی آواز نکالے بغیر وہ اس کی گرفت میں ڈھیلا پڑ گیا۔ سجاول نے جلدی جلدی اسے ایک وزنی بوری کی طرح پشت پر لادا اور قریب ہی گھنی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ وہاں رک کر اس نے اپنا سانس بحال کیا۔ اسے پشت پر لادا اور جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا بابا کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

اسے اٹھا کر چلنے میں سجاول کو کوئی زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ وہ چھوٹے قد کا ایک منحنی سا انسان تھا اور بے ہوش ہو چکا تھا۔ اچانک ایک قبر کو پھلانگتے ہوئے سجاول کا پاؤں پھسلا۔ لکڑی کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی اور وہ پشت پر لادے ہوئے بوجھ کے ساتھ ٹوٹی ہوئی قبر میں جا پڑا۔ یہ سب کچھ لمحے بھر میں اس طرح ہو گیا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بھربھری مٹی۔ کنکر اور ٹوٹی ہوئی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کچھ دیر اس پر مسلسل گرتے رہے۔

بھربھری مٹی میں گرنے کی وجہ سے اسے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن اس شخص کا بوجھ اسے اٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ مٹی بھربھری ہونے کی وجہ سے مسلسل کھسک رہی تھی۔ وہ کہنی کے سہارے بمشکل اٹھا اور اس نے غور سے اردگرد دیکھا۔ وہ قبر میں خاصی گہرائی تک گرے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کو سجاول کے وجود پر خوف کا لرزا دینے والا سایہ پڑا۔ اپنی قبر کی تاریکی کے خیال نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

اسی وقت اس شخص نے یکدم اچک کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ نہ جانے اسے کس وقت

ہوش آ گیا تھا۔ سجاول بوکھلا کر بدکا اور اس نے ایکبار میں ہی اپنا گلا اس سے چھڑا کر پے در پے کئی گھونسے اندھا دھند جڑ دیئے۔ اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلیں اور اس نے سر جھکا کر سجاول کے سینے پر اتنے زور سے ٹکر ماری کہ وہ چکرا گیا۔ اس شخص نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس سے لپٹ گیا۔ قبر کے گڑھے میں دونوں بری طرح گتھم گتھا ہو گئے۔ خشک بھربھری مٹی ان کے ناک اور منہ میں گھسنے لگی۔

بظاہر وہ معمولی جسامت کا آدمی تھا لیکن خاصا مضبوط تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے وہ جان لڑا دینے پر تل گیا تھا۔ سجاول کو اس پر قابو پانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ کتنی ہی دیر دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی جان توڑ کوشش کرتے رہے لیکن سجاول بالآخر اس کی گردن دبوچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بہتری جدوجہد کی مگر سجاول نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی اس کی مزاحمت میں کمزوری آ گئی تو سجاول نے ایک زوردار گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ اس نے تڑپ کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑا تو لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

سجاول کی سانس بحال ہوئی تو اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ان کی اس کشمکش سے قبر کا گڑھا کافی بڑا اور گہرا ہو گیا تھا۔ بھربھری مٹی اندر ہی اندر دھنستی چلی گئی تھی نہ جانے اس ہاتھا پائی میں کتنا وقت صرف ہو گیا تھا۔ سجاول کو اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھی یقیناً اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر اس نے شانے سے اپنا پٹکا اتارا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں سختی سے باندھ دیئے۔ جیب میں پڑا ہوا رومال اس کا منہ بند کرنے کے کام آیا۔ قبر میں اتنی گنجائش پیدا ہو چکی تھی کہ وہ آرام سے وہاں پڑا رہ سکتا تھا۔

اسے وہیں چھوڑ کر سجاول نے اپنے کپڑے جھاڑے اور بمشکل قبر سے باہر نکلا۔ چاند کی مدھم روشنی میں باہر ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ وہ آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپتا چھپاتا قبر کی طرف بڑھا۔ قبر کھلی ہوئی تھی۔ شاید وہ لوگ ابھی تک اندر ہی تھے۔ سجاول نے احتیاط سے خود کو جھاڑیوں میں چھپا لیا اور قبر کی نگرانی کرنے لگا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان میں سے ایک کا سر باہر آیا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔

”دونے......او دونے۔“

لیکن دونا وہاں ہوتا تو کوئی جواب دیتا۔ سجاول دلچسپی سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھ رہا

تھا۔ دونے کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ اچھل کر باہر نکلا۔ اس نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ آوازیں دیں، جھاڑیوں کو ہلایا جلایا اور پھر واپس قبر میں اتر گیا۔ اس کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔ اب اس کا ساتھی بھی باہر آیا۔ سجاول نے دم سادھ لیا۔ وہ اسے پکارتے جھاڑیوں میں جھانکتے تلاش کرتے اسی طرف آ رہے تھے جہاں سجاول چھپا کھڑا تھا۔ سجاول نے سانس روک لیا اور بڑی احتیاط سے الٹے قدموں نیم دائرے کی شکل میں آہستہ آہستہ اس طرح گھومنے لگا کہ وہ جس طرف بھی آئیں وہ مخالف سمت میں ہو۔ تاریکی نے بھی اس کی مدد کی۔ وہ جھاڑیوں کو دیکھ کر آگے بڑھ گئے لیکن سجاول اتنے سے عرصے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔

اس نے دیکھا کہ وہ گورکن کی کٹیا کی طرف جا رہے تھے۔ سجاول پریشان ہوا۔ وہ یقیناً بوڑھے اور چھیمو کو ہراساں کریں گے۔ وہ جلدی جلدی جھاڑیوں سے نکلا اور ان سے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کرنے لگا۔

وہ کچھ دیر تیز چلتے رہے پھر ایک دم واپس پلٹ آئے۔ سجاول افراتفری میں ایک قبر کے چبوترے کے پیچھے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اس نے کان ان کی آہٹ پر لگا دیئے اور سانس روک لی وہ اس کے برابر والی قبر کے قریب سے گزرے اور پھر قبر کی سمت چلے گئے۔ سجاول کو سلوں کے اٹھانے اور رکھنے کی آواز سنائی دی۔ غالباً وہ جلدی میں قبر بند کرنا بھول گئے تھے۔

سجاول نے جھانک کر دیکھا۔ وہ جلدی جلدی قبر بند کر کے پھر گورکن کی کٹیا کی طرف چل پڑے تھے۔ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر پھر ان کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ سیدھے گورکن کی کٹیا میں گئے۔ اندھیرے میں ان کی ٹارچ کی روشنی یہاں وہاں دائرے بنانے لگی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا جو سجاول کی سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً وہ یہی کہہ رہے تھے کہ بڈھا سو رہا ہے۔ خیریت گزری کہ وہ بوڑھے سے کوئی تعرض کئے بغیر واپس پلٹ آئے۔

کافی دیر وہ اپنے ساتھی کو ادھر ادھر تلاش کرتے رہے۔ کئی بار وہ اس ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس سے بھی گزرے جہاں ان کا ساتھی بندھا پڑا تھا۔ لیکن انہیں کچھ پتہ نہ چلا۔ سجاول فاصلہ رکھ کر ان کا پیچھا کرتا رہا بالآخر وہ ناکام اور پریشان ہو کر واپس چلے گئے۔ ان کی آپس کی باتیں جو کچھ کچھ سجاول کے کان میں بھی پڑتی رہی تھیں ان سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کے اچانک غائب ہو جانے پر خاصے پریشان ہیں۔

وہ چلے گئے تو سجاول نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد کہ کہیں وہ پھر

کسی اور کو لے کر نہ آ جائیں سجاول پھر اپنی کمین گاہ سے نکلا اور اس قبر پر جا پہنچا جہاں اس نے اس آدمی کو باندھ کر رکھا تھا۔ اس نے اوپر کھڑے کھڑے جھک کر قبر میں جھانکا۔ چاند کی مدھم روشنی قبر کی تاریکی کو زائل نہیں کر پائی تھی لیکن غور کرنے پر وہ اس شخص کی سفید کفن نما چادر کو ایک دھبے کی مانند دیکھ سکتا تھا۔ وہ احتیاط سے قبر کے گڑھے میں اترا۔ وہ شخص نیم بے ہوش سا پڑا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے خود کو چھڑانے کی خاصی جدوجہد کی ہے۔ اس کے بندھے ہوئے پاؤں کی کچھ گرہیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کوشش میں شاید وہ تھک گیا تھا یا قبر کی دہشت نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ بے سدھ ہوا پڑا تھا۔

سجاول نے اسے ہوشیار کیا تو وہ ڈر سا گیا۔ تاریکی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سجاول نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے اٹھنے کا اشارہ دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے مٹی کی دیوار سے پشت لگا لی۔ اس نے یوں بار بار سر جھٹکا جیسے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔

سجاول نے اس کے منہ پر بندھا ہوا رومال کھول دیا اور چاقو اس کی کنپٹی پر رکھ کر درشتی سے بولا۔

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کس کے بندے ہو۔ تم نے قبر میں کیا اڈا بنا رکھا ہے۔ سچ بولنا ورنہ اسی قبر کو تیری قبر بنا دوں گا۔“

وہ شخص ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے بڑی بے نیازی سے منہ کھول کر اپنی زبان کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے بولنے سے معذوری ظاہر کر رہا ہو۔

سجاول نے چاقو کی نوک سے اسے کچوکا سا دیا۔

”یہ اداکاری کسی اور کے سامنے کرنا۔ سیدھی طرح بتاؤ تم کس کے بندے ہو۔“

اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس نے اپنا منہ کھول کر کچھ اشارے کئے اور گونگوں کی طرح مبہم آوازیں نکال کر جیسے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

سجاول نے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن نیم تاریکی میں کچھ دیکھنا محال تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ماچس نکالی اس کی تیلی جلائی جس کے ارغوانی شعلے نے اس شخص کے ہراساں چہرے کو تاریکی میں ایک ڈراؤنی تصویر کی طرح نمایاں کر دیا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس نے پھر اپنا منہ کھولا۔

سجاول نے دیکھا کہ اس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔ وہ بے طرح جھنجھلایا۔ رات بھر کی

محنت بیکار گئی تھی۔ وہ شخص اس کے لئے ایک بیکار شے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا کہ یہ چاقو اس کے سینے میں اتار دے لیکن پھر وہ ضبط کر گیا۔ اس معذور شخص کو مار کر اسے کیا حاصل ہو سکتا تھا جو نہ جانے کس کے ہاتھ کا کھلونا تھا۔ اس نے غصے سے اسے دھکا دیا اور خود قبر کے گڑھے سے باہر آ گیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ستاروں کی آنکھیں جھپک رہی تھیں۔ کہیں دور سے تہجد کی اذان بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس وقت کچھ بھی کرنا مناسب نہیں تھا۔ صبح ہونے ہی والی تھی۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا بوڑھے کی کٹیا کی طرف چلا۔

ابھی وہ برآمدے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اس پر ٹارچ کی روشنی پڑی اور اس کے ساتھ ایک سایہ سا اس کی طرف لپکا۔

''سنو دلشاد نے تمہیں بلایا ہے۔''

بخت آور نے آواز کی سمت دیکھا۔ اسے حیرت کے ساتھ مایوسی ہوئی۔ وہ سب جسے باس کہہ رہے تھے ایک بالکل عام سا ڈھیلا ڈھالا انسان تھا جس میں کوئی بات متاثر کرنے والی نہیں تھی۔ وہ ان لڑکوں سے عمر میں کچھ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے معمولی کپڑے پہن رکھے تھے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے انداز میں ایسی بے نیازی تھی جیسے اسے کسی کی پرواہ نہ ہو۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اسے سر سے پاؤں تک گہری نظر سے دیکھا اور یوں سر ہلایا جیسے اسے ناپسند نہیں کیا۔ پھر اپنے قریب ہی قالین پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''آؤ۔ یہاں بیٹھو۔''

بخت آور کے اندر ایک انجانا سا خوف بگولے کی طرح اٹھ رہا تھا۔ ان سب کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔

''چلیں نا۔'' بوبی نے اسے ٹھوکا دیا۔

وہ چونک گئی اور ایک ایک قدم جیسے گن گن کر رکھتی اس کی جانب بڑھی۔

''بیٹھو......!'' بھاری آواز میں تحکم تھا۔

وہ سمٹی سمٹائی سی وہیں بیٹھ گئی۔ یہ سارا ماحول، سب باتیں اسے وحشت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس کے دلکش چہرے کی گلابی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے شانے پر جھکا لیا تھا۔ اس کا واسطہ مردوں سے پڑتا رہا تھا۔ لیکن اس پراسرار ماحول میں اتنے سارے مردوں کے درمیان وہ خود کو بے حد اکیلا اور خوفزدہ محسوس کر رہی تھی۔

باس نے اس کی ٹھوڑی تلے انگلی رکھ کر اس کا جھکا ہوا چہرہ اونچا کیا اور سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

''تم بہت خوبصورت ہو لیکن خود کو اتنا شرمیلا کیوں ظاہر کر رہی ہو جیسے کوئی گھریلو لڑکی

ہو۔"

اس کے دھار دار لفظ، اس کی چبھتی ہوئی نظریں بخت آور کے وجود میں تیروں کی طرح پیوست ہو گئیں۔ اسے اپنا آپ بڑا ہی حقیر محسوس ہوا۔ اس کے ماضی کا تعفن جیسے اس کے وجود میں بس گیا تھا۔ وہ جس طرف بھی جاتی تھی یہ تعفن اس کے ماضی کا گواہ بن کر اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اس نے لرز کر باس کے ہاتھ کو جھٹک دیا اور ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اور جیسے اس کی اسی نظر کا منتظر تھا۔

"دیکھو" اس سے نظر ملتے ہی باس نے بڑے دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ ہمیں یہ شرمانا، لجانا نہیں چاہیے۔"

بخت آور نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہی۔

"سنو" وہ دبنگ لہجے میں بولا۔ "جس جگہ سے تم آئی ہو وہاں تم نے مردوں کے بارے میں بہت کچھ جان لیا ہو گا۔ مردوں کی فطرت، ان کا برتاؤ، ان کی کمزوریاں، ان کی خامیاں سب تمہارے علم میں ہوں گی۔ بس ہمیں یہی کچھ چاہیے کہ تم مردوں کی توجہ حاصل کر کے کسی کمزور لمحے سے فائدہ اٹھا سکو۔"

بخت آور ساکت سی ہو گئی۔ وہ ابھی تک اسی ایک مدار میں ہی گھوم رہی تھی۔ ہر بار وہی مقام اس کے سامنے آ جاتا تھا جس سے بھاگنے کیلئے وہ ہر وقت ہر سمت پناہ کیلئے تکتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے لئے پناہ شاید کہیں نہیں تھی۔

باس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے حکم دے رہا ہو یا فیصلہ سنا رہا ہو۔ اسے کسی کی رائے حاصل کرنے یا رضامندی جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ بخت آور کو پچھتاؤں نے گھیر لیا۔ کاش وہ شہریار کی باتوں میں نہ آئی ہوتی تو یہاں ان سب کے درمیان رسوا نہ ہوتی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی ہمتیں جواب دینے لگیں۔ باس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی عذر ماننے یا کوئی بات سننے کا عادی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے آخری کوشش کرنے کی ٹھان لی۔ اپنی ہمتوں کو مجتمع کرتے ہوئے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اٹکتی ہوئی بولی۔

"مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ میں جلد ہی......"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام نہیں کہ تمہیں یہاں کتنی دیر ٹھہرنا ہے۔" باس نے حقارت سے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم صرف یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔"

بخت آور دھک سے رہ گئی۔ اس نے فق چہرے کے ساتھ شہریار کی طرف دیکھا شاید وہ اس کی کچھ مدد کرے۔ لیکن وہ سر جھکائے بیٹھا قالین پر انگلیوں سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔

بخت آور نے پھر احتجاج کرنا چاہا۔ "لیکن میں ایسا کوئی کام......"

"بحث نہیں۔" باس نے پھر نخوت سے اسے ٹوکا۔ "آج کی اس میٹنگ میں سارے آداب سیکھ لو۔ میں کسی طرح کی کوئی بے قاعدگی برداشت نہیں کیا کرتا۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔ کس وقت کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے اس کے بارے میں تمہیں ہدایات ملتی رہیں گی اور میرا خیال ہے کہ تم اتنی سمجھدار ضرور ہو کہ اپنا برا بھلا سمجھ سکو۔" اس کے لہجے میں اس کے اٹل مکروہ ارادوں کی پھنکاریں تھیں۔

بخت آور سہم کر یوں خاموش ہو گئی جیسے زبان دانتوں تلے کٹ گئی ہو۔ وہ ہراساں سی اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ لیکن وہ دوسروں کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

اس کے بعد اس نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ کچھ ہدایات دیں۔ کچھ ڈانٹا پھٹکارا۔ کچھ حساب کتاب لئے اور جانے کیا کچھ کیا۔ بخت آور کے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ نہ وہ ان کی سرگرمیوں کے بارے میں جانتی تھی نہ اسے ان کے بھیدوں کی کچھ خبر تھی۔ وہ سب کے سب چپ بیٹھے تھے اور یوں توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے جیسے کسی میں کچھ بولنے کی نہ جرأت ہو نہ ہمت۔

باس نے اپنے قریب پڑی ہوئی چھڑی اٹھائی اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سب فوراً ہی اٹھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ بخت آور پر خوف، وحشت، نفرت اور مایوسی کا اس قدر غلبہ تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

باس نے ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھنے لگی۔ باس نے چھڑی سے اس کے شانے کو چھوتے ہوئے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

"بیٹھی رہو۔ بیٹھی رہو۔ آخر تم خاتون ہو اور خواتین کا بہر حال احترام کرنا چاہئے۔ اور ہاں تمہیں جو کچھ کرنا ہے وہ تمہیں بوبی بتا دے گا۔ ریہرسل وغیرہ اچھی طرح کر لینا میں نہ تو کوئی غلطی پسند کرتا ہوں نہ معاف کیا کرتا ہوں۔"

بخت آور نے سہم کر سر جھکایا اور ٹھوڑی اپنے گھٹنے پر رکھ کر مایوسی سے سوچنے لگی کہ تقدیر کی یہ گردش کبھی ختم بھی ہو گی؟

O......O......O

پردے والی سیاہ چمکیلی کار میں بے حد قیمتی ساڑھی اور زیورات پہنے سیاہ چشمہ لگائے بخت آور پچھلی نشست پر یوں بیٹھی تھی جیسے وہ خود نہ ہو اس کی جگہ کوئی اور بیٹھا ہو اس کے دل پر آنسو گر رہے تھے۔ وہ تو سکھ اور آزادی کی تلاش میں نکلی تھی۔ اس نے تو گناہ سے دامن بچا لینا چاہا تھا لیکن وہ گناہ کے زہر آلود کانٹوں میں الجھتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے بہتیرا انکار کیا تھا لیکن بالآخر اسے ہار ماننی ہی پڑی تھی۔

اگلی سیٹ پر بوبی ڈرائیور کی وردی پہنے بیٹھا گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی متحرک چمکیلی آنکھیں سامنے کے چھوٹے آئینے میں اسے بار بار اشتیاق سے تکتی تھیں اور گھنی مونچھوں میں چھپا ہوا اس کا ہونٹ مسکاتا تھا۔

"آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" وہ پرستائش لہجے میں کہہ ہی گیا۔

بخت آور نے ان سنی کر دی اور پردے کی اوٹ سے باہر دوڑتی ہوئی سرمئی سڑک کو دیکھتی رہی۔ اسے بے حد گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ باس کی دی ہوئی ہدایات ایک ایک کر کے سب اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔

"میڈم ہوشیار رہیے گا کوئی غلطی ہو گئی تو یہیں پر دھر لئے جائیں گے۔" بوبی نے پھر اسے مخاطب کیا تو وہ ڈری سی گئی۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے گلے میں پھندا سا پڑا ہوا ہے لیکن جان نہیں نکلتی تھی۔ بوبی شاید اس کی گھبراہٹ کو تاڑ گیا تھا اسی لئے بولا۔

"میڈم آپ بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی ہیں۔ اب اتنی بھی پریشان نہ ہوں۔ فکر نہ کریں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گا۔ آپ ذرا حوصلہ کریں اور تیار ہو جائیں۔"

اس نے گاڑی کی رفتار مدھم کر دی۔ وہ اسی خاص دکان کی تلاش میں تھا جہاں سے اسے زیورات کے چند مخصوص سیٹ کسی طرح ساتھ لانے تھے۔ پھر انہیں نقلی زیورات سے بدل کر واپس کر دینا تھا۔ باس نے یہ منصوبہ بڑی ہوشیاری سے بنا کر انہیں ایک ایک تفصیل سمجھائی تھی لیکن اس وقت بخت آور کے ذہن میں سوائے خوف اور پریشانی کے کچھ بھی نہیں تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک ایک پل جیسے

قیامت بن گیا تھا۔ بوبی نے گاڑی ایک شاندار دکان کے سامنے روک دی تھی۔ بخت آور کی جان پر بن گئی۔ اس کے اعصاب جھنجھنا گئے۔ اسے خود پر قابو نہیں رہا۔ اس نے آگے جھک کر بوبی کا شانہ جھنجھوڑ ڈالا۔

"بوبی۔ بوبی واپس چلو واپس۔ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ مجھے واپس لے چلو۔ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔

بوبی نے گاڑی جلدی سے ایک طرف لے جا کر پارک کی اور اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔"

"میں پاگل ہو گئی ہوں۔ تم واپس چلو۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ میں تمہارا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ تمہارا کچا چٹھا سب کو بتا دوں گی۔ نہیں تو مجھے واپس لے کر چلو۔" اس نے وحشت زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حوصلہ رکھیں میڈم۔ آپ خوامخواہ ہی اتنی گھبرا گئی ہیں میں آپ کو ہوٹل لے کر چلتا ہوں۔ آپ کچھ ٹھنڈا وغیرہ پی کر اپنی طبیعت بحال کریں۔ کچھ دیر آرام کریں میں باس کو فون کر دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ تم باس کو فون نہ کرو۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں خود اس سے بات کر لوں گی۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بیقراری سے بولی۔

"آپ بات کریں گی اور باس سن لے گا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"میڈم! آپ اس کو جانتی نہیں وہ ذرا اور قسم کا بندہ ہے۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ آپ خود کو سنبھالیں۔"

"نہیں نہیں۔ تم واپس چلو۔" بخت آور نے اصرار کیا۔

"میڈم ایک مرتبہ پھر سوچ لیں۔ باس ہمارے انتظار میں ہو گا۔ ہم خالی ہاتھ گئے تو۔" اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

"خالی ہاتھ ہونا اس سے بہتر ہے کہ ہم یہاں پکڑے جائیں۔ مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔"

بوبی نے تیوری چڑھا کر سر جھٹکا اور پلٹ کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔ وہ معمول سے زیادہ تیز گاڑی چلاتا ہوا بہت کم وقت میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اس نے اتر کر پچھلا دروازہ

کھولا اور تلخی سے بولا۔

''چلئے۔ اب باس کے پاس آپ ہی پیشی بھگتیں۔ آپ نے میرا ریکارڈ بھی مفت میں خراب کیا۔''

بخت آور جو ساکت سی بیٹھی تھی چونک کر گاڑی سے باہر آئی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنی ہمتوں کو یکجا کیا اور یہ سوچ لیا کہ وہ باس سے مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

باس نے ایک تنقیدی نگاہ کے ساتھ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور تیوری چڑھا کر بولا۔

''ناکام واپس آئی ہو؟''

بخت آور کا سر غیر ارادی طور پر اثبات میں ہل گیا۔ اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ باس نے شجاع سے کہا۔

''اس کو لے جاؤ اور نگرانی میں رکھو۔ ذرا کھانے پینے میں پرہیز رہے۔ خیال رہے کہ خاتون ہے۔ احترام میں کوئی فرق نہ آئے۔''

''میری بات تو سنیں۔'' بخت آور نے پھر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے توجہ نہیں دی۔

شجاع نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنے ہمراہ لے چلا۔ بخت آور نے بے چارگی سے ایک نگاہ سارے کمرے میں دوڑائی۔ شہریار دیوار کے ساتھ لگا ہوا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ باقی سب بھی خود میں مگن تھے۔ کوئی اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھٹک کر اپنا بازو چھڑا لیا اور تلخی سے بولی۔

''چھوڑ دو مجھے۔ میں خود چل سکتی ہوں۔''

وہ اس کے آگے آگے چل پڑا۔

''آ جایئے...... تشریف لایئے۔''

وہ اپنی ریشمی ساڑھی سنبھالتی ہوئی اس کے پیچھے ہو لی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک کمرے کے باہر رک گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کے لئے کہا۔ بخت آور چپ چاپ اندر چلی گئی۔ اس نے ایک نگاہ چاروں طرف دوڑائی وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں تھوڑا سا فرنیچر اور ایک بیڈ تھا۔ شجاع نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور ایک نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی اور قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''میڈم۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ باس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ اس شخص کے پاس دل قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اسے رحم وغیرہ بھی نہیں آتا۔''

بخت آور نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔ میں خوب جانتی ہوں تم جیسوں کو۔ تم سب ایک سے ہو۔''

وہ دفعتاً قریب آ گیا اور اسے شانوں سے تھام کر بولا۔

''آپ قسم لے لیں ہم ایسے نہیں ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''پیچھے ہٹو۔ دفع ہو جاؤ۔'' بخت آور نے غصے سے اسے پرے دھکیلا۔

وہ ہنس پڑا۔ ''ہم اتنے برے بھی نہیں ہیں۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔''

بخت آور نے منہ پھیر لیا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ٹھیک ہے میڈم! آپ کی قسمت۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

''بائے بائے میڈم۔''

''بائے بائے میڈم۔'' یہ آخری آواز تھی جو اس نے سنی۔ اس کے بعد اسے کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ تنہا بیٹھی اپنے ساتھ ہی باتیں کرتی رہی۔ اپنے آپ میں ہی الجھی رہی۔ گرد آلود حالات کی گرد کو اپنے سارے وجود پر جمتے ہوئے دیکھتی رہی۔

دن سے شام ہوئی اور شام کو رات نے آن پکڑا۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور ذہنی الجھن نے اسے چور چور کر دیا تھا۔ اس کا ذہن اور جسم دونوں ہی نڈھال ہو چکے تھے۔ یہاں کے ماحول اور مطالبات نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اسے اپنا آپ بڑا غیر محفوظ سا معلوم ہو رہا تھا۔ اونچی چھت، سنگین دیواروں اور بند دروازے میں بھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کھلے آسمان تلے بے سائبان کھڑی ہے۔ سارے موسموں کے دکھ سہنے، ساری رتوں کے عذاب جھیلنے کیلئے۔

رات سنسان ہو گئی، گہری اور تاریک ہوئی۔ بنا آہٹ کے گزرتی گئی۔ بخت آور نہ جانے کیا سوچتی رہی اور کرسی پر بیٹھ بیٹھے سو گئی۔ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو صبح اس نے پہنی تھی۔ اس نے اٹھ کر الماری کھولی۔ وہ خالی تھی۔ اس نے غسلخانے کا دروازہ کھول کر دیکھا وہاں ایک

مردانہ سلیپنگ سوٹ لٹکا ہوا تھا۔ بخت آور نے دروازہ دھکیلا۔ وہ لاک تھا۔ کھڑکی کھولی اس میں لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔ سارے راستے بند تھے۔ کوئی در کھلا نہیں تھا۔

اسے دیوار میں زندہ چنے جانے کا احساس ہوا۔ گھٹن نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی واپس کمرے میں آئی اور پلنگ پر ڈھے کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ تنہائی تھی اور وہ۔ نہ کوئی مہربان گود تھی۔ نہ کوئی محبت بھرا سینہ۔ نہ کوئی آنسو پونچھنے والا تھا نہ تسلی دینے والا۔

وہ نہ جانے کب تک پچھلی رات کے سیاہ آنچل میں بھیگے ستارے تانکتی رہی اور تھک کر نا معلوم کب سوئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو سورج دیوتا اجلے دن کی سوغات چاروں طرف بانٹ چکا تھا۔ بخت آور نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ کمرے میں دن کا اجالا برس رہا تھا۔ بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ دن کی روشنی کو دیکھ کر اس کی قدرے ڈھارس بندھی۔

اس نے اٹھ کر روشنیاں گل کیں اور غسلخانے میں چلی آئی۔ اس نے پانی کا نل کھولا لیکن پانی نہیں آ رہا تھا۔ ٹب میں تھوڑا پانی موجود تھا۔ اس نے اسی سے منہ ہاتھ دھویا اور کمرے میں چلی آئی۔

اس نے سارے کمرے کا جائزہ لیا یہ کمرا دوسرے کمروں کی نسبتاً چھوٹا تھا۔ روشندان بہت اونچا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کمرے کو رہنے کے لئے کم استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ یہ مناسب طور پر آراستہ نہیں تھا۔ بدرنگ قالین، پرانی کرسیاں اور ایک بیڈ۔ یہی اس کی کل کائنات تھی۔

بخت آور صوفے پر بیٹھ کر حالات کو نئے انداز سے دیکھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی ایک ضرور آئے گا اور اس سے معاملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اسی انتظار میں رہی اور فارغ بیٹھے بیٹھے تھک گئی لیکن کسی نے خبر نہیں لی۔ اسے بھوک بھی محسوس ہونے لگی۔ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آج بھی دن رات سے ملن کیلئے تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بھوک کا احساس بھی بڑھ رہا تھا۔ بخت آور نے اپنی بھوک کو پانی سے تسکین دینی چاہی اور اٹھ کر غسلخانے کا نل ایک مرتبہ پھر کھول کر دیکھا شاید پانی آ گیا ہو لیکن پانی بند تھا۔

بھوک کے ساتھ پیاس کی شدت بھی بڑھنے لگی لیکن ٹب میں تھوڑے سے پانی کے علاوہ پانی کہیں نہیں تھا۔ ٹب کی تہہ میں بیٹھا ہوا پانی پینے کو اس کا دل نہیں مانا۔ معاً اس کے

ذہن میں باس کی بات گونج اٹھی۔

"ذرا کھانے پینے سے پرہیز کرانا۔"

وہ کانپ گئی۔ اس کے اندر یہ اندیشہ بار بار ناگ کی طرح پھن پھیلانے لگا کہ اسے بھوکا پیاسا رکھا جانے والا تھا۔

بخت آور نے اس کٹھن راستے میں بہت کچھ جھیلا تھا۔ اس کی روح تو ہمیشہ سینہ سپر رہی تھی لیکن جسم بالآخر ہار گیا تھا۔ جسم کی ضرورتوں نے اسے مات دے دی تھی۔ شاید ایک بار پھر آزمائش کا دور شروع ہونے والا تھا۔ ایک بار پھر اسے جسم اور روح کو ہم آہنگ کرنے کے لئے پل صراط سے گزرنا تھا۔ وہ بہت دیر تک خاموش اور ہراساں سی بیٹھی رہی۔

وقت تھا کہ کٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ کبھی پلنگ پر لیٹ جاتی۔ کبھی چھت کو گھورنے لگتی۔ کبھی در و دیوار پر نظر کرتی لیکن کوئی نہیں آیا۔ نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ کسی کے قدموں کی چاپ ہی کمرے کے باہر سے گزری۔ نہ کوئی آواز سنائی دی۔ یہ موہوم امید ہولے ہولے معدوم ہونے لگی کہ شاید کوئی آ جائے۔

خاموشی ہی خاموشی، تنہائی ہی تنہائی اس کے چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ بخت آور کا دل گھبرانے لگا تھا۔ بھوک اس کے پیٹ میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑنے لگی تھی۔ پانی پینے کی شدید طلب اس کے حلق میں کانٹے اگانے لگی تھی۔ اس پر پژمردگی اور نقاہت چھانے لگی تھی۔ وہ خود بے طرح پریشان ہوئی۔ جسم کے مطالبے روح کو کمزور کرنے لگے۔ وہ کروٹیں بدل بدل کر ہار گئی لیکن اس کی جلتی ہوئی آنکھوں کو نیند کی ٹھنڈک نے چھوا تک نہیں۔

اس نے کمرے میں ٹہلتے۔ بستر پر کروٹیں بدلتے، غسلخانے کی کھڑکی کی لوہے کی جالیوں میں سے اندھیرے کو تکتے دوسری رات بتا دی۔ بھاری اور تنہا رات صدیوں کی طرح گھسٹ گھسٹ کر گزرتی رہی۔ بھوک کا احساس جو پہلے کسی عفریت کی طرح اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا اب نقاہت اور کمزوری میں بدل گیا۔ اس سے اٹھنا محال ہو گیا لیکن کسی نے اس طرف جھانک کر بھی نہیں دیکھا اور دن اس پر قیامت ڈھاتا ہوا گزر گیا۔

پیاس نے اس کی زبان کو لکڑی کا ٹکڑا بنا دیا۔ وہ اٹھی۔ آہستگی سے قدم دھرتی غسلخانے میں پہنچی۔ ٹب کی تہہ میں بیٹھے ہوئے تھوڑے سے پانی کو چلوؤں سے پیتے ہوئے اسے کراہت نہیں آئی۔ اس کے اندر مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا تھا اس کے اعصاب، اس کی سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی قوتیں تھکتی جاتی تھیں۔

بھوک اس کے سارے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ وہ کسی تباہ حال مسافر کی طرح بار بار کسی جانب سے مدد آنے کی آس میں دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔

اس کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے لیکن کوئی آہٹ نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ ہی اس کی قبر بن جائے گا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ اسے یہاں بند کر کے بھول گئے ہیں یا یہ جگہ چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس نے کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا، آوازیں دیں۔ دیوانوں کی طرح باہر نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرتی رہی لیکن لاحاصل۔ اسے نہ دنوں کی گنتی یاد رہی نہ رات دن میں تمیز رہی۔ اس کے لئے اجلے اور تاریک لمحوں میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ ہر گزرنے والا لمحہ بھوک میں اضافہ کرتا تھا۔ روٹی کی طلب بڑھاتا تھا۔

نہ جانے کتنے روز بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی لیکن بخت آور کو یہی محسوس ہوا جیسے یہ بھی کوئی دھوکہ یا اس کی ساعت کا فریب ہے۔ اس میں ہلنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بستر پر پڑی رہی اور بجھی بجھی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

دروازے میں بوبی اور شجاع کے چہرے نمودار ہوئے۔ وہ بنا پلک جھپکے ایک ہی سمت دیکھتی رہی۔ وہ دونوں قریب آ گئے۔ بوبی کے ہاتھ میں کسی مشروب کا گلاس تھا۔

''اٹھیے میڈم۔'' وہ بولا۔

بخت آور نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی لفظ بولنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ شجاع نے جھک کر اسے اٹھایا اور سہارے سے پلنگ پر بٹھا دیا۔ بوبی نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کے خشک ہونٹوں نے نمی کو چھوا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس ایک گلاس میں اس کی زندگی سیال بن کر تیر رہی ہے۔ اس نے بے تابی سے دو تین گھونٹ اس طرح لئے جیسے کوئی بچہ گلاس سے پانی پینا سیکھتا ہے۔ کچھ اس نے پیا کچھ اس کے ہونٹوں سے بہہ کر اس کی گردن تر کر گیا۔

یہ چند گھونٹ اس کی تسکین کے لئے ناکافی تھے۔ وہ نقاہت سے جھولتی ہوئی اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ابھر آئے تھے۔ اس کے دلربا چہرے کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔

بوبی نے انگلی سے اس کا رخسار چھوا۔

''میڈم! آپ کی ضد نے آپ کا کیا حال بنا دیا ہے۔ مجھے افسوس ہے لیکن میں آپ کو اور جوس پیش نہیں کر سکتا۔ باس کا یہی حکم ہے کہ آپ کو صرف ایک ہی گلاس دیا جائے جس سے آپ بات کرنے کے قابل ہو سکیں۔''

بخت آور کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ شجاع نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

''چلئے میڈم! ذرا باس کے درشن کر آئیں اور اسے بھی اپنے درشن کرا دیں۔ کیا پتہ وہ آپ کے راشن میں اضافہ کر دے۔''

وہ ہنسا اور اس کی تمسخر آمیز ہنسی میں بوبی بھی شامل ہو گیا۔ اس نے دوسری طرف سے آ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور دونوں نے اسے اٹھا کر اس کے قدموں پر کھڑا کر دیا۔

سجاول کو رانی کی موت نے بالکل ہی تنہا کر دیا تھا۔ اسے چوہدری اور استانی نور کے قصے سے دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن دلشاد کا پیغام ملنے پر ایک بار پھر رانی کے دکھوں کی ٹیس اس کے اپنے سینے میں اٹھنے لگی تھی جسے چوہدری کی بے وفائیوں نے بھری جوانی میں مٹی کا رزق بنا دیا تھا اور اب وہ استانی نور کی زندگی سے کھیلنے پر آمادہ تھا۔

اسے رانی کے دکھوں اور محرومیوں کا حساب دینا ہی چاہئے تھا۔ وہ اس قابل تھا کہ اس سے رانی کی زندگی میں گھل جانے والی تلخیوں کا حساب گن گن کر لیا جاتا مگر سجاول تنہا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دلشاد اس کی ٹکر کا آدمی تھا وہ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ نہ جانے اس نے اسے کیوں بلایا تھا اور اس نے اس کے ٹھکانے کا پتہ کیونکر چلا لیا تھا حالانکہ سجاول نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاصا بااثر آدمی تھا۔ اس سے ملنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ اس کے ذریعے چوہدری سے رانی کی محرومیوں کا بدلہ لے سکتا تھا۔

یہی سوچ کر وہ اس کے ڈیرے چلا آیا تھا۔ اس کے ملازم اس کے ساتھ عزت سے پیش آئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں اس کے بارے میں علم ہے۔ انہوں نے دلشاد کے بارے میں بتایا کہ وہ رات سے باہر گیا ہوا ہے جلد واپس آ جائے گا۔

سجاول کو نیلم کا خیال آیا یقیناً وہ اسی کے یہاں ہو گا۔ یہ سوچ کر نہ جانے کیوں وہ افسردہ سا ہو گیا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر خود کو ملامت کی۔ بھلا اسے نیلم سے کیا لینا دینا۔ ایک

دلشاد کیا نہ جانے اور کتنے اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔

وہ دیر تک دلشاد کے انتظار میں اس کی بیٹھک میں بیٹھا رہا۔ پھر بیکار بیٹھے بیٹھے اسے بوریت ہونے لگی تو وہ ذرا گھومنے پھرنے کے ارادے سے باہر نکلا۔ اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کو نیلم کا رنگین سراپا لہرا گیا۔ وہ اس کے شہر میں آیا تھا تو بلاسبب ہی اس کی منتظر آنکھیں یاد آ گئی تھیں جو ہمیشہ راہ تکنے کا وعدہ کرتی تھیں۔

وہ دلشاد کے ملازم کو تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر اس کی بیٹھک سے نکلا اور مرکزی دروازے تک جانے والی گلی نما روش طے کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ شوخ ریشمی کپڑوں میں ملبوس کوئی عورت بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہوئی تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دیوار کے ساتھ بنے ہوئے ایک محراب کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

وہ گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ ظاہری شباہت سے وہ کسی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس کی موجودگی سے بے خبر بالکل دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

تب تک سجاول اس کے برابر پہنچ چکا تھا۔ وہ اس کی آہٹ سن کر بے طرح پریشان ہوئی اور اس نے ہراساں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کو اس کے ہونٹ لرزے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ سجاول کو وہ کوئی مصیبت زدہ معلوم ہوئی۔ نہ جانے وہ کون تھی اور کس کے خوف سے یہاں چھپی ہوئی تھی۔ شاید اسے مدد کی ضرورت تھی یہی سوچ کر سجاول نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

"بی بی تو کون ہے؟"

اس کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ اٹکتی ہوئی بولی۔

"بھائی مجھے تھوڑی دیر کیلئے یہاں پناہ دے دو۔ کچھ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔"

اس کے انداز میں منت اور بے چارگی تھی۔

سجاول کو اس پر ترس آیا۔ نہ جانے وہ کس مصیبت میں گرفتار تھی جو ایک غیر گھر میں ایک انجانے شخص سے پناہ مانگ رہی تھی۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور میک اپ سے سنورے ہوئے چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ وہ کوئی جرائم پیشہ عورت تھی یا حقیقتاً کوئی مصیبت زدہ تھی۔ اس کے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

سجاول نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازے میں سے باہر جھانک کر دیکھا کہ اس کا تعاقب کرنے والوں میں سے اگر کوئی نظر آ جائے تو وہ اندازہ لگا سکے کہ وہ کس قسم کی عورت ہے۔ اسے کچھ دور پولیس کا ایک موٹر سائیکل کھڑا ہوا نظر آیا۔ کچھ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔ سجاول فوراً ہی دروازے سے باہر آ گیا۔ تب تک وہ لوگ قریب پہنچ چکے تھے۔

"چوہدری صاحب! یہاں کوئی عورت تو نہیں آئی؟" ایک نے پوچھا۔

"نہیں یار۔ میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ ابھی اندر سے آ رہا ہوں" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"کمال ہے۔ پھر گئی کہاں۔ وہ اسی گلی میں گھسی تھی۔" اس شخص نے تعجب سے کہا۔

"معاملہ کیا ہے بھائی صاحب؟" سجاول نے پوچھا۔

"وہ عورت اور اس کا ساتھی زیورات کے دو چار سیٹ دھوکے سے لے کر نکلے ہیں۔ مالک کو پتہ چل گیا۔ اس نے شور مچایا لیکن تب تک وہ کار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ یہ پولیس والا بھی ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے کار کو چھوڑ دیا اور خود گلیوں میں کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کدھر گئے ہیں۔"

"یہیں کہیں ہوں گے۔ جا کہاں سکتے ہیں۔" سجاول نے یونہی کہہ دیا۔

"اچھا۔ ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں۔" وہ آگے بڑھ گئے۔

سجاول کچھ دیر وہیں کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کافی دور نکل گئے تو وہ اندر آیا۔ وہ عورت ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس نے ہونٹوں سے کچھ نہیں کہا بس التجا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا کرب اور مظلومیت تھی کہ سجاول پس و پیش میں پڑ گیا کہ اس کے بارے میں جو کچھ ابھی وہ لوگ کہہ رہے تھے وہ سچ ہے یا کوئی فریب۔ اس کا چہرہ کسی شاطر یا جرائم پیشہ عورت کا نہیں تھا۔ وہ پریشان، خوفزدہ اور ستائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سجاول نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ "باہر لوگ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم کہاں سے واردات کر کے بھاگی ہو؟ تمہارا ساتھی کدھر ہے؟"

وہ پوری جان سے لرز گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ پھر اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلایا اور اس کی بڑی بڑی دلکش آنکھوں کے پیالے چھلک گئے۔ اس کے ہونٹ کانپے مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

سجاول کو اس پر رحم آنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اس نے اس خیال سے کہ کوئی اسے یہاں دیکھ نہ لے اس سے ملائمت کے ساتھ مخاطب ہوا۔ ”باہر لوگ تمہیں تلاش کر رہے ہیں تم تھوڑی دیر اندر آ کر بیٹھ جاؤ۔ وہ لوگ چلے جائیں گے تو پھر تم بھی نکل جانا۔“

اس نے ایک متذبذب سی نگاہ اس پر ڈالی اور جھجکتی ہوئی بولی۔ ”نہیں بھائی میں یہیں پر ٹھیک ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں چلی جاؤں گی۔“

”کہاں جاؤں گی تم۔ کہاں ٹھکانہ ہے تم لوگوں کا۔ یہاں کھڑی رہیں تو کوئی آتا جاتا تمہیں دیکھ لے گا۔ میں کہتا ہوں اندر چل کر بیٹھو۔“

اس نے کچھ سوچا پھر اس کے ساتھ چل پڑی۔ سجاول اسے دلشاد کی بیٹھک میں لے آیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے ایک نشست کی جانب اشارہ کیا۔ وہ کمٹی سمٹائی وہیں بیٹھ رہی۔ سجاول نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”آخر یہ قصہ کیا ہے؟ تم جرائم پیشہ لگتی تو نہیں ہو تو پھر......“ اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور دکھی سے لہجے میں بولی۔

”بھائی تم صحیح سمجھے ہو۔ میں جرائم پیشہ نہیں ہوں۔ میں تو بے آسرا اور بے سہارا ہوں۔ ان برے لوگوں کے درمیان پھنس گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟“ اس کا لہجہ رندھ گیا اور وہ خاموش ہو کر جیسے آنسو ضبط کرنے لگی۔

اس کی آنکھوں کا دکھ جیسے سجاول کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس کے اداس چہرے میں اسے بھاگ بھری کا بھولا بسرا چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ بھی کسی سجاول کی بھاگ بھری ایسی بہن تھی جو دنیا کے ٹیڑھے میڑھے راستوں میں بھٹک کر رہ گئی تھی۔ اسے بھاگ بھری کے خدوخال صحیح طرح سے یاد نہیں رہے تھے لیکن اس کی روتی ہوئی سیاہ آنکھیں جو اسے ہر دم اپنی جانب تکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اس عورت کی آنسو بھری آنکھوں جیسی ہی تھیں۔ سجاول کو اس کا دکھ جانا پہچانا سا معلوم ہوا۔ اس نے ہمدردی اور خلوص سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

”بی بی تو میرے لئے بہنوں جیسی ہے۔ تو......“

دروازہ کھلا اور دلشاد کا ملازم اندر آیا۔ اس عورت کو کمرے میں دیکھ کر وہ لمحے بھر کو ٹھٹھک

گیا۔ پھر اس نے مسکرا کر آنکھ دبائی اور محظوظ ہو کر ستائشی انداز میں بھنوئیں اچکائیں۔ سجاول سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کیا کہے کہ وہ ذومعنی انداز میں کھنکارا اور ایک معنی خیز اشارہ کر کے کمرے سے یوں باہر نکل گیا جیسے اسے رازداری کا یقین دلا رہا ہو۔

سجاول کچھ خجل سا ہو گیا۔ وہ عورت بھی بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ پھر کچھ رک رک کر بولی۔

”آپ......آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے میں کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔“

”لیکن وہ لوگ جو تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں ان کا کیا کرو گی؟“ سجاول نے سوال کیا۔

وہ دوپٹے کے آنچل کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔ کچھ دیر خاموش متذبذب سی رہی پھر محتاط سے لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ میری تھوڑی سی مدد کر دیں۔ مجھے کہیں کوئی کام دلا دیں تو میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی۔“

سجاول نے سر ہلایا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس وقت تمہیں کہاں پناہ دلوائی جائے کہ تم ان لوگوں کی نگاہ سے بچ سکو۔ ورنہ اگر تم باہر نکلیں تو کسی نہ کسی کے ہاتھ آ جاؤ گی۔“

وہ امید بھری نگاہوں سے اس کی جانب تکنے لگی اور سجاول عجیب آزمائش میں پڑ گیا۔ وہ تو خود بے آسرا‘ بے ٹھکانہ‘ کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا پھرتا تھا۔ وہ اس عوت کو دنیا کی دستبرد سے کیوں کر بچائے گا۔ وہ اسے یہاں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ دلشاد کوئی زیادہ اچھے کردار کا انسان نہیں تھا۔ اس کے گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں آ جاتا تو اس واقعے کو نہ جانے کس رنگ میں دیکھتا۔ معاً اسے گل کا خیال آیا لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے اس امکان کو نظر انداز کر دیا کہ اس عورت کے پیچھے نہ جانے کون لوگ پڑے ہوئے تھے۔ وہ کن جرائم پیشہ لوگوں کی آلہ کار تھی۔ گل کے پاس اسے لے جانا خود گل کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔

وہ اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لینا چاہتا تھا تاکہ دلشاد کی نگاہ اس پر نہ پڑے لیکن کوئی ایسا محفوظ ٹھکانہ نہیں تھا جہاں وہ اسے پہنچا سکتا بالآخر اس کے ذہن میں گورکن کی کٹیا ہی آئی۔ اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم جس قسم کی زندگی کی عادی ہو تمہیں وہ سب کچھ تو نہیں مل سکے گا۔ ہاں اگر تم

واقعی ان لوگوں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں ایک ایسی جگہ پہنچا سکتا ہوں جہاں تم محفوظ رہو گی۔"

اس کا اداس اور پژمردہ چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن ہونٹوں سے کچھ نہیں کہہ سکی۔

سجاول نے اپنے کندھے پر سے چادر اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔

"لو اسے اچھی طرح سے لپیٹ لو اور اٹھو...... چلو۔"

"کہاں؟" اس نے چادر اوڑھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھ پر اعتبار کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس عورت کو قبرستان لے جا کر بوڑھے گورکن کے لئے کوئی مصیبت تو نہیں کھڑی کر دے گا۔ وہ لمحے بھر کو رک گیا اور کڑے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"سچ سچ بتانا تم نے کوئی جرم تو نہیں کیا یا کسی کے ساتھ جرم میں شریک تو نہیں؟"

اس نے یوں شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات سے اسے بہت صدمہ پہنچا ہو۔ پھر افسردگی سے بولی۔

"بھائی۔ تمہیں میرے کہے پر یقین نہیں تو میں کیا کہوں۔ اگر کہتے ہو تو قسم کھا لیتی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی اور ایک آنسو اس کے رخسار پر پھسل گیا۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو دل پر جا کر اثر کرتی تھی۔ سجاول کو جیسے آپ سے آپ یقین آ گیا۔ اس نے سر ہلایا اور اسے اپنے ہمراہ چلنے کیلئے کہا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی ڈر ڈر کر پاؤں رکھتی اس کے ساتھ چل پڑی۔

دلشاد کی حویلی سے نکل کر وہ کچھ دیر پیدل چلے۔ اس نے چادر خوب اچھی طرح سے لپیٹ رکھی تھی جس میں اس کا آدھا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ اس سے یہ اندیشہ ذرا کم ہو گیا تھا کہ وہ پہچان لی جائے گی۔ جلد ہی انہیں تانگہ مل گیا۔ سجاول نے اسے بسوں کے اڈے پر چلنے کیلئے کہا۔

کوچوان نے گھوڑے کو چابک لگایا اور منہ سے گھوڑے کو چلانے کی آوازیں نکالیں۔

گھوڑے نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑ لی۔ وہ سمٹی ہوئی سی خود کو چادر میں لپیٹے بیٹھی تھی۔ سجاول اس کے برابر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے بارے میں گورکن سے کیا کہے گا کہ اچانک اس نے ہولے سے اس کا بازو یوں دبایا جیسے متوجہ کرنا چاہتی ہو۔ سجاول نے چونک کر اس کی

طرف دیکھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"وہ لوگ پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ لوگ پیچھا کر رہے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

سجاول نے پریشان ہو کر ساری سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ کوئی ایسے مشکوک لوگ نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس عورت کے لہجے سے لگتا تھا جیسے اس نے کسی کو پہچان لیا ہے۔

سجاول نے دبی زبان سے کہا۔

"شور نہ مچانا۔ خاموشی سے بیٹھو۔ آرام سے بتاؤ کہ کون پیچھا کر رہا ہے۔"

"کالی کار۔ کالی کار میں۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

سجاول نے پھر سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ تانگے سے کچھ فاصلے پر ایک سیاہ کار دھیمی رفتار سے یوں چلی آ رہی تھی جیسے تانگے کی رفتار کا ساتھ دے رہی ہو۔ بل کھائی ہوئی مونچھوں والا ایک نوجوان سٹیئرنگ پر تھا جس کا اوپر کا ہونٹ اس کی گھنی مونچھوں میں چھپ گیا تھا۔ اس کے ساتھ کی نشست پر اس کی عمر کا ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کی چھوٹی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ پچھلی نشست پر بھی کچھ لوگ تھے مگر وہ صاف طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

"خاموشی سے بیٹھی رہو۔ شور نہ مچانا۔ حوصلہ رکھو۔" سجاول نے دبی زبان میں کہا اور کار کی طرف دیکھا۔

وہ لوگ مناسب فاصلہ رکھے ہوئے تھے۔ سجاول پوری طرح سے ہوشیار ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس وقت وہ سٹیشن یا بسوں کے اڈے پر نہیں جا سکتے تھے۔ وہ لوگ تعاقب میں تھے اور آسانی سے ان کا سراغ لگا سکتے تھے۔ وہ گاڑی میں تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی ہو سکتے تھے۔ کچھ سوچ کر سجاول نے تانگے والوں کو ایک دوسرے راستے کی طرف چلنے کو کہا۔ تانگے والے نے مڑ کر معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور گھوڑے کو ایک دوسری سڑک کی جانب موڑ دیا۔ سیاہ کار اب بھی ان کے تعاقب میں تھی۔

یہ سڑک نسبتاً تنگ تھی۔ اس لئے اس راستے پر ٹریفک کا رش بھی بڑھا ہوا لگتا تھا۔ فٹ پاتھ پر خوانچہ فروشوں کے تجاوزات نے بھیڑ اور تنگی کا احساس سوا کر دیا تھا۔ سجاول اسی لئے رش والے علاقے میں نکل آیا تھا کہ وہ لوگ فوراً ہی انہیں روکنے یا حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ وہ بے حد چوکنا تھا۔ اور بڑے غیر محسوس انداز میں اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے

دل ہی دل میں یہ منصوبہ بنا لیا تھا کہ وہ تانگے کو کسی مناسب جگہ روک کر شہر کی تنگ اور بھول بھلیوں ایسی گلیوں میں انہیں بھٹکانے کی کوشش کرے گا۔

”باؤ جی۔ جانا کس طرف ہے؟“ تانگے والے نے پوچھا۔

اس عورت نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ سجاول بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سمت کا تعین اب تک نہیں کیا تھا۔ وہ شہر سے پوری طرح واقف بھی نہیں تھا۔ نہ ہی اس کی نگاہ میں کوئی ایسا ٹھکانہ تھا جہاں وہ کچھ دیر محفوظ رہ سکتا۔ اسے گومگو کی کیفیت میں پا کر تانگے والے نے پھر پوچھا۔

”کیوں جی۔ کہاں جانا ہے؟“

سجاول اسی لمحے ہچکچاہٹ سے باہر نکل آیا۔ غیر ارادی طور پر ہی ایک علاقے کا نام اس کے ذہن میں آیا اور اسے قدرے اطمینان ہو گیا۔ اس نے تانگے والے کو راستہ بتایا اور خود کار کی طرف دیکھا جو ان سے مناسب فاصلہ رکھے ہوئے تھی۔ اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا مونچھوں والا آدمی کبھی کبھی اپنے ساتھی سے کوئی بات کرتا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگتے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس مہم سے بڑا لطف اٹھا رہے ہیں۔ وہ یوں بے پروائی سے اپنا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھے۔ جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ بڑی آسانی سے اپنے شکار کو بے بس کر لیں گے۔

وہ عورت انہیں دیکھ دیکھ کر لرز رہی تھی اور بار بار چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تانگہ ایک اور تنگ سی سڑک پر مڑ گیا جس کے کچے کناروں پر دھول اڑ رہی تھی۔

سجاول نے اپنی جیب سے ایک کرنسی نوٹ نکال کر بڑے غیر محسوس انداز میں تانگے والے کی طرف بڑھایا اور دبی زبان سے بولا۔

”یہ اپنا کرایہ رکھو اور وہ سامنے گلی کے پاس تانگہ روک دینا۔“

ان کے اور سیاہ کار کے درمیان ایک سریئے سے لدا ہوا ریڑھا اور ایک گدھا گاڑی پھنس گئی تھی۔ سجاول نے آہستگی کے ساتھ اس عورت کو مخاطب کیا۔

”بات سنو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ہوش و حواس بحال رکھو۔ جیسے ہی تانگہ رکے تم نیچے اترنے کی کوشش کرنا اور جس طرف میں کہوں اس طرف چل پڑنا۔“

تانگے والے نے گہری نظر سے ان کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں اور اسے گلی کے نکڑ پر روک دیا۔ کار اور ان کے درمیان اب بھی سریئے والا ریڑھا پھنسا ہوا تھا۔ قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آسانی سے گلیوں کی بھول

بھلیوں میں گم ہو سکتے تھے۔

سجاول جلدی سے تانگے سے اترا۔ وہ عورت بھی گرتی پڑتی نیچے آ گئی۔ سجاول نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے گلی میں گھس گیا۔

”وہ لوگ پیچھا کریں گے۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”تم ان کا فکر نہ کرو۔ حوصلہ رکھو۔ جب تک وہ یہاں پہنچیں گے ہم آگے نکل جائیں گے۔“ سجاول نے مدھم لہجے میں اسے تاکید کی اور اس کا بازو کھینچ کر اسے تیز چلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بے ترتیب قدموں سے اس کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرنے لگی۔ سجاول ہر آنے والے موڑ مڑتا چلا گیا۔ وہ گلیوں کی بھول بھلیوں میں ان سے بہت آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ ہانپتی کانپتی اس کے برابر چل رہی تھی۔ اونچی ہیل کے ساتھ اس کے لئے تیز چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی ہیل کی ٹک ٹک سے گلی گونج رہی تھی۔ گلیوں میں آمد و رفت کچھ زیادہ نہیں تھی۔ کہیں کہیں کوئی عورت اپنے مکان کا تھڑا دھو رہی تھی۔ کہیں بچے کمیٹی کے تلکے سے پانی بھر رہے تھے۔

جونہی وہ ایک تنگ گلی کا موڑ مڑے تعاقب کرنے والوں میں سے ایک نوجوان عین ان کے مقابل تھا۔ وہ گلیوں کی بھول بھلیوں میں سے ہوتا ہوا کسی اور جانب سے اس طرف پہنچ گیا تھا۔ ان دونوں کو اچانک سامنے پا کر وہ ٹھٹکا اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ عورت دھک سے رہ گئی۔ سجاول بھی ایک لمحے کے چھوٹے سے حصے کیلئے ساکت ہوا لیکن پھر فوراً ہی اس عورت کا بازو پکڑ کر یوں آگے بڑھا جیسے اس شخص سے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

وہ لپک کر سامنے آ گیا۔ اس کا جو ہاتھ جیب میں تھا یقیناً اس میں پستول تھا۔

”جان عزیز ہے تو اسے چھوڑ کر ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جاؤ۔“ وہ دانت بھینچ کر بولا۔

سجاول فوراً ہی سنبھل گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی جرأت سے بولا۔

”ذرا سنبھل کے میاں! تم ہمارے علاقے میں ہو۔ میں ابھی ایک آواز دوں تو تمہاری ہوا کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔“

اس کے بے خوف انداز پر اس نے قدرے تعجب سے سجاول کی طرف دیکھا۔ سجاول گھبرایا نہیں اور کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔

”ہمیں سب پتہ ہے تم کیا کرتے پھرتے ہو اور پولیس تمہارے پیچھے کیوں لگی تھی۔“

اپنی خیریت چاہتے ہو تو چپ چپاتے یہاں سے نکل جاؤ ورنہ......'' اس نے دانت پیس کر بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اس کے لہجے کا اعتماد تھا یا اس شخص کے دل کا چور وہ لمحے بھر کو متذبذب ہوا۔ سجاول نے یونہی ایک کھلے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اس عورت سے کہا۔

''چل۔ تو تو چل نا تائے کلالے کے گھر۔ میں اس سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔''

وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ یہ اس کی جان پہچان کا علاقہ ہے۔ وہ عورت کچھ متذبذب ہوئی۔ چادر میں سے جھانکتی ہوئی اس کی سیاہ دلکش آنکھوں نے سہمی ہوئی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے جیسے حالات کا اندازہ کر لیا اور نپے تلے قدم رکھتی اس مکان کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

وہ شخص قدرے سٹپٹایا۔ اس نے گرد و پیش یوں دیکھا جیسے کسی امداد کا منتظر ہو۔ سجاول نے بغیر کچھ کہے اسے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے دانت پیس کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پھر کبھی مقابلے کی دعوت دے رہا ہو اور بوجھل قدموں سے دوسری گلی میں گھس گیا۔

سجاول کچھ دیر اس انتظار میں رہا کہ وہ واپس تو نہیں آ جائے گا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اس مکان کی ڈیوڑھی میں جھانکا جس میں وہ عورت داخل ہوئی تھی۔ وہ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی وہ اسے اچانک دیکھ کر ڈر سی گئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''وہ چلا گیا ہے یا نہیں؟''

سجاول نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا اور اسے جلدی چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ چادر لپیٹتی ہوئی ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

اب ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا ممکن نہیں تھا۔ کہیں پناہ لئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اچانک ایک خیال سجاول کے ذہن میں آیا۔ اسے حوصلہ سا ہو گیا۔ اس کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ یہ علاقہ کچھ اس کا دیکھا بھالا ہی تھا۔ وہ اسے ساتھ لئے ہوئے بچتا بچاتا وہاں آ پہنچا جہاں اسے امید تھی کہ وہ کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر سانس لے سکتا تھا۔

وہ بالا خانے کی سیڑھیاں دیکھ کر ٹھٹکی اور گھبرا کر اس سے پوچھنے لگی۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔''

''وہ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ تھوڑی دیر یہاں پناہ لینی ہی پڑے گی۔''

سجاول نے تیزی سے کہا اور اسے سیڑھیاں چڑھنے کو کہا۔ وہ آنکھوں میں ہراسانی

لئے کچھ متذبذب سی یوں کھڑی رہی جیسے سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ سجاول نے اس کا ہاتھ پکڑا اور درشتی سے بولا۔

''اب چلو بھی نا۔ کہیں وہ آ ہی نہ جائیں۔''

وہ زبردستی اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی کشادہ دیوان خانے میں داخل ہوئی۔ دبیز قیمتی قالین پر رنگین چمکیلے گاؤ تکیئے، پاندان اور سازوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ اس نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا پھر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نگاہ اس نے کمرے کے ساز و سامان پر ڈالی اور ایک نگاہ سجاول پر۔ اس کا چہرہ دہک اٹھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی۔

''کمینے...... ذلیل۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔ تم نے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دیا ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم مجھے کس جگہ لے آئے ہو۔''

''میری بات تو سنو۔'' سجاول نے اس کی دونوں کلائیاں تھام لیں۔

''بکواس مت کرو۔ مجھے کچھ نہیں سننا۔ میں ایک منٹ یہاں نہیں رک سکتی۔ چھوڑو مجھے۔ میں جا رہی ہوں۔''

شور سن کر پچھلی طرف قطار میں بنے ہوئے کمروں میں سے کچھ کی چلمنیں اٹھیں۔ کچھ بے رنگ چہروں نے سوالیہ نشان لئے ہوئے باہر جھانکا۔ بھدے جسم والی نائیکہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی ہانپتی ہوئی باہر نکلی۔

سجاول نے بکتی جھکتی عورت کا بازو پکڑا اور اسے زبردستی گھسیٹتا ہوا نیلم کے دروازے پر پہنچا اور چلمن اٹھا کر زور سے دستک دی۔

دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور نیلم کا دلربا پیکر نظر آیا۔ سجاول کو دیکھ کر اس کے دلنشیں چہرے پر خوشی کا رنگ چمکا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ سجاول تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے ابھی تک اس عورت کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اسی بھاگ دوڑ اور ہاتھا پائی میں چادر اس کے سر سے ڈھلک گئی تھی۔ اس کے سیاہ بال کھل کر بکھر گئے تھے۔

نیلم وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ پھر رکے قدموں سے اس کی طرف بڑھی اور اسے دونوں شانوں سے تھام کر بولی۔

''ہائے...... بخت آور! تم یہاں کہاں؟''

سجاول نے حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں میں

پرانی شناسائی تھی۔ بخت آور سپید چہرے کے ساتھ یوں کھڑی تھی جیسے اسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔ نیلم کے چہرے کا رنگ بھی اڑا اڑا سا تھا۔ یوں جیسے کچھ سمجھ نہ پا رہی ہو۔

اسی وقت نائیکہ اپنے تھل تھل کرتے وجود کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔

"اے ہے...... نیلم! سنا ہے بخت آور آ گئی ہے۔" اس کی گلے میں پھنسی ہوئی آواز میں مکروہ مسرت کی جھلک تھی۔

"ہائے۔ میں صدقے۔ میں قربان۔" بخت آور کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اسے نیلم سے علیحدہ کرتے ہوئے اپنی بانہوں میں لے کر بولی۔

"ماں واری۔ آج کتنا خوشی کا دن ہے۔ میری بیٹی اپنے گھر آ گئی ہے۔ میں صدقے میں قربان۔ میری بیٹی۔ ماں کو نہیں بھولی۔"

وہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ اور سجاول بڑی حیرت اور تعجب کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے اس عورت کی اداکاری پر حیرت بھی ہو رہی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس لئے خواہ مخواہ اسے کتنا پریشان کیا تھا اور اب بھی کتنی دیدہ دلیری کے ساتھ اس سے جھگڑا کر رہی تھی کہ وہ اسے یہاں کیوں لے کر آیا تھا۔

"آپا۔ اب اسے چھوڑو بھی نا۔ آرام سے بیٹھنے تو دو۔" نیلم نے آگے بڑھ کر اسے نائیکہ کی گرفت سے چھڑا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہوش میں نہیں۔ نائیکہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ اب بھی اس پر صدقے قربان ہو رہی تھی۔

دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے گھنٹہ بجا کر گزرتے ہوئے وقت کا احساس دلایا۔ سجاول نے چونک کر اپنی گھڑی دیکھی۔ اسے اس دھوڑ دھوپ میں خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اسے واپس جانا چاہئے تھا شاید دلشاد اپنی حویلی واپس پہنچ گیا ہو۔ وہ عورت تو اپنے ٹھکانے پر پہنچ ہی گئی تھی۔

اس نے نیلم کو مخاطب کر کے کہا۔ "اچھا۔ میں چلتا ہوں۔"

نیلم نے چونک کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی بات نہ سمجھی ہو۔ پھر اس نے افسردگی سے ایک نگاہ بخت آور کے فق چہرے پر ڈالی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"جا رہے ہو؟" وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"ٹھہر جاؤ ذرا۔ ذرا ٹھہرو۔"

"کیا بات ہے؟" سجاول نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ نہ جانے کیوں اس کا یہاں دم سا گھٹنے لگا تھا۔ اس معصوم چہرے والی عورت کو اس ماحول میں رچے بسے دیکھ کر اسے کچھ عجیب سا دکھ اور پریشانی ہو رہی تھی۔

نیلم نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا۔ کچھ جھجکی پھر اس نے پلٹ کر نائیکہ اور بخت آور کی جانب دیکھا۔ پھر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر رک گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں نم سی ہو رہی تھیں۔ سجاول نے اکتا کر سر جھٹکا۔ نیلم ہمیشہ ہی رخصت کے لمحے کو جھیلنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے چلنے کی ٹھانی اور چلمن اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

نیلم اس کے پیچھے پیچھے دالان تک آئی۔ سجاول نے اس کے قدموں کی چاپ پر مڑ کر دیکھا اور پل بھر کو تھم گیا۔

"اچھا نیلم۔ اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ مقدر ہوا تو پھر کبھی اسی طرح یوں ہی چلتے چلتے ملاقات ہو جائے گی۔"

نیلم نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیوں تک پہنچا اور تیز تیز سیڑھیاں اتر گیا۔ نیلم وہیں کھڑی ہاتھ ملتی رہ گئی۔

وہ نیلم کے یہاں سے نکل تو آیا تھا لیکن یہ اندیشہ بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا کہ کہیں بخت آور کو تلاش کرنے والے لوگ اس کی تاک میں نہ ہوں۔ وہ اسے بخوبی پہچانتے تھے لیکن اب پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ انہیں آسانی سے بتا سکتا تھا کہ بخت آور وہیں پہنچ گئی تھی جہاں اس کا ٹھکانہ تھا۔ پھر ان کی مرضی تھی کہ اسے تلاش کریں یا کوٹھے والوں سے جھگڑا لیتے پھریں۔

تھوڑی دور پیدل چل کر وہ ایک سواریوں والے تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ تقریباً بھر چکا تھا۔ بس ایک آدھ سواری کی ہی مزید گنجائش تھی۔ کوچوان کم عمر اور چلبلا تھا۔ وہ راستہ چلتوں اور تانگے کے سامنے آ جانے والوں پر مزے مزے کے فقرے کس رہا تھا۔ اس کی شوخی اور چلبلے پن نے اسے شہزادی کی یاد دلا دی جو اسی طرح شوخیاں کرتی تانگہ چلایا کرتی تھی۔ نہ جانے وہ ملاں سے بچ کر کہاں گئی تھی اور کس حال میں تھی۔ اس روز کے بعد اس کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ نہ ہی اسے اتنی فرصت ہی ملی تھی کہ اس کے بارے میں پتہ چلاتا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے پہلو میں کسی سخت چیز کی چبھن سی محسوس ہوئی۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر نے پستول کی نال اس کے پہلو سے لگا رکھی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس نے پستول کی نال پر دباؤ بڑھا دیا اور بھینچے ہوئے ہونٹوں اور درشت لہجے میں تانگے والے سے بولا۔

''تانگہ روکو۔''

تانگے والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید اس کی نظر پستول پر پڑ گئی تھی کہ یکدم اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ گھوڑا پھسلتے ہوئے سموں کے ساتھ رکتے رکتے رک گیا۔ سجاول کے لئے کوئی انتہائی اقدام کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بھرے بازار میں وہ لوگوں کو متوجہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ وہی گروہ ہے جو بخت آور کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایک نیلی کار تانگے سے کچھ ہی فاصلے پر رک گئی تھی۔ اس شخص نے اسے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ بغیر کچھ کہے نیچے اتر آیا اس نے غالباً تانگہ بان کو پیسے بھی نہیں دیئے اور اس کے پیچھے پیچھے نیچے اتر آیا۔

فٹ پاتھ کے ساتھ لگی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سجاول کو اس کے اندر بیٹھ جانا پڑا اور گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا اور گاڑی ایک شاندار کوٹھی کے پورچ میں آن رکی۔ وہ بے خوفی سے ان کے ساتھ باہر نکلا اور ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اندھیری سی راہداری میں پہنچا۔ ایک چھوٹے سے دروازے میں وہ جھک کر داخل ہوئے جہاں دیواروں کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے کچھ نوجوان قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ کمرے کی فضا سگریٹوں کے دھوئیں سے دھندلی دھندلی سی ہو رہی تھی۔ تمباکو کی تیز بو نے سجاول کو بھی سگریٹ کی طلب کا احساس دلایا لیکن وہ ضبط کر گیا۔

کمرے میں آرائش کا کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ جس قالین پر کھڑا تھا وہ بے حد قیمتی اور دبیز تھا۔ اس کے مقابل دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا ڈھیلا ڈھالا سا شخص تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور بھاری آواز میں تحکم بھر کر بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

سجاول بیٹھ گیا تو اس نے بڑی بے تکلفی سے سوال کیا۔

''ہاں بھئی۔ تم نے بخت آور کو کہاں پہنچایا ہے۔''

سجاول کو اب کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں تھی اس نے بے نیازی سے کہا۔

''وہ تو وہیں پہنچ گئی ہے جو اس کا اصل ٹھکانہ تھا۔''

''کہاں؟'' وہ کڑے لہجے میں پوچھنے لگا۔

''کیوں؟ تمہیں معلوم نہیں کہ اس کا اصل تعلق کہاں سے تھا۔'' سجاول نے بھی تیکھا لہجہ اپنایا۔

''تو تم اس کے مامے لگتے تھے جو سارا دن اسے لئے لئے پھرتے رہے ہو؟'' وہ بھڑک کر بولا۔

''اپنے آپ میں رہو سمجھے۔'' سجاول نے بھی غصے سے کہا۔

''جب اس نے مجھ سے پناہ مانگی تھی تو میں اسے کوئی شریف عورت ہی سمجھ رہا تھا۔''

وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے میں سے ایک لڑکا تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوا اور اس کے برابر بیٹھ کر قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''باس وہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔''

اس کے چہرے کا رنگ کچھ بدلا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اپنے ایک ساتھی سے بولا۔

''اسے بند رکھو۔ میں ابھی آ کر دیکھتا ہوں۔''

سجاول نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کوئی پریشانی ہے۔ باس کے دو ساتھی اس کے اردگرد آ کھڑے ہوئے۔ وہ ان کے ساتھ اٹھا اور دروازے سے نکل رہا تھا کہ اس کی نظر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ سیاہ برقع میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کا میک اپ سے رنگین چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ریشمی سیاہ نقاب کو اس نے لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہونٹوں میں دبا رکھا تھا۔ راہداری میں روشنی کم تھی اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا لیکن نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ وہ ان دونوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور اس نے یہی خیال کیا کہ وہ اس کا وہم ہی تھا۔

وہ اسے ایک کمرے میں دھکیل کر غائب ہو گئے۔ سجاول بے حد بدمزہ ہوا۔ وہ ان لوگوں میں کہاں آن پھنسا تھا۔ اسے بھوک بھی لگی تھی اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے سے ملحق کوئی غسلخانہ بھی نہیں تھا جہاں وہ پانی کے دو گھونٹ بھر کر اپنی پیاس بجھا سکتا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کوئی آہٹ کوئی صدا کہیں قریب سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس عالم میں رات کاٹنی بہت دشوار تھی۔

وہ کافی دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی لیکن خالی پیٹ نیند کو آواز دینا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ مگر کروٹیں بدل بدل کر اور چھت کو گھور گھور کر وہ اکتا سا گیا۔ پریشان ہو کر اٹھا اور ادھر ادھر ہاتھ مار کر دیکھنے لگا مگر کمرے میں کوئی ایسی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی جس سے وہ زور آزمائی کر سکتا۔

پھر اس کی نگاہ کمرے میں ایک کونے میں رکھی ہوئی پرانی سی الماری پر پڑی۔ تھوڑی کوشش سے وہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر یوں ہی الم غلم بھرا پڑا تھا مگر کام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے دراز کھینچ کھینچ کر دیکھنے شروع کئے لیکن ان میں بھی کچھ خاص نہیں تھا۔

اچانک دراز کھینچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری کی ساری الماری ہی اس کے سر پر آ رہی ہے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا تو یہ دیکھ کر وہ لمحے بھر کو حیران رہ گیا کہ الماری کے اندر ایک خفیہ دروازہ کھل گیا تھا۔ اس کے سارے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ کچھ دیر متذبذب سا کھڑا رہا کہ اندر جائے یا نہیں مگر پھر اس نے ہمت باندھی اور جھک کر اس چھوٹے سے خفیہ دروازے میں داخل ہو گیا۔

آگے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کچھ بجھائی نہیں دیتا تھا۔ شاید کہیں اسے روشنی جلانے کا بٹن مل ہی جاتا لیکن اس میں خطرہ تھا۔ نہ جانے اس اندھیرے میں کیا کچھ پوشیدہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک دیوار کا سہارا لیتے ہوئے قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس کی ساری حسیں پوری طرح سے بیدار تھیں اور وہ چوکنے پن سے اندھیرے کے اس خاموش سمندر میں اترتا جا رہا تھا۔

یکا یک ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا اور پوری توجہ سے سننے لگا کہ آواز کس سمت سے آ رہی ہے۔ اور کس کی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شدید کرب سے کراہ رہا ہے۔ سجاول نے غور کیا تو اسے لگا جیسے وہ آواز نسوانی ہے۔

معاً اسے اس لڑکی کا خیال آیا جو اس نے باس کے کمرے کے باہر دیکھی تھی۔ شاید وہی تھی۔ نہ جانے اس پر کیا گزری تھی جو اس کی کراہوں میں درد اور اذیت تھی۔ سجاول اندازے سے آواز کی سمت بڑھا۔ اسے خیال تو آیا کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے مگر آواز کے درد نے اسے ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ کچھ اور اس کی طرف بڑھا اور اس نے صدا دی۔

''کون ہو تم؟ تم کون ہو؟''

جواب میں ایک لمبی کراہ یوں سنائی دی جیسے کسی نے کچھ کہتے کہتے ہونٹ بھینچ لئے ہوں۔ سجاول پھر اسی سمت چند قدم اور بڑھا اور راستے میں آ جانے والی میز یا کرسی سے ٹکرایا جسے وہ اندھیرے میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ خاموشی سے لبریز فضا میں بے ہنگم سا شور اٹھ پڑا۔ سجاول دم سادھ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا اور کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ کوئی متوقع خطرہ اس کی جانب لپکتا تو نہیں۔ ڈراؤنے لمحے اس کے برابر سے گزرتے رہے۔ ایک...... دو...... تین۔ ایک کے پیچھے ایک۔ بہت سارے لمحے گزرے لیکن کچھ نہیں ہوا تو اس نے پھر اندھیرے کے پردے کو اپنی آواز سے چاک کیا۔

''کون ہے؟ یہاں کون ہے؟''

اس کے سوال کا جواب ایک طویل سسکاری کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن اس نے آواز کی سمت کا تعین کر لیا اور قدرے بے خوفی سے آگے بڑھا۔ اچانک اس کے پاؤں کسی سے ٹکرائے۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی فرش پر پڑا ہے۔ وہ جلدی سے نیچے جھکا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

اس کے ہاتھ ٹھنڈے پڑتے انسانی جسم سے ٹکرائے اور اسے سانسوں کی آواز سنائی دی۔ کبھی ڈھیلی۔ کبھی تنی ہوئی۔ سجاول نے پھر پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں پڑی ہے؟ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زخمی ہے۔ اسے مدھم سی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''سجاول۔ سجاول۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔''

سجاول دھک سے رہ گیا۔ یہ کون تھی جس نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ آخر وہ کون ہو سکتی تھی جو اس کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس نے گھبرا کر اسے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''سجاول میرا وقت آ گیا ہے۔ اب میں نہیں بچوں گی۔ تم تم میرے پاس۔'' اس نے بمشکل یہ لفظ ادا کئے مگر فقرہ مکمل کرنا شاید اس کی اٹکتی رکتی سانسوں کیلئے محال تھا۔ سجاول بے حد پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرتی ہوئی لڑکی کون ہے جو اس کو اچھی طرح سے جانتی ہے۔ اس کی نقاہت سے لرزتی آواز بھی پہچانی نہیں جا رہی تھی نہ ہی وہ اندھیرے کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے سامنے شاید موت سے قریب ہوتی جا رہی تھی مگر وہ اس کے خشک ہونٹوں کو ایک قطرے پانی سے بھی سیراب نہیں کر سکتا تھا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے اٹھا کر کمرے میں لے جاتا۔ وہاں کم از کم روشنی تو تھی اس نے اس کے شانو تلے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ۔ میں تمہیں کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں روشنی ہے۔ میں تمہارے زخم تو دیکھوں کہ تم کتنی زخمی ہو۔''

''نہیں۔نہیں۔'' وہ یوں کراہی جیسے اس کا کوئی زخم دکھ گیا ہو۔

''مجھے اسی اندھیرے میں مرجانے دو۔ بس تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر۔''

''گھبراؤ مت۔ ہمت سے کام لو۔ تم بچ جاؤ گی۔ میں ابھی دروازے کھٹکھٹا کر انہیں بلاتا ہوں۔''

''اب میں جی کر کیا کروں گی؟''

سجاول الجھ گیا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے قدرے زور دے کر کہا۔

''کچھ بتاؤ تو سہی۔ تم کون ہو؟ مجھے کس طرح جانتی ہو؟''

''میں...... میں'' اس نے اکھتی سانسوں کے درمیان کہا۔ ''شہزادی ہوں۔''

سجاول کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ اس نام نے جیسے اس کے اندر باہر کو تہہ و بالا کر دیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ شوخ اور چنچل شہزادی جو زندگی کی حرکت و حرارت سے بھرپور تھی یوں اس کے سامنے زخم زخم وجود لئے زندگی کی بازی ہار جائے گی۔ اس نے ہلکے ہلکے ہاتھ اس کے زخمی وجود پر رکھے اور دکھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''شہزادی...... تو یہاں کہاں؟''

اسے وہ لمحے یاد آ رہے تھے جب عرس کی رات شہزادی اس سے کہہ رہی تھی ''سجاول ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔'' اسے اس کی شریر ہنسی۔ اس کی شوخیاں، اس کی اٹھکیلیاں یاد آ رہی تھیں۔ مگر اب تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

اس کے جواب میں شاید اس نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک درد بھری کراہ نکلی۔ سجاول اس پر جھک گیا۔ شہزادی کی زبان شاید اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے نہ جانے کیا کہا لیکن سجاول کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے بہت غور کیا تو اسے صرف ایک لفظ ملاں ہی سمجھ میں آیا۔ ملاں کا نام ایک انگارے کی طرح اس کی سماعت میں اتر گیا۔

اسے ساری بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ بے بس نادان لڑکی اس کے ہاتھ آ گئی تھی اور آج اس حال میں اس کے سامنے موت اور زندگی کی کشمکش میں اسیر تھی۔ اس کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ وہ معصوم سی سادہ لڑکی زمانے کی سختیوں کے طوفان میں ایک تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ سجاول نے پھر گھبرا کر اسے تھامنے کی کوشش کی۔

''شہزادی...... شہزادی۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تم زندہ رہو گی۔ تم زندہ رہو گی۔''

اس نے ہچکی سی لی اور بے سدھ ہو گئی۔ سجاول نے ٹٹول کر اس کی سانسوں کی حدت کو محسوس کرنا چاہا لیکن اس کے سرد ہوتے وجود میں کوئی حرارت نہیں جاگی۔ سجاول کے ہاتھوں سے زندگی پھسلتی چلی گئی۔ سجاول آپ سے آپ وہ سب کچھ پڑھنے لگا جو گاؤں کے مولوی صاحب نے بچپن میں اسے یاد کرایا تھا۔ اس کی پلکیں نم سی ہو گئیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندھیرے کے پردے میں جو کچھ سن اور محسوس کر رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ ابھی ابھی جس زخم زخم وجود نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑا ہے وہ شہزادی ہی ہے۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ شوخیوں اور شرارتوں سے معمور ہنستی کھیلتی شہزادی یوں ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گی۔

یکا یک تہہ خانے میں ہلکی ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ سجاول نے چونک کر چاروں طرف دیکھا یہ کس نے روشنی جلائی تھی۔ مدھم نیلی روشنی میں اس کی آنکھوں کو دیکھنے اور پہچاننے میں کچھ دیر لگ گئی۔

اس کے مقابل باس کھڑا تھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ سجاول خود بھی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ شہزادی کی لاش اب نظر آنے لگی تھی۔ اس کے کپڑے نچے ہوئے تھے اور چہرے پر خراشیں تھیں۔ اس کی آدھ کھلی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سے جیسے اذیت جھانک رہی تھی۔ وہ یوں ساکت سا کھڑا تھا جیسے وہ زندہ نہ ہو۔ باس نے اسے مخاطب کیا۔

''پولیس کا چھاپہ پڑا ہے۔ ساری کوٹھی کو انہوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے نہ جانے ان کون ان کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ وہ کس وقت یہاں تہہ خانے میں پہنچ جائیں۔''

سجاول نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات نہ سمجھا

ہو۔اس کے ذہن میں سے ابھی تک شہزادی کا دلنشیں پیکر نہیں نکلا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے زخم زخم پڑی تھی۔اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔اسے جیسے کسی کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔

باس نے اس کا شانہ ہلایا۔

''یار تم کہاں کھوئے ہوئے ہو۔بچنے کی تدبیر کرنی ہے تو کر لو۔نہیں تو پولیس کے ہاتھ آ گئے تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ کیا کچھ کرتے ہیں۔''

سجاول نے ہونٹ چبا کر اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا اور شہزادی کے مردہ جسم کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''یہ سب کس نے کیا ہے؟''اس کا لہجہ بے حد درشت تھا۔

''مجھے تو پتہ نہیں۔''باس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

''یہ واقعہ تمہارے ٹھکانے پر ہوا ہے اور تمہیں پتہ نہیں؟''سجاول آگ بگولہ ہو گیا۔

''آرام سے یار آرام سے۔یہ اس قسم کی باتوں کا وقت نہیں ہے۔یہاں سے نکلنا چاہتے ہو تو نکلو۔نہیں تو بعد میں پولیس نے تمہیں اس لاش کے ساتھ گرفتار کر لیا تو......''اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

سجاول کے پاؤں جیسے کسی نے باندھ دیئے تھے۔وہ اپنی جگہ پر کھڑا شہزادی کے بے جان وجود کی طرف حسرت و یاس سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

''یار۔چلنا ہے تو چل۔''باس کی آواز میں اکتاہٹ تھی۔

''میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تیرا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔تجھے خوامخواہ نہیں پھنسنا چاہئے۔اگر تو یہاں رہ کر اس لاش کا سوگ منانا چاہتا ہے تو تیری مرضی......''

سجاول نے چونک کر دیکھا۔باس نے ایک خفیہ دروازہ کھول لیا تھا جہاں سے وہ زندگی کی طرف جا سکتا تھا۔نہیں تو اس کا مقدر تاریکی اور موت تھی لیکن فیصلے کا یہ لمحہ صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔یہ چند قدم کا فاصلہ اس کے لئے پل صراط کا سفر بن گیا تھا۔کیا وہ شہزادی کے نرم و نازک وجود کو یہاں اس تاریک تہہ خانے میں سڑنے کے لئے چھوڑ دے۔اس سوچ نے اسے جکڑ لیا۔اس کا دل شہزادی کی میت کو یوں بے گور و کفن چھوڑ کر جانے پر نہیں مانتا تھا۔

''یار کیا بات ہے؟کہیں تم اس لڑکی کو جانتے تو نہیں؟''باس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔

سجاول نے سر جھٹک کر انکار کیا تو وہ جیسے حتمی لہجے میں بولا۔

''اچھا یار اگر تو نے چلنا ہے تو چل ورنہ میں جاتا ہوں۔''

اس کے پیچھے چل پڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔وہ اپنے اندر ہونے والی موسلا دھار بارش کی پروا کئے بغیر شہزادی کی لاش کے برابر سے گزر کر باس کے ساتھ ہولیا۔

باس خفیہ دروازے میں یوں داخل ہوا جیسے نشیب میں اتر گیا ہو۔سجاول بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔یہ چھوٹی چھوٹی سی سیڑھیاں تھیں جو دونوں تاریکی میں اندازے سے آگے پیچھے اترتے رہے۔آخری سیڑھی پر باس نے مڑ کر دیکھا۔سجاول بھی رک گیا۔آگے شاید پھر کوئی دروازہ تھا جو نیم تاریکی میں ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

''دیکھ۔اس گیٹ سے پار آزاد دنیا ہے۔میرا خیال ہے ہم یہیں پر طے کر لیں کہ آزاد دنیا میں ہم دوست ہوں گے یا اجنبی۔''وہ ایک ایک لفظ تول کر بولا۔

سجاول کا دل و دماغ سب کچھ وہیں شہزادی کی لاش کے پاس تہہ خانے میں تھا۔وہ الجھا ہوا سا تھا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔اس نے یونہی بے یقین سے لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''میں جی دار اور دلیر لوگوں کی قدر کرتا ہوں۔اگر تم چاہو تو میرے ساتھ دوستی کا رشتہ رکھ سکتے ہو۔ہم ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں۔''

سجاول نے لمحے بھر کو سوچا۔اس کے ساتھ دوستی رکھنے میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں تھا۔وہ تو پہلے ہی تاریکی کی دنیا کا راہی تھا۔ملاں سے قطع تعلق کے بعد اسے کسی سہارے یا آسرے کی ضرورت یقیناً تھی۔وہ تنہا اس دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔اسے اس کی پیشکش قبول کر ہی لینی چاہئے تھی۔اسی خیال سے اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہم دوستوں کے دوست ہیں۔''

''تو ہو گئی بات۔''اس نے تیزی سے کہا اور آہنی گیٹ بغیر آواز کے کھول لیا اور اوپر کا دھڑ گیٹ سے باہر نکال کر کچھ دیر اردگرد کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

''ابھی تو رستہ صاف ہی لگتا ہے۔''

''چلو پھر جلدی کرو۔''سجاول نے کہا۔

اس نے پھر ایک بار باہر جھانک کر تسلی کی اور گیٹ سے باہر قدم رکھا۔ سجاول بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

تنگ سی گلی بالکل سنسان اور تاریک تھی۔ رات کے پچھلے پہر کا سکوت چاروں طرف برس رہا تھا۔ اس گلی کی جانب زیادہ تر مکانوں کی پشت تھی۔ رات گہری ہونے کی وجہ سے زیادہ تر مکان اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ہلکی ہلکی سی لائٹ دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی ساری حسیں جاگتی تھیں اور وہ چوکنے پن سے ایک دوسرے کے برابر چل رہے تھے۔ گلی مختصر اور تاریک تھی۔ وہ جیسے ہی اس کے موڑ پر پہنچے بھاری قدموں کی چاپ نے ان کے دل کی دھڑکنیں بڑھا دیں۔ سجاول کے دل میں اندیشے کا ایک کانٹا سا کھٹکا۔ اگر پولیس نے اسے باس کے ساتھ گرفتار کر لیا تو؟ تو ناکردہ گناہ بھی اس کے نام لکھے جائیں گے۔ اس خیال سے ہی اسے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

باس نے اسے تیز چلنے کا اشارہ کیا اور گلی کا موڑ مڑ گیا۔ سجاول بھی قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ہی گلی کا موڑ مڑا۔ علاقے کا چوکیدار ان کے سامنے تھا۔

”خو۔ تم کون ہو؟ اس وقت کدھر کو جاتی ہے؟“

ان دونوں نے قدم نہیں روکے۔ باس نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

”او خان سمجھا کرو نا۔ اس وقت ہم کدھر سے آ سکتی ہے۔ دعا کرو بیوی کی آنکھ نہ کھل جائے۔“

پٹھان نے گوشت میں دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھوں سے انہیں جانچا اور بات سمجھ کر ہنستا ہوا بولا۔

”خو چلو چلو۔ کسی دن تو تمہارا بیوی کا آنکھ کھل ہی جائے گا۔“

باس نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر یوں ہاتھ مارا جیسے اس کی بات کا بہت مزہ لیا ہو اور رازداری سے پوچھنے لگا۔

”یار خان! اس طرف راستے میں کہیں پولیس والے تو نہیں تھے۔ ہمیں کہیں ٹکر ہی نہ جائیں۔ خوامخواہ آوارہ گردی میں دھر لیں گے۔“

”خو۔ تم پولیس سے نہیں بچ سکتی۔ وہ سارے علاقے میں گشت کرتا ہے۔ یہاں پچھلی طرف ایک کوٹھی پر چھاپا جو پڑا ہے۔“ خان کی بھاری آواز سے ساری گلی گونج اٹھی۔

”کوئی نہیں یار! ہم کونسا چوری کر کے بھاگے ہیں۔ جو پولیس سے گھبرائیں۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ وہ اور وقت ضائع نہ کریں۔“ باس نے خوش طبعی سے کہا۔ اور چوکیدار سے نزدیک ہو کر بولا۔

”جیب میں تو اس ظالم نے ایک پیسہ نہیں رہنے دیا۔ پولیس کو کہاں سے چڑھاوا چڑھائیں گے۔“

چوکیدار بھی ہنس پڑا۔ اور انہیں بے ضرر سمجھ کر بولا۔ ”خوب تم ادھر چھوٹی گلی میں سے نکل جاؤ۔ آخر میں ایک ٹوٹا ہوا مکان خالی پڑا ہے۔ اس میں گھسو اور پچھلی طرف نکل کر سڑک پر چڑھ جاؤ۔“

”او جیو خان! جیو۔ اللہ تمہیں وطن لے جائے۔“ باس نے زندہ دلی سے نعرہ لگایا۔ اور وہ دونوں اسے سلام کرتے ہوئے ایک اور تاریک گلی میں مڑ گئے۔

گلی زیادہ طویل نہیں تھی۔ ٹوٹا ہوا خالی مکان چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ زندگی سو رہی تھی۔ گردوپیش کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔ مٹی، روڑے اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے کھنڈوں کو پھلانگتے وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے کسی نے للکار کر کہا۔ ”ٹھہر جاؤ۔“

اس غیر متوقع آواز نے انہیں لرزا دیا۔ اور ٹھٹک کر وہیں ساکت ہو گئے۔ باس کا ہاتھ فوراً اس کی جیب پر گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ دیکھا۔ بکھرے ہوئے بالوں اور بے ترتیب داڑھی والا ایک سایہ کھڑا جھوم رہا تھا۔

”کون ہو تم؟“ وہ چلایا۔

دونوں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ کوئی پاگل تھا۔ وہ دائیں بائیں جھولتا بار بار ان سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہیں؟ اور یہاں کیوں آ گئے ہیں؟

”سالا پاگل ہے۔“ باس نے دبی زبان سے کہا اور دونوں اسے نظر انداز کرتے ہوئے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ اپنا فقرہ دوہراتا ہوا انکے پیچھے پیچھے آیا۔ لیکن وہ دروازے کی ٹوٹی ہوئی چوکھٹ عبور کر گئے۔ سامنے سڑک نظر آ رہی تھی۔

وہ بس کے اڈے کی طرف نہیں گئے۔ نہ ہی انہوں نے اسٹیشن جانے کا سوچا۔ باس کا خیال تھا کہ انہیں کسی سے لفٹ لے لینی چاہیے۔ سجاول نے اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن تم جانا

کہاں جانا چاہتے ہوں؟"

"میرے پاس دو چار ٹھکانے تو ہیں۔ لیکن میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔ کچھ لڑکے پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ اگر انہوں نے کچھ بک بکا دیا۔ تو مصیبت ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ بالکل الگ ہو کر گزاروں۔ زیر زمین۔ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی جگہ ہے؟"

"جگہ۔" سجاول نے سوچا۔ اسے گورکن کی کٹیا کا خیال آیا۔ وہ وہاں پناہ لے سکتا تھا اور کچھ عرصہ وہاں گزار سکتا تھا۔ وہیں وہ اس کو جانچ بھی سکتا تھا کہ جو کچھ وہ دعوے کرتا ہے۔ ان میں کتنی صداقت ہے۔ وہ کس حد تک اس کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی خیال سے اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ہاں میرے پاس ایک جگہ ہے۔ جہاں تم کچھ روز الگ تھلگ رہ سکتے ہو۔"

"تو پھر ہو گئی بات۔" وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "دوستی کی ہے تو اعتماد تو کرنا ہی پڑے گا۔"

دونوں نے ایک ٹرک پر لفٹ لی اور قبرستان جانے والی سڑک کے قریب اتر گئے۔ کچھ دور پیدل چل کر وہ قبرستان کی چاردیواری کے قریب پہنچے۔ تو صبح ہو رہی تھی۔ باس اردگرد پھیلی ہوئی قبروں کو یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے کبھی قبرستان دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ سجاول نے یونہی بات کرنے کی خاطر کہا۔ "یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ صرف ایک بابا ہے اور اس کی نواسی۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

باس خاموش ہی رہا اور جواب میں کچھ نہیں بولا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل پر دہشت سی چھا گئی ہے۔

گورکن کی کٹیا نظر آنے لگی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بوڑھا ابھی تک اٹھا نہیں۔ ورنہ تو وہ اذانوں کے ساتھ ہی اٹھ کر وضو وغیرہ کرنے میں لگ جاتا تھا۔ وہ آگے آگے کچھ برآمدے میں داخل ہوا۔ اور اس نے جھانک کر کمرے میں دیکھا۔ بوڑھا چٹائی پر بے سدھ سا پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی چھیمو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ کمرے میں لالٹین کی مدھم مدھم سی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

سجاول کو حیرت ہوئی۔ یہ چھیمو صبح ہی صبح اس طرح کیوں بیٹھی تھی۔ وہ تو صبح ہونے تک سوئی رہتی تھی۔ بابا اسے آوازیں دے دے کر جگاتا تو اٹھتی تھی۔ سجاول نے چھیمو کے

قریب پہنچ کر ہولے سے اس کے بالوں کو چھوا۔ وہ شاید بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ اس کے چھونے سے وہ ایک دم ڈر سی گئی اور اس کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر اس کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے پہچان نہ پائی ہو۔۔

"چھیمو! چھیمو! آنکھیں کھول کر دیکھ۔ میں ہوں تیرا چاچا۔ سجاول نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

وہ چند لمحے خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھتی رہی۔ جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ سجاول نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔ "چھیمو! چھیمو! دیکھ میں آ گیا ہوں۔"

"چاچا!" اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری نکلی۔ "تو کہاں چلا گیا تھا ہمیں چھوڑ کر۔ دیکھ تو بابا کتنا بیمار ہے۔ ہمارے پاس نہ دوائی ہے نہ پیسے۔ نہ کوئی یہاں آتا ہے۔ میں کیا کروں یہاں اکیلی۔ کدھر جاؤں۔" اس کی آواز رندھ گئی اور آنسو اس کے سانولے رخساروں پر پھیل آئے۔

"بس۔ بس۔ بس۔ اب رونا مت۔" سجاول نے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔ "میں آ گیا ہوں نا۔ بابا کو دوائی لا کر دوں گا۔ اسے حکیم صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔ دیکھنا بابا بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے چہرے پر اطمینان کی چمک آ گئی۔ اس نے دوڑ کر بابا کا شانہ ہلایا۔ "بابا! بابا! دیکھ چاچا آ گیا ہے۔ دیکھ بابا! چاچا آ گیا ہے۔ یہ تجھے دوائی لا کر دے گا۔ تجھے حکیم صاحب کے پاس لے جائے گا۔ بابا! تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کون ہے؟" بوڑھے کی غنودگی میں ڈوبی ہوئی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی۔ سجاول بوڑھے پر جھکا اور اس کی نبض ٹٹولی۔ اسے تیز بخار تھا۔ جس نے اسے غافل کر رکھا تھا۔ اس نے بھی بوڑھے کا شانہ ہلا کر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔

"بابا ہوش کر۔ دیکھ میں آ گیا ہوں۔"

بوڑھے نے اپنی چندھی چندھی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ جن میں میلا میلا پانی بھرا ہوا تھا۔ اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پہچان نہ پایا ہو۔ پھر جیسے کسی اور لمحے میں دیکھتا ہوا بولا۔

"قدیریا! تو آ گیا۔"

سجاول کو محسوس ہوا کہ بوڑھا اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اس لئے اس نے اسے باور کرانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون ہے۔ نہ جانے وہ کس کے بھلاوے میں تھا۔ یا اس کے

ذہن میں کون ایسا تھا۔ جس کے آنے کی آس اس کی سانسوں کی ڈوری کے ساتھ بندھی تھی۔

باس جو پہلے ہاتھ باندھے کچھ اجتناب اور کراہیت کے سے عالم میں الگ الگ سا کھڑا تھا۔ وہ بھی ذرا قریب آ گیا۔ اور جھک کر بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔

سجاول نے ہولے ہولے بوڑھے کا بازو تھپتھپایا۔ اور اسے حوصلہ دینے کو بولا۔

''ہاں بابا! میں آ گیا ہوں۔ میں نے تیرے پاس نہیں آنا تھا۔ تو کس کے پاس آنا تھا۔ آنکھیں کھول۔ دیکھ میں آ گیا ہوں۔ تیرا قدیرا۔''

بوڑھے کے ستے ہوئے جھریوں بھرے چہرے پر تازگی کی ایک لہر سی لہرائی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں میں حرکت ہوئی۔ اس نے پھر ایکبار اپنی گدلی گدلی آنکھیں کھولیں۔ جن میں اشتیاق اور ایک طویل انتظار کے بارآور ہونے کی خوشی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن نقاہت اور بخار کی سختی نے اسے کچھ نہیں کہنے دیا۔ لیکن اس کے بوڑھے چہرے پر بکھرتی طمانیت بتا رہی تھی کہ اس نے اس کی بات سن لی تھی۔

سجاول نے جھیمو سے کہا۔ ''بابا کا بخار تیز ہے۔ تو تھوڑا پانی کٹورے میں ڈال کر لے آ بابا کے سر پر گیلی پٹیاں رکھنی ہیں۔''

جھیمو دوڑ کر پانی لے آئی۔ پھر اس نے کپڑے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا اور غالباً کوئی کپڑا موجود نہ پا کر اپنی میلی اوڑھنی کا پلو بھگو کر ہی بابا کے سر اور پیشانی پر رکھنے لگی۔

''بابے کی حالت ٹھیک نہیں۔'' سجاول نے باس سے کہا۔

''ہوں۔'' وہ چونک گیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا کہا تم نے؟''

''میں کہہ رہا ہوں کہ بابا کی حالت ٹھیک نہیں۔ اسے دوائی کی ضرورت ہے۔'' سجاول نے وضاحت کی۔

باس کسی سوچ میں تھا۔ اس نے ایک نظر بوڑھے پر ڈالی اور یونہی اثبات میں سر ہلایا۔ سجاول نے جھیمو سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ وہ گاؤں کے حکیم کی دوائی اسے کھلا رہی ہے۔ مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔

قصبہ یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ جہاں کوئی بہتر ڈاکٹر مل سکتا تھا۔ اس کے لئے کسی کا قصبے تک جانا ضروری تھا۔ سجاول ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ خود جائے یا باس کو بھیجے۔ کہ اچانک بابا غفلت میں پھر بڑبڑایا۔ وہ پھر وہی نام لے رہا تھا۔

''یہ قدیر کون ہے؟ تم جانتے ہو اسے۔'' باس نے پوچھا۔

سجاول نے لاعلمی ظاہر کرنے کو شانے اچکائے۔ وہ بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن جس انداز میں وہ اس کا نام لے رہا تھا۔ اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ قدیر اس کا بیٹا تھا یا کوئی قریبی عزیز۔ سجاول کو یہ بھی خیال آیا کہ کہیں وہ جھیمو کا باپ ہی نہ ہو۔

یہی جاننے کو اس نے جھیمو سے پوچھا۔

''یہ قدیر کون ہے؟''

''رب جانے۔'' اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

بوڑھا اب بھی وقفے وقفے سے اس کا نام لے رہا تھا۔ سجاول اس پر جھکا اور اس کا شانہ ہلا کر پھر ایک بار بولا۔

''بابا! میں آ گیا ہوں۔ تو فکر نہ کر۔ اب تو ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک۔''

بوڑھا اب قدرے ہوش میں آ رہا تھا۔ اس نے اپنا مرجھایا ہوا سا ہاتھ نقاہت سے اٹھا کر اس کے بازو پر رکھا اور ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''قدیر پترا۔ میرا دل کہتا تھا۔ تو ایک دن ضرور آئے گا۔ اپنے بڈھے پیو کا کلیجہ ٹھنڈا کرنے۔ مجھے پتہ تھا پتر کہ تو آ جائے گا۔ آخری وقت میرے منہ میں پانی ڈالنے۔ مجھے مٹی دینے۔ جس طرح ہڑ تجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ اسی طرح تو ہڑ کے ساتھ بہتا میرے پاس آ جائے گا۔''

اس کے ٹوٹے پھوٹے فقروں' اکھڑے ہوئے لفظوں اور ڈوبتے ہوئے لہجے سے سجاول کو قدیر کی کہانی بنانے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے سر اٹھا کر باس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اس جگہ نہیں تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا۔ وہ شاید اس ماحول سے اکتا گیا تھا۔ اور طاق میں رکھے ہوئے چراغ اور دوسری چیزوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہا تھا۔ سجاول کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بے حد بیزار ہو رہا ہے۔

بوڑھا وقفے وقفے سے اپنی بے ربط باتیں دوہرائے چلا جا رہا تھا۔ سجاول نے اس کا کمزور سا ہاتھ تھاما اور نرمی سے بولا۔

''بابا! تو فکر نہ کر اللہ نے چاہا۔ تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں شہر جا کر تیرے لئے دوائی لاتا ہوں۔ بس تو منٹوں میں بھلا چنگا ہو جائے گا۔''

''نہ...... نہ...... تو نہ جانا پتر۔ تو نہ جانا۔ اب مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔'' بوڑھے کی نقاہت آلود آواز اکھڑے ہوئے سانسوں کے، ساتھ پھر ڈوبنے ابھرنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے بابا۔تو گھبرا مت۔میں نہیں جاتا۔میرا دوست جا کر دوائی لے آئے گا۔" سجاول نے بوڑھے کو تسلی دی۔

بوڑھا تھک کر کچھ غافل ہوا۔تو سجاول اٹھ کر باس کے پاس آیا۔وہ کچھ الجھا ہوا سا ابھی تک طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی بتی بے خیالی میں کبھی اونچی اور کبھی نیچی کر رہا تھا۔

"یار! میرا خیال ہے۔مجھے قصبے تک جانا ہی پڑے گا۔بابے کی حالت ٹھیک نہیں۔" سجاول نے اسے مخاطب کیا۔

وہ کسی گہری سوچ سے چونکا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔"یار تم یہیں ٹھہرو۔میں ذرا قصبے سے بابے کے لئے دوائی لے آؤں۔نہیں تو بچارا یہیں پڑے پڑے مرجائے گا۔"

"ہوں۔" اس نے لمبی سی ہوں کی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ بڑے کرنسی نوٹ نکالے۔"یہ لو۔ڈاکٹر کو ساتھ لیتے آنا۔جتنے پیسے مانگے دے دینا۔"

سجاول کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔بوڑھے کی کسمپرسی نے باس کو بھی متاثر کیا تھا۔

"نہیں یار! تم پیسے رکھو۔میرے پاس ہیں۔ڈاکٹر تو یہاں آنے پر راضی نہیں ہوگا۔ اسے یہاں لانا ٹھیک بھی نہیں ہوگا۔میں اسے اچھی طرح حقیقت بتا کر دوائی لے آؤنگا۔"

"نہیں۔نہیں پکڑو۔جیب میں پیسے اچھے ہوتے ہیں۔" اس نے پیسے اس کی جیب میں ڈال دیئے۔

سجاول نے چلتے چلتے کہا۔"یار! میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔اگر تجھ سے ہو سکے۔تو اتنا کر دینا کہ جب تک میں نہیں آ جاتا۔تو بابے کے سامنے ذرا قدریا بنا رہنا۔بوڑھا آدمی ہے۔کیا پتہ اس کی کتنی زندگی باقی ہے۔ہمارا اتنا کر دینے سے وہ خوش ہو جائے گا۔تو ہمارا کیا جاتا ہے۔"

باس نے نہ ہاں کی نہ نہیں۔اور نیم رضامندی سے سر ہلا دیا۔

سجاول دوائی لے کر آیا۔تو ساتھ کھانا بھی لیتا آیا۔دوائی کھا کر بوڑھے کی حالت سنبھل گئی۔یا اس کے ذہن میں بیٹے سے مل جانے کا جو اطمینان بیٹھ گیا تھا۔اس نے اسے آسودہ کر دیا۔اس نے تھوڑا سا دودھ بھی پی لیا۔اور بار بار آنکھیں کھول کر باس کی طرف دیکھتا رہا۔

"واہ بھئی۔تم نے تو بابے کو خوب یقین دلایا ہے کہ تم قدریا ہو۔وہ بار بار تمہیں دیکھ کر اطمینان کر رہا ہے کہ کہیں تم چلے تو نہیں گئے۔" سجاول نے ہنس کر کہا۔

"اچھا ہے یار! اسی بہانے یہاں کچھ روز رہ تو لیں گے۔ویسے یہ جگہ ہے محفوظ۔ تھوڑے دن یہاں گزارے جا سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

بابے کی حالت سنبھل جانے پر چھیمو بہت خوش تھی۔اس کا سانولا چہرہ دمک اٹھا تھا اور وہ حسب عادت معصوم معصوم سی شوخ باتیں کرنے لگی تھی۔سجاول کا لایا ہوا کھانا۔چھیمو نے برتن میں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔دونوں نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔اس لیے بھوک خوب چمک اٹھی تھی۔چھیمو کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

ہاتھ پونچھ کر سجاول نے اس کی طرف دیکھا۔"تو یار قدریا! پھر تم یہیں ہونا۔"

"اور تم......؟" اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"میں ذرا شہر جاؤں گا۔ایک آدھ دن کیلئے۔تھوڑا کام ہے۔" سجاول نے جواب دیا۔

"نہ چاچا! نہ۔تو مت جانا۔" چھیمو جو غالباً ان کی باتیں سن رہی تھی۔اس نے اس کا دامن تھام لیا۔"مجھے ڈر لگتا ہے۔تو چلا گیا۔تو بابا پھر بیمار ہو جائے گا۔پھر میں کیا کروں گی اکیلی۔"

"یہ قدیر جو یہاں رہے گا تمہارے پاس۔ میں تیرا چاچا ہوں۔ تو یہ تیرا ماما ہے۔ پھر میں ایک دو دن میں واپس آ جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔ اب بابا بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر کبھی بیمار نہیں ہو گا۔" سجاول نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

چھیمو نے ایک نظر باس کی طرف دیکھا۔ پھر جھجک سی گئی۔ وہ ابھی اس سے بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔ باس نے قریب آ کر اس کے بالوں پر اوپرا سا ہاتھ پھیرا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ سجاول نے انہیں خدا حافظ کہا اور قبرستان سے باہر نکل آیا۔

⁂

وہ دلشاد کی حویلی پہنچا۔ تو اس کے باہر ایک بڑا ہجوم موجود تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی ایسی ویسی ہی بات تھی۔ اس نے کسی سے استفسار نہیں کیا اور سر جھکا کر ہجوم سے بچتا احاطے میں داخل ہوا۔ ایک جانب دلشاد کا ملازم کھڑا تھا۔ جو اسے پہچانتا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچا اور اسے متوجہ کیا۔

"کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟"

"تمہیں نہیں پتہ۔" وہ درشتی سے بولا۔

"نہیں۔" سجاول نے عاجزی سے کہا۔

"چودھری دلشاد قتل ہو گیا ہے۔" اس کی آواز رندھ سی گئی۔

سجاول بھی دھک سے رہ گیا۔ گہرے دکھ اور مایوسی نے اسے پژمردہ سا کر دیا۔ اسے افسوس سا ہونے لگا کہ اس نے دلشاد سے ملنے میں اتنی دیر کیوں کر دی تھی۔ نہ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتا تھا اور اس نے اسے کیوں بلایا تھا۔ یہ ایک ایسی الجھن تھی جو اب کبھی رفع نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے سارے منصوبے ایک مرتبہ پھر خاک میں مل گئے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید دلشاد اس کا پشت پناہ بن جائے۔ وہ اس کا آسرا لے کر اپنی بہن کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ رانی کو تڑپا تڑپا کر مارنے والے سے اس کی محرومیوں کا بدلہ لے لیتا۔ اور ملاں کے ہاتھ کاٹ سکتا۔ جس نے شہزادی جیسی نٹ کھٹ اور بھولی لڑکی کو بازار کی جنس بنا دیا تھا۔

دلشاد کے ملازم نے اسے گم سم دیکھ کر آگے بڑھ جانا چاہا۔ لیکن سجاول نے اسے روک لیا۔ "بات سن یار! قاتل کا کچھ پتہ چلا؟"

"قاتل کا پتہ چل جاتا تو۔" اس نے دانت کچکچا کر منہ میں گالی بکی۔

"کس پر شک ہے۔" سجاول نے پوچھا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور منہ بگاڑ کر بولا۔ "میں یہاں کھڑا ہو کر شک میں لوگوں کے نام لیتا پھرتا ہوں۔"

سجاول شرمندہ سا ہو گیا۔ اور کچھ آگے بڑھ آیا۔ وہ گرد و پیش متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ کوئی ایسی شناسا صورت نظر آئے۔ جس سے وہ کچھ معلومات حاصل کر سکے۔ لیکن خود لوگوں سے چھپ بھی رہا تھا کہ کسی کی نظروں میں نہ آ جائے۔

ہال نما کمرے میں اس نے جھانک کر دیکھا۔ اونچے شملے والی پگڑیوں، ٹوپیوں، بالوں سے بھرے ہوئے سروں اور چمکتے ہوئے گنجے سروں کے درمیان وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔

"یار! میت کدھر رکھی ہے؟"

"میت پولیس لے گئی ہے پوسٹ مارٹم کیلئے۔" اس نے اطلاع دی۔

سجاول ادھر ادھر گھومتا پھرا کہ شاید کوئی کام کی بات ہی معلوم ہو جائے۔ لیکن بے سود۔ لوگ آپس میں چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ جن سے اتنا ہی پتہ چل سکا تھا۔ کہ اس کی جیپ پر کسی دوسری گاڑی سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔ دلشاد تو موقعے پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے دو محافظ شدید زخمی تھے اور بیان دینے کے قابل نہیں تھے۔

وہ اس کی حویلی میں بلا موقع گھومتے گھومتے اکتا گیا تھا۔ دلشاد کے ساتھ اس کا کوئی جذباتی تعلق تو نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی موت نے اسے دھچکا لگایا تھا۔

پوسٹ مارٹم کے لئے گئی ہوئی لاش ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ کسی نے بتایا تھا کہ سرکاری ڈاکٹر قصبے سے باہر گیا ہوا ہے۔ رپورٹ کے لئے اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ پوسٹ مارٹم جلد نہ کرنے کی وجہ سے ہسپتال کے عملے اور دلشاد کے لواحقین میں ہاتھا پائی ہو گئی ہے۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ لوگوں کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ وہ لاش کے انتظار میں فارغ بیٹھے طرح طرح کی خیال آرائیاں کر رہے تھے۔

سجاول کبھی کسی کمرے میں ہوتا۔ کبھی دالان میں۔ اور کبھی وسیع صحن میں۔ لوگوں کے مختلف گروہوں کی آپس میں گفتگو سن کر گمشدہ کڑیاں ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران وہ برآمدے میں سے گزرا۔ تو اسے اچانک اپنا نام سنائی دیا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ آواز نسوانی تھی۔

اس نے فوراً پلٹ کر نہیں دیکھا۔ لیکن دل ہی دل میں حیران ضرور ہوا کہ یہاں کون اس کو جاننے والا ہے۔ پھر اس کا نام کسی نے لیا۔ تو سجاول نے گھوم کر دیکھا۔ برآمدے میں کوئی عورت سیاہ برقعے میں ملبوس کھڑی تھی۔ اس نے ریشمی نقاب کو اس طرح ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی سجاول نے اسے پہچان لیا۔

"نیلم!" سجاول نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اس کا نام دوہرایا۔ اور ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔

برآمدے میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ نیلم ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ سجاول بھی قریب آ گیا۔

"تم یہاں کہاں؟" اس نے کہا۔

سجاول نے جواب نہیں دیا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

"آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔" وہ پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

سجاول کچھ جھجکا۔ پھر وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ ایک دیہاتی طرز پر آراستہ بیٹھک تھی۔ جس میں ایک بڑا پلنگ' دو کرسیاں اور میز رکھا ہوا تھا۔

نیلم یونہی ایک کرسی کے بازو پر ٹک گئی اور افسردہ سے لہجے میں بولی۔ "دلشاد بیچارے کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔"

"ہاں۔" سجاول نے اس کے اداس چہرہ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھیں کچھ دیر پہلے بہہ جانے والے آنسوؤں کی خبر دیتی تھیں۔ ہلکی ہلکی سی سرخی ان کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھی۔

"تمہیں بہت افسوس ہوا ہے۔" سجاول نے اس کی غیر معمولی افسردگی کو محسوس کر کے کہا۔

"ہاں۔ افسوس کی بات تو ہے نا۔ بیچارہ اچھا آدمی تھا۔" وہ پژمردگی سے بولی۔

"کسی دن تمہیں میرے بارے میں بھی ایسی ہی خبر مل جائے گی۔ پتہ نہیں تم افسوس بھی کرو گی یا نہیں۔" نہ جانے کیوں سجاول نے بلا ارادہ ہی کہہ دیا۔

"خدا نہ کرے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"ایسی باتیں کیوں منہ سے نکالتے ہو۔ ابھی تو تم نے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"پتہ نہیں تقدیر اس کا موقع بھی دیتی ہے یا نہیں۔" سجاول نے مایوسی سے کہا۔

"سوچتا کچھ ہوں اور ہو کچھ جاتا ہے۔ سارے راستے بند ہی بند ملتے ہیں۔"

وہ چپ سی ہو گئی اور جیسے کسی بات کو دل ہی دل میں تولتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹ یوں لرزے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ لیکن کہہ نہ پاتی ہو۔ سجاول نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"بات تو کچھ نہیں۔" نیلم نے سٹپٹا کر سر جھٹکا۔ پھر گلا صاف کر کے بولی۔

"ہاں۔ میں نے تم سے پوچھنا تھا کہ اس روز بخت آور تمہیں کہاں ملی تھی؟"

"بخت آور! کون بخت آور۔" سجاول نے غائب دماغی سے کہا۔

"بھئی وہی لڑکی۔ جسے اس دن تم کوٹھے پر لے آئے تھے۔" نیلم نے یاد دلایا۔

"اچھا وہ۔ سجاول کو یاد آیا۔" اسی نے تو سارا کام بگاڑا۔ میں دلشاد سے ملنے یہاں آیا تھا۔ دلشاد نے خود پیغام بھیج کر بلایا تھا۔ وہ کہیں کام سے گیا تھا کہ یہ مجھے ٹکرا گئی۔ میں نے تو مصیبت زدہ سمجھ کر اس کی مدد کی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس قسم کی عورت ہے۔ بس اسی کی وجہ سے اتنا خوار ہوا۔ آج یہاں آیا ہوں۔ تو یہ خبر سنی ہے۔"

نیلم نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اور متاسف سی ہو کر بولی۔ "تم نے اس کو غلط سمجھا۔ وہ بچاری واقعی مصیبت زدہ ہے۔ قسمت کی ماری ہے۔ جتنا وہ کوٹھے سے بھاگتی ہے۔ اتنا ہی کوٹھا اس کے پیش آتا ہے۔"

"تو کہیں مر کھپ کیوں نہیں جاتی۔ جو یوں خوار ہوتی پھرتی ہے۔" سجاول نے حقارت سے کہا۔

نیلم تلملا گئی۔ "مرنا اتنا آسان نہیں۔ جتنا تم سمجھتے ہو۔ جتنے آرام سے تم کہہ دیتے ہو۔"

سجاول اس کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے اس کی کیا مجبوریاں تھیں۔ کیسے مسئلے تھے۔ وہ عورت تھی۔ اور اپنی طرح کی عورتوں کے مسئلے اور مجبوریاں جانتی تھی۔ اسی لئے اس نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے یونہی موضوع بدلنے کو کہا۔

"چلو جانے دو اس ذکر کو۔ کوئی اور بات کرو۔"

"اور کیا بات کروں۔" وہ ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر مایوسی سے کہنے لگی۔ "بس طبیعت کچھ اچاٹ سی ہو گئی ہے۔"

"دلشاد کی وجہ سے۔" سجاول نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کی وجہ تو نہیں۔" وہ یوں کہنے لگی جیسے خود بھی اپنے جذبات کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہو۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے۔ جس کی سمجھ نہیں آتی۔"

سجاول اس کے جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا اور کسرتی جسم والا ایک لمبا تڑنگا شخص پردہ کھسوٹ کر اندر داخل ہوا اور سرخ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ "اچھا۔ تو یہاں بیٹھی ہے اپنے یار کے ساتھ۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے۔ تو فکر نہ کر۔ میں نہ تجھے چھوڑوں گا۔ نہ تیرے اس یار کو۔"

نیلم گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بھونچکی سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سجاول کو لمحے بھر تو اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور اس سے اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف گھورتا ہوا مغلظات بکتا رہا۔ پھر اس نے یکدم دروازہ بند کر دیا۔ سجاول تیزی سے دروازہ کھولنے کیلئے آگے بڑھا۔ لیکن اس نے باہر سے کنڈی لگا دی۔

سجاول نے دروازہ دھکیلا۔ لیکن وہ مضبوطی سے بند تھا۔ اس نے پلٹ کر نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ سینے پہ ہاتھ رکھے سراسیمہ کھڑی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے سامنے آیا تھا کہ دونوں کو صورتحال سمجھنے اور اس پر یقین کرنے کو وقت چاہئے تھا۔

سجاول نے ماحول میں واپس آتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"یہ کون تھا پاگل کا بچہ۔ تم جانتی ہو اسے؟"

"ہاں۔ یہ دلشاد کا رشید ہے۔ مگر یہ تو اچھا بھلا تھا۔ اسے پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔" اس نے فق چہرے کے ساتھ جواب دیا۔

سجاول کو بھی صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ شخص کوئی جنونی معلوم ہوتا تھا۔ باہر کنڈی لگا کر وہ نہ جانے کیا کرنے والا تھا۔ اگر وہ پولیس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی ہانک گیا۔ تو بھی ان کے لئے مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔

"سجاول! اب کیا ہوگا؟" نیلم نے پریشانی سے کہا۔

سجاول نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "تم آرام سے بیٹھو۔ کچھ سوچنے سمجھنے دو۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے؟"

وہ حیران حیران سی چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گئی اور اضطرار میں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔

سجاول کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہاں یہ گزرے گی۔ وہ تنہا ہوتا تو اور بات تھی۔ لیکن اب اس کے ساتھ نیلم بھی تھی۔ جس کے بارے میں اکثر لوگوں کو علم تھا کہ وہ دلشاد کی منظور نظر تھی۔

"سجاول تم بھی آرام سے بیٹھ کر سوچو۔ اس طرح پریشانی میں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" نیلم نے اس کی بے چینی اور بیکلی کو محسوس کر لیا تھا۔

سجاول نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

سجاول نے بھی محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے سکون کی ضرورت ہے۔ وہ قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے اعصاب کا تناؤ دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میرا خیال ہے۔ ہمیں دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے۔ کوئی آتا جاتا۔ دروازہ کھول دے گا۔ دلشاد کے سارے ملازم مجھے پہچانتے ہیں۔" نیلم نے تجویز پیش کی۔

"پر میرا تمہارے ساتھ ہونا ٹھیک نہیں۔" سجاول نے کہا۔

"اس کو چھوڑو تم۔" وہ بے نیازی سے کہنے لگی۔ "میں کونسی کوئی خاندانی عورت ہوں۔ میرے ساتھ کسی کا ہونا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔"

"لیکن اب ہے۔ دلشاد قتل ہو چکا ہے۔ اور سب اس کے ساتھ تمہارے تعلق کو جانتے ہیں۔ پولیس تو پھر معمولی معمولی باتوں کو بھی نہیں چھوڑتی۔ تمہیں وہ کچھ کہے نہ کہے مجھے ضرور دھر لے گی۔ دلشاد کا رقیب سمجھ کر۔"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ سجاول میرے ہوتے تم پر آنچ بھی نہیں آ سکتی۔ وہ بے ساختہ کہنے لگی۔

سجاول نے غور سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں سچ کی نمی تھی۔ سجاول کو اس کا اس طرح کہنا اچھا لگا۔ لیکن حقیقت سے فرار ممکن نہیں تھا۔ اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں نیلم! یہاں تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ ان دولت والوں کے مقابلے میں عام لوگوں کی کون سنتا ہے۔"

نیلم اپنی جگہ سے اٹھی اور قدم قدم چلتی اس کے نزدیک آئی۔ اس نے اپنا ملائم گورا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھلا۔ دونوں نے بوکھلا کر

دیکھا۔

وہی شخص دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کے نقوش بگڑے ہوئے تھے اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ دانت پیس کر غرایا۔

"الو کی پٹھی! میں تجھے اور تیرے اس یار کو سیدھا کر دوں گا۔ تو کیا سمجھتی ہے کہ دلشاد کا کوئی نہیں۔"

سجاول تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ لیکن وہ فوراً ہی مغلظات بکتا ہوا دروازہ بند کر گیا۔ سجاول نے بجلی کی سی سرعت سے دروازے کو پورے زور سے دھکیلنا چاہا۔ لیکن وہ شخص اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے فوراً ہی چٹخنی چڑھا دی۔

سجاول اور نیلم نے ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ معاملے کی سنگینی سے قطع نظر انہیں ہنسی آ گئی۔ اس شخص کی یہ حرکت اتنی عجیب وغریب تھی کہ پہلا تاثر ہنسی کا ہی مرتب ہوتا تھا۔

"بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے۔ یہ تو۔" نیلم نے ہنستے ہنستے کہا۔

"ہاں پاگل تو ہے ہی۔ اور ساتھ ہمیں بھی پاگل بنا رہا ہے۔ اچھا اب آیا۔ تو اس کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔" سجاول نے کہا۔

"نہیں۔ اب اس کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک طرف پردے کی اوٹ میں ہو جاؤ۔ میں دروازہ کھٹکھٹاتی ہوں۔ کوئی تو دروازہ کھولے گا۔ اگر وہی ہوا۔ تو تم اچانک قابو کر لینا۔ اگر کوئی اور ہوا۔ تو میں ظاہر کروں گی کہ میں کمرے میں اکیلی ہوں اور کوئی غلطی سے دروازہ بند کر گیا ہے۔"

سجاول کو بھی اس کی یہ تجویز معقول معلوم ہوئی۔ نیلم نے دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے پھر پوری قوت سے کئی بار دستک دی۔

تھوڑی دیر بعد باہر سے چٹخنی کھلنے کی آواز سنائی دی۔ سجاول چوکنا ہو گیا۔ پھر دروازہ کھلا۔ نیلم نے قدرے تلخی سے کہا۔

"یہ کون دروازہ بند کر گیا ہے۔ پتہ نہیں میں یہاں بیٹھی ہوئی ہوں۔"

"خورے کون تھا؟" جواباً کسی نے کہا۔

پھر نیلم کی آواز سنائی دی۔ "بس تم جاؤ۔ میں نے دروازہ ہی کھلوانا تھا۔"

جاتے ہوئے قدموں کی صدا سنائی دی اور نیلم نے پلٹ کر اندر جھانکا اور سجاول کو

آنے کیلئے کہا اور خود دروازے سے باہر نکل گئی۔ سجاول نے چند لمحے انتظار کیا تا کہ نیلم چند قدم آگے بڑھ جائے تو وہ دروازے میں سے نکلے کہ اچانک اسے شور اور مغلظ گالیوں کی گردان سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی نیلم کی چیخ بھی شامل تھی۔

سجاول تیزی سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ اسی جنونی آدمی نے نیلم کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور دانت پیس پیس کر کہہ رہا تھا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو بچ نہیں سکتی میرے ہاتھ سے۔ کہاں ہے تیرا یار!!"

نیلم اس کے ہاتھوں میں کسی ننھی منی چڑیا کی طرح بے بس تھی۔ سجاول ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس پر جا پڑا۔ اور جھپٹ کر نیلم کو اس کے ہاتھوں سے آزاد کرا لیا۔ وہ شخص دیوانگی سے اس کی طرف لپکا۔ سجاول اس کے لئے تیار تھا۔ اس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر وہ دیوانگی میں کسی بھینسے کی طرح طاقتور ہو چکا تھا۔ وہ اندھی قوت میں پھر سجاول پر جھپٹا۔ لیکن وہ پھرتی کے ساتھ اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں دوسرے کمرے کے بھڑے ہوئے دروازے پر جا پڑا۔ اس کی چوٹ سے دروازہ کھل گیا اور وہ اندھادھند سیدھا اندر جا گرا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی سجاول نے بجلی کی سی سرعت سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

تب تک دلشاد کے دوسرے ملازم بھی آ گئے تھے۔ وہ شخص بری طرح سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔

"یہ رشید کو کیا ہو گیا ہے۔ بالکل ہی پاگل ہو رہا ہے۔ مجھے تو جان سے مارنے لگا تھا۔" نیلم نے اپنے بکھرے ہوئے بال ہاتھوں سے برابر کرتے ہوئے کہا۔

"بس آپا جی۔ صدمے سے بیچارے کا دماغ چل گیا ہے۔ بڑا افسوس ہے جی اس نے آپ کے ساتھ اتنی بدتمیزی کی۔" وہ معذرت کرنے لگا۔

وہ شخص اب اتنے زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا کہ اس کی چوکھٹ ہلنے لگی تھی۔

"اس کا کچھ کرو بھئی۔ نہیں تو یہ دروازہ توڑ دے گا۔" نیلم نے انہیں متوجہ کیا۔

"اچھا آپا جی! اب اس کو پکڑ دھکڑ کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اللہ ہی اپنا رحم کرے۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔ دلشاد کی لاش آئی تو مجھے اطلاع کرنا۔" نیلم نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپا جی۔ جیسی آپ کی مرضی۔" وہ بولا۔

سجاول ایک جانب لاتعلق سا کھڑا تھا۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ بھی نیلم کے ساتھ اس کمرے میں تھا۔ نیلم چلتے چلتے اس کے برابر ٹھہری اور ہولے سے بولی۔

''سجاول! تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔ فرصت ملے تو میری طرف آنا۔''

سجاول کچھ دیر اور دلشاد کی حویلی میں ٹھہرا۔ لیکن لاش آنے میں ابھی کافی دیر معلوم ہوتی تھی۔ لوگ بھی اکتانے لگے تھے۔ کچھ اٹھ کر جا بھی رہے تھے۔ سجاول بھی دلشاد کی حویلی سے باہر نکل آیا۔ ایک تندور پر بیٹھ کر اس نے کھانا کھایا۔ سگریٹ خریدے۔ پھر وقت گزاری کیلئے ادھر ادھر بلا مقصد گھومتا پھرا۔

معاً اسے خیال آیا کہ نیلم جاتے جاتے اسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دے گئی تھی۔ اس نے کوئی ضروری بات بتانے کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ لیکن سجاول کا یہی خیال تھا کہ وہ یونہی کہہ گئی تھی تاکہ وہ آئے بغیر نہ رہ سکے۔

اس نے سوچا کہ وہ نیلم کے یہاں کچھ وقت گزار سکتا ہے۔ تاکہ دلشاد کے بارے میں پتہ چلا سکے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کیس میں چودھری اور استانی نور کا کوئی ذکر آتا ہے یا نہیں۔

نیلم کے بالاخانے کی سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر پہنچا۔ تو بھدے جسم والی چنڈال نائیکہ سے سامنا ہو گیا۔ اس نے یونہی رواروی میں اسے سلام کر دیا۔ اس رعونت سے ایک نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی اور طنزیہ لہجے میں بولی۔

''اللہ کی شان ہے۔ اب ایسے ایسے لوگ بھی نیلم سے ملنے کیلئے آتے ہیں۔''

سجاول نے سر جھٹک کر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ بھلا اسے اس عورت کی پروا کیا تھی۔ جب نیلم جیسی لاکھوں دلوں کی دھڑکن کے دل میں اس کے نام کی دھڑکنیں تھیں۔ اس نے بے جھجک نیلم کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

نیلم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا اور مسکرا کر بولی۔ ''تم نے بہت دیر کر دی۔ خیریت تو تھی نا۔''

''ہاں۔ بس خیریت ہی ہے۔'' سجاول نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تھک گئے ہو شاید۔ کچھ دیر آرام کر لو۔'' وہ اپنے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' وہ ٹانگیں پسارتا ہوا بولا۔

''ایسا بھی کیا تکلف ہے۔ آ جاؤ نا۔''

''نہیں بھئی۔ مجھے اس قسم کے نرم بستروں پر سونے کی عادت نہیں ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''ہاں۔ تم مجھے وہ ضروری بات بتاؤ۔ جس کے لئے تم نے مجھے یہاں بلایا ہے۔''

''اچھا۔'' نیلم نے سر ہلایا۔ تو اس کے لمبے آویزے اس کے رخساروں سے چھونے لگے۔

''تو یہ بات ہے۔ اگر وہ ضروری بات نہ ہوتی۔ تو تم نہ آتے۔''

''شاید۔'' اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''آتا۔ یا ہو سکتا ہے نہ بھی آتا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

نیلم نے ایک آہ سی بھری۔ ''ہاں سجاول! تم کبھی کچھ نہیں کہتے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں انتظار سا رہتا ہے۔ یہ امید سی رہتی ہے کہ تم کبھی تو کوئی ایسی بات کہہ دو گے۔ جسے سننے کو میں جنم جنم سے ترس رہی ہوں۔''

سجاول ہنسا۔ ''بھئی نیلم۔ تم ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ جو مجھے سمجھ میں نہ آئیں۔''

نیلم نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی وقت دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور نائیکہ کی آواز سنائی دی۔

''نیلم! نیلم!!''

نیلم چونک گئی۔ سجاول بھی کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا۔

''نیلم!'' اس نے پھر پکارا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کیا ہے آپا؟'' نیلم نے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

''وہ موت جوگی بخت آور پھر بھاگ گئی۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''تم سے کس نے کہا؟'' نیلم نے پوچھا۔

''مہر عبدالحکیم کا بندہ آیا ہے۔ کہتا ہے وہ وہاں پہنچی ہی نہیں۔''

''چل۔ جاتی ہے تو جانے دے۔ آپ ہی پھر پھرا کر واپس آ جائے گی۔ جس طرح پہلے آئی تھی۔ تو خوامخواہ فکر میں نہ پڑ۔'' نیلم نے اتنا کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

سجاول کے کانوں میں دونوں کی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ بخت آور کے نام سے اسے یاد آیا کہ یہ وہی عورت تھی۔ جس نے اس سے پناہ مانگی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ لیے لیے

گھومتا رہا تھا۔

نیلم کچھ کھوئی کھوئی سی۔ کچھ پریشان سی کمرے میں آئی۔ اس کا حسین چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ سجاول نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان ہوگئی ہو۔"

"بس!" اس نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔

"سوچا کچھ تھا اور ہو کچھ گیا۔"

"کیا مطلب؟" سجاول نے پوچھا۔

"بس۔ اب کیا کہوں؟" وہ مایوسی سے سر ایک جانب جھکا کر بولی۔

"کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟"

"نہیں کچھ نہیں۔" اس نے ہونٹ چبائے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اذیت اسے اندر ہی اندر کچوکے دے رہی ہے۔ اس کی پلکیں نم سی ہو رہی تھیں۔

"آخر کوئی بات تو ہے۔ جو تم ایکدم اتنی پریشان ہوگئی ہو۔" سجاول نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

نیلم نے تھوڑا سا رخ پھیر لیا۔ شاید آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو چھپانے کیلئے۔ سجاول نے قدرے جھلا کر کہا۔

"اچھا۔ تم نہیں بتانا چاہتیں۔ تو نہ بتاؤ۔ مگر یہ تو بتا دو کہ تم نے مجھ سے کونسی ضروری بات کرنی تھی۔ تاکہ میں جاؤں۔"

"ضروری بات۔" نیلم نے غائب دماغی سے کہا۔ "ہاں ضروری بات۔ اچھا وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ تمہیں یہاں بلانے کو۔ ورنہ...... ورنہ بات تو کوئی نہیں تھی۔ ہاں بات تو کوئی نہیں۔"

سجاول کو صاف محسوس ہوا۔ جیسے کہ کچھ چھپا رہی ہے۔ لیکن وہ زیادہ اصرار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا موڈ یونہی خراب سا ہوگیا تھا۔ وہ بیزار سا ہو کر اٹھ گیا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔"

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور نائیکہ نے پکارا۔ "نیلم! نیلم! دروازہ تو کھولنا۔"

"ٹھہرو ذرا سجاول۔" نیلم نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے کو کہا اور خود دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

سجاول کا جی اچاٹ ہوگیا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ بیٹھا نہیں اور اس انتظار میں کھڑا رہا۔ کہ نیلم بات کرے تو وہ چلے۔

نیلم نے دروازہ کھول دیا تھا۔ نائیکہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا کھسر پھسر کر رہی تھی۔ پھر وہ واپس پلٹی اور سجاول سے بولی۔ "تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا۔ تھوڑی دیر کیلئے۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتی ہوں۔ دیکھو جانا مت۔ خدا کیلئے۔"

"کیا کرتی ہو نیلم!" سجاول جھنجھلایا۔

"میں نے یہاں بیٹھ تو نہیں رہنا۔"

"مت بیٹھنا۔ لیکن تھوڑی دیر تو رکو نا۔ جب تک میں نہ آجاؤں تم جانا مت۔" اس نے اصرار کیا۔ سجاول کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔

وہ جلدی آجانے کا کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

سجاول کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر بیزار ہو کر اٹھا۔ اور یونہی وقت گزارنے کو کمرے کے در و دیوار اور آرائش کو دیکھنے لگا۔ کمرہ نفاست سے سجا ہوا تھا۔ آرام دہ بستر۔ جدید انداز کی کرسیاں۔ عمدہ قیمتی قالین اور شش پہلو آئینے والا سنگھار کے سامان سے بھرا ہوا ڈریسنگ ٹیبل۔ اس کے پہلو دار آئینے میں سجاول کو اپنے کتنے ہی عکس نظر آرہے تھے۔

اس نے غیر ارادی طور پر آئینے میں سے جھانکتے ہوئے اپنے بہت سارے عکسوں کو دیکھا اور کچھ نادم سا ہوا۔ اس کے کپڑے میلے اور سلوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی بے ترتیب تھی اور بال بھی جمے ہوئے نہیں تھے۔ ان میں دھول کے ذرے جگہ جگہ اٹکے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔

یونہی اس کو نیلم کا خیال آگیا۔ وہ کتنی خوبصورت' کتنی اجلی' کتنی دلکش اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی۔ نہ جانے اس پر اتنی کیوں مہربان تھی۔ وہ اس کی تپتی ہوئی زندگی میں جیسے ہوا کے نرم جھونکے کی طرح سے تھی۔ لیکن وہ اس کی خنکی اور سبک رفتاری سے خود کو مانوس نہیں کر پاتا تھا۔ ایسی ہی کسی لطافت کو اپنے گرد و پیش پا کر وہ نہ جانے کیوں الجھ سا جاتا تھا۔ اس کے دکھ اس کی محرومیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی تھیں۔ اور وہ انہی میں کھویا ہوا کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں پاتا تھا۔

اس نے اکتا کر آئینے میں جھلکتے ہوئے اپنے ہی عکس سے نگاہیں چرا لیں۔ اور پھر آ

کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھکاوٹ کے احساس سے اس کا انگ انگ چور چور سا ہو رہا تھا۔ اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا اور تھوڑی دیر کیلئے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو بند کر لیا۔ اس کے تھکے ہوئے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے۔ اور اسے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔

اچانک اس کا شانہ کسی نے زور سے ہلایا۔ ''سجاول! سجاول! دیکھو۔ دیکھو۔ پولیس آ گئی ہے۔'' نیلم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ سجاول تیزی سے ہوشیار ہوا اور اس نے حیران نظروں سے نیلم کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟''

''باہر پولیس آ گئی ہے۔ وہ پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ انہوں نے میرا پتہ بھی پوچھا ہے۔ کہیں اس طرف آ گئے۔ تو خوامخواہ تمہارا بیان لیتے پھریں گے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''عجیب ہو تم بھی۔ پریشان کر کے رکھ دیا۔'' سجاول سر جھٹک کر اٹھا اور اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اپنے بال برابر کرنے کی کوشش کی۔

اپنی غیر معمولی بوکھلاہٹ پر نیلم شرمندہ سی ہو گئی۔ اور جلدی سے بولی۔ ''میں تمہاری وجہ سے گھبرا گئی تھی سجاول! ورنہ مجھے اپنی پروا تو نہیں ہے۔''

''وہ ہیں کس طرف؟'' سجاول نے پوچھا۔

نیلم نے کھڑکی کی چلمن میں سے باہر جھانکا۔ ''بازار کی طرف ہیں۔''

''یہاں پچھلی طرف باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں۔ ہے تو سہی۔'' نیلم نے تیزی سے کہا۔

''تم نے خوب یاد کرایا۔ پچھلی طرف سیڑھیاں ہیں۔ لیکن بہت خستہ ہیں۔ بہت عرصہ ہوا بند کی ہوئی ہیں۔ تم یہاں سے اترو۔ یہ چھت والی گلی میں کھلتی ہیں۔ دراصل گلی میں بھی نہیں۔ دو مکانوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ ہے۔ یہاں کے پرانے رہنے والے ہی اس راستے سے واقف ہیں۔ تم اس طرف سے نکل سکتے ہو۔ بڑی آسانی سے۔

''تو چلو پھر۔'' سجاول نے کہا۔

''آؤ'' نیلم جلدی جلدی اس کے ہمراہ چلی اور ایک اسٹور نما کمرے سے گزر کر اسے خستہ حال سیڑھیوں تک لے آئی۔

''اچھا بھئی خدا حافظ'' سجاول نے الوداعی کلمہ کہہ کر سیڑھیاں اتر جانی چاہیں۔ لیکن نیلم نے روک لیا۔

''سنو۔ اب پھر کب ملو گے؟'' اس نے بڑے ارمان سے پوچھا۔

''کہہ نہیں سکتا۔'' سجاول نے ابرو اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''کوئی وعدہ تو کرو نا سجاول۔ میں اسی کے سہارے وقت کاٹ لوں گی۔''

''فکر نہ کرو۔ زندگی ہوئی تو ملتے رہیں گے۔'' اس نے سیڑھیاں اترتے اترتے کہا اور پلٹ کر نہیں دیکھا۔

وہ بازار کی حدود سے بحفاظت نکل آیا۔ پہلے اس نے دلشاد کی حویلی جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ معاملہ پولیس کے ہاتھ آ چکا تھا۔ اسے خوامخواہ وہاں جا کر خود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ اس کے قتل کا الزام کس پر لگتا ہے۔ یہ تو جلد یا بدیر اسے پتہ چل ہی جانا تھا۔

یہی سوچ کر اس نے واپس جانے کا قصد کر لیا اور بس میں سوار ہو گیا۔ وہ قبرستان کے قریب پہنچا۔ تو شام گہری ہو رہی تھی۔ گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپی ہوئی گورکن کی کٹیا میں ابھی روشنی نہیں جلی تھی۔ سب کچھ اندھیرے میں ڈوبا ڈوبا سا نظر آتا تھا۔

وہ برآمدے کے ساتھ پڑے ہوئے پتھر پر سے پھلانگتا اندر داخل ہو گیا اور اس نے جھیمو کو آواز دی۔ اس کی آواز کا جواب نہیں آیا۔ اس نے برآمدے پر نگاہ ڈالی۔ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ لالٹین اپنی جگہ موجود تھی۔ لیکن بجھی ہوئی تھی۔ ایک طرف روٹیوں کا چھینکا اسی طرح لٹکا ہوا تھا۔ سجاول نے آگے بڑھ کر کمرے میں جھانکا۔ تاریک کمرہ بے آباد۔ چپ اور خاموش تاریکی سے بھرا ہوا تھا۔ سجاول کو تعجب ہوا۔ شام مغرب سے آگے بڑھ آئی تھی۔ جھیمو تو اس وقت قبرستان کی طرف نہیں جاتی تھی۔ پھر باس بھی تو یہیں تھا مگر ان سب میں سے کوئی ایک بھی نظر نہیں آتا تھا۔

''وہ سب کہاں جا سکتے تھے۔'' سجاول سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر لالٹین روشن کرنا چاہی۔ لیکن کچھ سوچ کر تیلی بجھا دی۔ اور بوڑھے کی کٹیا کے چاروں طرف چکر لگا کر دیکھا۔ مگر کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر ان سب کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔

وہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔ کہیں باس نے تو کوئی چکر نہیں چلایا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا کا باسی تھا۔ کیا خبر اس کی وجہ سے بوڑھا اور چھیمو کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوں۔ اس نے باس کو یہاں لا کر غلطی کی تھی، نہ جانے ان پر کیا گزری تھی۔

اس چھوٹی سی کٹیا کو ویران دیکھ کر اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ایک بار پھر بے سروسامان اور بے سائبان ہو گیا ہے۔ اس کی زندگی رشتوں سے پھر خالی ہو گئی ہے۔ وہ دل پر ایک بوجھ سا لیے اس بے آباد کٹیا سے باہر نکلا۔ اب اس کے لئے وہاں اور کیا رہ گیا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر ہو لیا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی آئندہ منزل کونسی ہو گی۔ وہ کہاں پناہ لے گا اور کس کے پاس جائے گا۔

اچانک اسے ایک آہٹ سنائی دی اور جھاڑیوں میں ایسی سرسراہٹ ہوئی جیسے کسی نے اوٹ لینے کی کوشش کی ہے۔ سجاول چوکنا ہو گیا۔ اس کا ذہن فوراً اس پراسرار رقبہ کی طرف گیا۔ جو مجرمانہ سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ کہیں یہ ان میں سے ہی کوئی نہ ہو۔ جو اسے دیکھ کر چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے قریبی درخت کے تنے کی آڑ لیتے ہوئے ایک تیز نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ چاروں طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ لیکن ایک جانب جھاڑیوں میں بہت خفیف سی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ یوں جیسے کوئی دبکا ہوا بیٹھا ہو۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ دور سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بے دریغ اس کے سامنے آ جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نہ جانے وہ دوست تھا یا دشمن۔

یہی سوچ کر سجاول نے جھاڑیوں کی مخالف سمت میں آہستگی اور احتیاط سے قدم قدم چلنا شروع کیا اور نسبتاً لمبا چکر کاٹتے ہوئے ان کے عقب میں جا پہنچا۔ اب اسے جھاڑیوں میں ایک دھندلا سا سایہ چھپا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سجاول نے ایک ثانیہ ضائع کئے بغیر اچانک جھپٹ کر اسے عقب سے دبوچ لیا۔ اسے ایک گھٹی گھٹی۔ ڈری ہوئی سی چیخ سنائی دی۔ جو نسوانی تھی۔ اس نے حیران ہو کر اسے فوراً ہی چھوڑ دیا۔ لیکن وہ ایک جانب لڑھک گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔

سجاول کو اتنی رات گئے۔ اس عورت کی قبرستان میں موجودگی نے پریشان بھی کر دیا۔

پھر اسے خیال آیا کہ شاید وہ کسی جادو ٹونے کے خاطر یہاں آئی ہو گی۔ ورنہ اس وقت تو قبرستان میں مرد بھی آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ چاند کی بہت ہلکی ہلکی سی روشنی میں سجاول نے دیکھا کہ وہ نسبتاً بھاری جسم کی کوئی عورت تھی۔ جس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ سجاول نے دو ایک بار اس کے گال زور زور سے تھپتھپائے۔ اس کے ہونٹوں سے بے ہنگم سی آوازیں نکلیں۔ اس کے سارے جسم نے ایک جھرجھری سی لی۔ اور وہ فوراً ہی اٹھ کر یوں بیٹھ گئی۔ جیسے خوفزدہ ہو۔ وہ سہمی سہمی سی آواز میں ہکلاتے ہوئے بولی۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھے کچھ مت کہنا۔ مجھے معاف کر دو۔" خوف سے اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔

سجاول کو اس پر بہت ترس آیا۔ نہ جانے وہ کس گھر کی عزت تھی اور اس پر کیا گزری تھی۔ سجاول نے تسلی دینے کو اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ملائمت سے بولا۔ "حوصلہ کر بہن! میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ میں تجھے کچھ نہیں کہتا۔ فکر نہ کر۔ حوصلہ رکھ۔" وہ حیرت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولی۔ "تو کون ہے ویرا!"

"بس۔ خدا کا بندہ سمجھ لے۔ لیکن تو بتا کہ تو کون ہے۔ اور یہاں اس قبرستان میں اکیلی کیا کر رہی ہے۔ وہ بھی رات کو۔ کہیں کوئی چلہ تو نہیں کاٹ رہی۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چادر سے منہ ڈھانپ کر بے ساختہ رو پڑی۔ سجاول نے خیال کیا کہ شاید اس کا کوئی عزیز فوت ہو گیا ہے اور وہ اس کی محبت میں اس طرف نکل آئی ہے۔

"کوئی مر گیا ہے تیرا؟" سجاول نے ہمدردی سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا اور اس کی ہچکیوں میں اور شدت آ گئی۔ سجاول نے اسے تسلی دی۔ "نہ رو بہن۔ مجھے بتا بات کیا ہے؟ مجھ سے جو کچھ بن پڑا۔ میں تیرے لئے کروں گا۔ تو بتا تو سہی کہ بات کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر اسی طرح ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔ سجاول نے اسے رونے دیا تا کہ اس کے دل کا غبار ہلکا ہو۔ اور وہ کوئی بات کرنے کے قابل ہو سکے۔ وہ روتی رہی۔ ہولے ہولے اس کی ہچکیوں کی شدت میں کمی آئی۔ اس نے اپنی چادر سے آنکھیں اور ناک صاف کی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"ویرا! میں تو قسمت کی ماری ہوں۔ مجھے تو موت بھی نہیں آتی۔ موت آ جائے۔ تو ایک بار چین تو آ جائے۔"

وہ ایک مرتبہ پھر رو پڑی۔ "ویرا! جب تقدیر ہی بیری ہو جائے۔ تو پھر کون اپنا بنتا ہے۔ میں یہاں اپنے بابے کے پاس آئی تھی۔ پر وہ پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ میں اسے ہی ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ وہ یہاں گورکن ہے۔ اس کے ساتھ میری بیٹی بھی ہے۔ ہائے میری چھیمو! پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے۔ بابا کہاں ہے؟"

سجاول کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ بوڑھے کی اغوا شدہ بیٹی ہے۔ نہ جانے وہ ان کے چنگل سے کیسے بچ کر نکل آئی تھی۔ اس نے اسے تسلی دینے کو کہا۔

"اچھا۔ تو ہے چھیمو کی ماں۔ پر تجھے تو کچھ لوگ اغواء کر کے لے گئے تھے۔ تم وہاں سے کیسے نکلی ہو۔"

"ہا۔ ہائے۔ تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟" وہ ہونٹوں میں اوڑھنی دبا کر بولی۔

"مجھے تیرے بابے نے ہی سارا کچھ بتایا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ کام شام کرا دیتا تھا۔ چھیمو تو مجھے چاچا کہتی ہے۔ بہت ہل گئی ہے میرے ساتھ۔"

"ہائے میں صدقے۔ میں واری۔ وہ ہے کہاں؟ کہاں ہے میری چھیمو! میری بیٹی!" وہ بے ساختہ کہتی چلی گئی۔

"اس سے بھی مل لینا۔ لیکن پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم وہاں سے نکلی کیسے۔ وہ لوگ تمہارے پیچھے تو نہیں؟ اگر انہوں نے تمہارا پیچھا کیا۔ تو سب سے پہلے یہیں آئیں گے۔" سجاول نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ کچھ کچھ دیکھا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ کوئی میرے پیچھے نہیں۔ وہ دونوں بے ہوش پڑے ہیں۔ انہیں اپنا پتہ نہیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے ان کے۔ نیلے پیلے ہو گئے تھے۔"

"کیوں؟ انہیں ہوا کیا تھا؟"

"روز ہی نشہ پانی کرتے تھے۔ پر آج پتہ نہیں کیا ہوا۔ بس پیتے گئے اور لیٹتے گئے۔ منٹوں میں نیلے کالے ہو گئے۔ صبر ڈالا اللہ نے میرا ان پر۔ میری آہ پڑ گئی کالے منہ والوں پر۔"

سجاول کو اس ویران مکان میں قید وہ بے بس عورت یاد آ گئی۔ یقیناً یہ وہی تھی۔ قدرت نے اس مظلوم عورت کی مظلومیت کا انتقام لے لیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میں تو وہاں سے جان بچا کر نکلی تھی کہ چھیمو کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کروں گی۔ پر یہاں تو دل میں اور آگ لگ گئی ہے۔" وہ اوڑھنی سے آنسو پونچھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔

"ویرا! اگر تجھے میرے بابے اور چھیمو کا کچھ پتہ ہے۔ تو مجھے ان سے ملا دے۔ میں ساری عمر تجھے دعائیں دوں گی۔ میری آنکھیں ترس گئی ہیں انہیں دیکھنے کیلئے۔"

"مجھے کچھ پتہ تو نہیں ہے۔ لیکن میں جلد انہیں تلاش کر لوں گا۔ تیرے بابے نے مجھے بھی بیٹا بنایا ہوا ہے۔ میں بھی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی وہ بہت پیارے ہیں۔"

"ہائے ویرا! تجھے اللہ کی قسم۔ انہیں کہیں سے ڈھونڈ نکال۔ مجھے میری چھیمو سے ملا دے۔ میرے بابے کا پتہ بتا دے۔ میں ساری عمر تیرے پیر دھو دھو کر پیوں گی۔" وہ سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

سجاول کو اس کے آنسوؤں اور سسکیوں نے کچھ اور رنجور کر دیا۔ وہ منہ سے اس کی تسلی کیلئے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ بس اس کے سر پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

وہ دل ہی دل میں بے حد پریشان ہو رہا تھا۔ بار بار روتی ہوئی بے سہارا عورت' قبرستان کی خاموشی اور پرہول فضا اور بوڑھے کی گمشدگی کا معمہ۔ سبھی کچھ چکرا دینے والا تھا۔ اور بظاہر اس کا کوئی حل ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس عورت کو تنہا اور بے سہارا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہاں ٹھہرنا بھی محال تھا۔ وہ عورت کو کہاں لے جا سکتا تھا۔ پھر اس نے اسی سے پوچھ لیا کہ کیا اس کے پاس کوئی ایسا ٹھکانہ ہے۔ جہاں وہ پناہ لے سکے۔

وہ کچھ پریشان سی ہو کر سوچ میں پڑ گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔

"ویرا! مجھے یاد آیا۔ یہاں چک اٹھانوے میں میری بچپن کی سہیلی رسولاں بیاہی ہوئی ہے۔ اگر تو مجھے وہاں پہنچا دے۔ تو میرا خیال ہے مجھے وہاں پناہ مل جائے گی۔"

سجاول نے اس کی بات پر غور کیا اور پوچھنے لگا۔ "اچھی طرح سوچ لیا ہے نا۔ یہ نہ ہو۔ وہاں جا کر خوار ہی ہونا پڑے۔ مصیبت کے وقت کوئی کسی کا نہیں بنتا۔"

"تو پھر اللہ مالک ہے۔" وہ اپنی اوڑھنی کو درست کرتے ہوئے بولی۔

"تو پھر چل۔ اللہ کا نام لے کر۔" سجاول نے قدم بڑھایا۔ اور اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ وہیں پر رکی کھڑی تھی۔

"چلونا۔ چلتی کیوں نہیں ہو؟" اس نے پوچھا۔

اس نے ایک سسکاری سی لی اور آنسوؤں میں بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔" اگر میرے پیچھے چھیمو اور بابا واپس آ گئے تو۔"

"تو فکر نہ کر۔ میں تجھے وہاں چھوڑ کر ان کا اتہ پتہ ہی معلوم کروں گا۔ مل گئے تو تمہیں آ کر لے جاؤں گا۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے۔" وہ منہ ہی منہ میں دعائیں دیتی اس کے ہمراہ چل پڑی۔

سجاول نے رخ پھیر کر کہا۔" اگر راستے میں کوئی پوچھے۔ تو کہہ دینا کہ تم میری بہن ہو اور میں تمہیں تمہارے سسرال چھوڑنے جا رہا ہوں۔ گھبرانا مت۔"

"اچھا ویرا!" اس نے چادر کی بکل کو گاڑھا کرتے ہوئے آہستگی سے کہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔

۞......۞......۞

چک اٹھانوے کی طرف رات کے اس پہر میں کوئی بس نہیں جاتی تھی۔ گاؤں تک ابھی پکی سڑک نہیں بنی تھی۔ دن کے وقت بھی بس چک سے بہت دور رکتی تھی۔ چک تک کا راستہ اونچے نیچے غیر ہموار راستوں پر سے پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔

سجاول کے لئے یہ صورتحال بہت پریشان کن تھی۔ رات کی تاریکی میں جب زمینداروں کے خونخوار پالتو کتے سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک اجنبی عورت کے ساتھ پیدل سفر کرنا کارے دارد تھا۔ چھیمو کی ماں بھی رات کی تاریکی اور پیدل سفر کی مشقت سے گھبرا رہی تھی۔ اس کا سانس بھی پھول رہا تھا۔

اچانک سجاول کو دور سے ایک ہلکی سی' دھندلی روشنی نظر آئی۔ جو مسلسل حرکت میں تھی۔ سجاول کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ اس نے قدموں کو کچھ تیز کر دیا۔ اور چھیمو کی ماں سے بولا۔" ذرا تیز چلو۔ شاید کسی سواری کا انتظام ہو جائے۔"

چھیمو کی ماں نے بھی اپنی رفتار بڑھائی۔ لیکن سجاول اس سے کہیں آگے تھا اور اسے ایک بیل گاڑی کا دھندلا سا ہیولا بھی نظر آنے لگا تھا۔ اس امید نے ان کے قدموں کو اور تیز کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ بیل گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

سجاول نے دیکھا کہ اس میں خالی ٹوکرے اوندھے پڑے ہوئے تھے اور گاڑی بان۔ غالباً سو رہا تھا۔ بیل آپ سے آپ ایک سیدھ میں چلے جا رہے تھے۔ سجاول اس کے برابر آ گیا اور گاڑی بان کو ایک دو آوازیں دی۔

شاید بیل گاڑی والے کے دماغ کا کوئی حصہ بیدار تھا کہ وہ فوراً ہی جاگ اٹھا اور اس نے آنکھیں مل کر سجاول کی طرف دیکھا۔ لیکن نہ ہی گھبرایا۔ نہ بدحواس ہوا۔ اور بڑے اطمینان سے بولا۔" کیا بات ہے یار!؟"

"ہم نے چک اٹھانوے تک جانا ہے۔ اگر تم اس طرف جا رہے ہو۔ تو ہمیں بھی

لے چلو۔ کچھ تھوڑی بہت خدمت بھی کر دیں گے اپنی حیثیت کے مطابق۔"

"ہوں۔" اس نے لمبی سی ہوں کی اور گردن بڑھا کر جھیمو کی طرف دیکھا اور کڑے لہجے میں بولا۔ "یار۔ کوئی اور چکر تو نہیں ہے۔"

"دھیان سے بات کر یار! میری بہن میرے ساتھ ہے۔ میں اس کو اس کے سسرال چھوڑنے جا رہا ہوں۔" سجاول نے اسے ٹوکا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اور بیلوں کی باگ کھینچ کر انہیں روک لیا۔ اور بولا۔ "چل آ یار! میں تمہیں چک اٹھانوے اتار دوں گا۔ میں اسی طرف سے ہو کر جاؤں گا۔"

"تیری بڑی مہربانی۔" سجاول نے گرمجوشی سے کہا اور چھلانگ لگا کر بیل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ دوسری طرف سے اس نے جھیمو کی ماں کو ہاتھ پکڑ کر اوپر چڑھا لیا۔ وہ پچھلی جانب سمٹ کر بیٹھ گئی۔

بیل گاڑی والے نے بیلوں کو ہانکا اور گاڑی سست رفتاری سے رینگنے لگی۔ سجاول خاموشی سے بیٹھ گیا اور گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن سے گزرنے لگے۔ اس نے ناہموار سڑک پر نگاہ ڈالی۔ اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ سوچنے لگا کہ وقت کی گردش نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ وہ کیا سوچ کر نکلا تھا اور کس طرف چلا آیا تھا۔

بیل خاموش تھے۔ گاڑی کے پہیوں سے نکلنے والی مسلسل آواز سے ایک تاری بندھ گئی تھی۔ ناہموار سڑک سے بار بار ہچکولے لگ رہے تھے۔ گاڑی بان نے خاموشی کے وقفے کو توڑا۔

"کیا نام ہے یار! تیرا۔"

سجاول چونک سا گیا۔ اور اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں اسے اپنا نام بتایا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بس یار! کوئی مستقل ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ روزی روزگاری کا چکر کبھی کہیں لے جاتا ہے، کبھی کہیں۔" سجاول نے گول مول سی بات کی۔

"ہاں یار! رزق کیلئے ہی تو یہ ساری بھاگ دوڑ ہے۔" وہ بولا اور اس نے بتایا کہ اس کا نام نیاز محمد ہے۔ لیکن سب جگہ وہ کاکا لوہار کے نام سے معروف تھا۔ حالانکہ اس نے اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ اور بیل گاڑی پر سامان وغیرہ ڈھونے کا کام کرتا تھا۔

وہ خوش مزاج اور باتونی تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور ایک سجاول کو دے دیا۔ اس

نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اس کے بوڑھے باپ کو زمیندار نے کسی غلطی کی پاداش میں گاؤں سے نکال دیا تھا۔ وہ اسی غم میں گھل گھل کر مر گیا تھا۔ اس کی اپنی نو بیاہتا بیوی اغواء ہو گئی تھی۔ جس کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے بہتیرے عرضی پرچے کیلئے تھانے کے چکر لگائے۔ لیکن بات نہیں بنی۔

وہ عجیب لاابالی اور کھلنڈری طبیعت کا تھا۔ اس نے دل پر بات نہیں لگائی تھی۔ اپنے حال میں مست اور مطمئن تھا۔ ان واقعات کا تذکرہ اس نے یوں کیا تھا۔ جیسے کسی اور کا حال کہہ رہا ہو۔ سجاول کو اس کی بے نیازی اور لاتعلقی نے حیران کیا۔ اس نے اچنبھے سے سوال کیا۔

"یار! تمہیں اپنی بیوی کا کچھ خیال نہیں۔ پتہ نہیں بچاری کس حال میں ہوگی۔"

"بہترا خیال کر کے دیکھ لیا سجناں! پر ہم غریب لوگ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ الٹا اپنی جان ہی گنوائیں گے۔ تو پھر کیا فائدہ۔ نہ حاصل نہ وصول۔"

"کمال ہے۔" سجاول نے حیرت سے بے ساختہ کہا۔ "تمہیں پروا ہی نہیں۔"

کاکے لوہار نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "گل سن میرے بادشاہ۔ اس دنیا میں ساری عمر تو نہیں بیٹھ رہنا۔ کبھی نہ کبھی تو آگے جانا ہے۔ ہم نے بھی اور ان زمینداروں اور چودھریوں نے بھی۔ بس وہیں پہ فیصلہ کر لیں گے۔ اپنے رب سوہنے کے سامنے۔ بس میں نے تو اپنے مقدمے کا فیصلہ اس اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو اسے منظور۔ ہمیں بھی منظور۔ جو اس کی رضا۔ ہمارے سر آنکھوں پر۔ پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اپنے فیصلے کرتا پھروں۔ جب وہ بڑا فیصلہ کرنے والا موجود ہے۔"

سجاول کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے سارے وجود پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اسے اپنے مقابل بیٹھا ہوا وہ شخص کوئی پہنچا ہوا بزرگ معلوم ہوا۔ جس نے اپنے مالک کو پہچان لیا تھا اور انصاف کے لئے اس سے لو لگا رکھی تھی۔ اور ایک وہ تھا۔ سارے ہی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتا تھا۔ سارے فیصلے خود ہی کر لینا چاہتا تھا۔ وہ ندامت سے عرق عرق ہو گیا۔ اسے اپنا آپ بڑا ہی حقیر معلوم ہوا۔ وہ تو اب اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ اس بڑے انصاف کرنے والے کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھ سکے۔

"او پاء جی! کن سوچوں میں پڑے ہو۔" کاکے لوہار نے خوش طبعی سے کہا تو سجاول کو اس کی آواز جیسے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر اس کی طرف

دیکھا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ تاریکی میں دمک رہا تھا۔ اس کے ہنستے ہوئے سفید دانتوں کی لڑی موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ ''نیند آ گئی ہے۔ تو سگریٹ بجھا دو''۔ وہ ہنسا۔

سجاول نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سگریٹ کی طرف دیکھا۔ اس کے شعلے کی حدت اس کی انگلیوں تک پہنچنے والی تھی۔ اس نے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی اور اوپر تلے دو تین کش لئے۔

''سو گئے تھے تم یار!'' باتونی کاکا لوہار چپ نہیں رہ سکا۔

''ہم نے کیا سونا ہے یار! ہمارے حصے کا ہماری تقدیر جو سو لیتی ہے۔'' سجاول نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

وہ محظوظ ہوا۔ ''یار! تقدیر سو کر یہ حشر کرتی ہے۔ جاگ جائے تو پتہ نہیں کیا ہو۔''

سجاول کا دل ہنسنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں ابھی تک وہی ندامت کھول رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاکا لوہار کتنا آسودہ، مطمئن اور سرشار تھا۔ اسی لئے دل کھول کر ہنس لیتا تھا۔ اس کی ہنسی اصلی اور جاندار تھی۔ اور ایک وہ تھا کہ اس کے اپنے وحشیانہ جذبے اسے دوڑائے لئے جاتے تھے۔ اس نے اپنے فیصلے خود ہی کر لینا چاہے تھے۔ اسی لئے اس کے پاس پچھتاؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کا جی چاہا کہ اس ستاروں بھرے آسمان تلے سر جھکا کر اپنی ساری کوتاہیوں کا اعتراف کرے۔ اپنی سرکشی پر ندامت کا اظہار کرے اور دامن پھیلا کر اپنے لئے کوئی سزا مانگے۔ تاکہ اس کی ندامت کچھ تو زائل ہو۔

''شاید تمہیں نیند آ رہی ہے۔'' کاکے لوہار نے پھر اسے مخاطب کر لیا۔

''نہیں نیند تو نہیں آ رہی۔'' سجاول نے پژمردگی سے کہا۔ ''دراصل میں سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یار! کہ قسمت نے تمہارے ساتھ بھی سب کچھ کیا۔ مگر تم کتنے مطمئن اور خوش باش ہو یار! تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم ان لوگوں سے انتقام لو۔ جنہوں نے تمہارے ساتھ زیادتیاں کیں۔ تمہیں اکیلا کر دیا۔ تمہارے باپ کو قبر میں اتار دیا۔ کاکے یار! تمہارے دل میں انتقام کی آگ نہیں بھڑکتی۔''

''ہاں یار! ہمارے دل میں بھی بڑی آگ لگی تھی۔ بڑے طوفان اٹھے تھے۔ میں تو اپنی درانتی لے کر ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ پر میرے ابے نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں اس کا ایک ہی ایک بیٹا تو تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''کہ تجھے پتہ ہے کہ جاگیرداروں کا ساتھ دینے والے کتنے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اس کا ایک گاؤں نہیں۔ اس کے کتنے ہی گاؤں ہیں۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''اور تیرا ساتھ دینے والا کون ہے۔''

میں نے سوچا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ تو میرے منہ سے اپنے آپ ہی نکل گیا۔ ''میرا ساتھ دینے والا تو اللہ ہے۔ صرف اللہ۔'' میرے ابے نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

''جھلیا۔ اگر تیرا ساتھ دینے والا اللہ ہے۔ تو پھر سب کچھ اسی پر چھوڑ دے۔ تو اس کی ذمہ داری اپنے سر کیوں لیتا ہے۔''

اس نے جیسے ہی یہ لفظ منہ سے نکالے۔ میرے قدم وہیں جم کے جمے رہ گئے اور درانتی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ اس کی بات میں نے اپنے دل میں آپ اترتی ہوئی دیکھی۔ میرے اندر سے نفرت اور انتقام کا جوش اس طرح نچڑ گیا۔ جیسے سانپ میں سے زہر نکال لیتے ہیں۔ مجھے اپنے ابے کے لفظوں پر اتنا اعتبار آیا کہ پھر کبھی یہ بات میرے دل سے نکلی ہی نہیں کہ میرا فیصلہ وہ اوپر والا کرے گا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور سینے پہ ہاتھ رکھ کر خم ہوتے ہوئے تعظیم دی اور بے نیازی سے کہنے لگا۔ ''اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ وہ مالک ہے۔ وہ خالق ہے۔ وہ آپ ہماری فکر کرے گا۔ ہم بندے جو ہوئے اس کے۔''

سجاول حیرت سے ساکت ہو گیا۔ وہ جو ایک طویل عرصہ خارزاروں میں پاپیادہ چلتا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ اور اس کے مقابل بیٹھا ہوا یہ شخص ایک لمحے میں کتنی ہی منزلیں طے کر گیا تھا۔ اس نے رشک آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم مقدر والے ہو یار! تمہیں اللہ نے روشنی دے دی ہے۔''

''احسان ہے اس کا۔ کرم ہے اس کا۔'' وہ ایک جذب کے سے عالم میں بولا۔ تو سجاول کے دل میں یہ تمنا بڑی شدت سے مچلی کہ اس کے یقین کا تھوڑا سا حصہ اسے بھی مل جائے۔ تو اس کی زندگی سنور جائے۔ اس کا جی چاہا کہ اس شخص کو اپنا مرشد مان کر ساری زندگی اس کے قدموں میں گزار دے۔ شاید اس کی بدولت ہی اسے بھی وہ سکون اور طمانیت میسر آ جائے جس کی کاکے لوہار کے پاس فراوانی تھی۔

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ کاکے لوہار نے پکار کر کہا۔ ''لو بھئی۔ آ گیا تمہارا چلہ۔ اٹھا نوے۔'' اس نے بیل گاڑی ایک اور کچے راستے پر ڈال دیا۔

"بس یار! اب آگے سے ہم چلے جائیں گے۔" سجاول نے لحاظ میں کہا۔

"آدمی رات آگے۔ آدمی رات پیچھے۔ اس طرح تمہیں راستے میں تو نہیں چھوڑ سکتا نا۔ پورا پہنچا کر آؤں گا۔ آخر تمہاری بہن ساتھ ہے۔" وہ بولا۔

"مہربانی تیری یار! تو تو ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا ہے۔" سجاول نے متشکر لہجے میں کہا اور پلٹ کر جھیمو کی ماں کی طرف دیکھا۔

وہ گھٹنوں پر سر رکھے گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ شاید سوگئی تھی۔ سجاول نے اسے پکارا۔ لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئی۔ اس نے آگے ہو کر اس کی چادر کا پلو کھینچا۔ تو وہ یکدم چونک کر اٹھی اور حواس باختہ سی ہو کر ڈری ڈری سی اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سجاول نے اسے مخاطب کیا۔

"چک اٹھانوے کے راستے پر چڑھ گئے ہیں۔ ذرا ہوشیار رہنا۔"

جھیمو کی ماں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن محسوس ہوتا تھا ابھی نیند میں ہے۔

"گھر کا پتہ یاد ہے نا تمہیں۔" سجاول نے اس سے پوچھا۔

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"یار! تم اچھے بھائی ہو۔ بہن کی سسرال کا پتہ تمہیں معلوم نہیں؟ عورت ذات سے کہہ رہے ہو۔ کمال ہے۔" کاکا لوہار دخل دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ایسی ہی بات ہے یار!" سجاول کو اس بے ضرر انسان کو پوری بات بتا دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔

"یہ میری سگی بہن نہیں ہے۔ مصیبت زدہ ہے۔ پہلے بیوہ ہوئی۔ پھر ظالموں کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہاں سے جان بچا کر نکلی تو باپ اور بیٹی کا کچھ پتہ نہیں۔ میں نے اس کو بہن کہا ہے۔ تو نبھاؤں گا بھی۔ اس کو سہیلی کے گھر چھوڑ کر اس کے باپ اور بیٹی کا کچھ پتہ چلاؤں گا۔"

"واہ مولا واہ۔ تیری قدرت کے بھی رنگ نیارے ہیں۔ صدقے جاؤں تیری بے نیازی کے۔ سبحان اللہ۔" وہ خود کلامی کی سی کیفیت میں بولا۔

سجاول نے اس کی یہ خود کلامی سنی۔ تو اس کے دل کی کیفیت عجیب ہوگئی۔ ایک تحیر کی لہر اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی۔ یہ کاکے لوہار نے بات کو کس انداز میں کہا تھا۔ اس نے اظہار افسوس کیا تھا۔ تو کس طرح راضی بہ رضا ہو کر۔ اس کے لفظوں میں کوئی گلہ' کوئی شکوہ' کوئی احتجاج نہیں تھا۔ اس کی یہ بات کتنی عجیب' حیرت ناک اور دل میں اتر جانے والی تھی۔ سجاول کی آنکھیں نم سی ہوگئیں۔ اور آنسو آپ سے آپ اس کے دل پر گرنے لگے۔ وہ اندر

ہی اندر پگھلتا رہا۔ گھلتا اور پانی ہو ہو کر بہتا رہا۔

کاکا لوہار دھیمے سروں میں گنگنانے لگا۔ الف اللہ تے چنبے دی بوٹی

مرشد من وچ لائی ہو!!!

رات کے سناٹے کو اس کی مدھم اور پرسوز لے نے جیسے رنگ سے لگا دیئے۔ اس کے ایک ایک لفظ نے من کو اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا۔ سجاول کے دل کی کیفیت عجیب اور ناقابل فہم ہوگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ یہاں بیٹھے بیٹھے ہی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ سبھی کچھ بدل گیا ہے۔ وہ بھی اور اس کے اردگرد کی دنیا میں۔ اس کے ذہن سے جیسے سب کچھ دھلتا جا رہا تھا۔ اور کاکے لوہار کی آواز کی گونج نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ نہ جانے کب اس نے گنگنانا ختم کر دیا۔ مگر وہ اس کی آواز کے سحر سے باہر نہیں آسکا۔ وہ اسی طرح گم سم بیٹھا رہا۔ اور اس کا رواں رواں اس کی تال پر جھومتا رہا۔

"یار! تو کن میٹھے غموں میں پڑا ہوا ہے۔" وہ خاصی دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ تو کاکے لوہار نے اسے مخاطب کیا۔

سجاول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہنس کر بولا۔ "وہ دیکھ سامنے چک اٹھانوے ہے۔"

سجاول نے نگاہ اٹھائی۔ دور اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کچے گھروں میں کہیں کہیں تہجد گزاروں نے چراغ روشن کر لیے تھے۔ مرغوں کی اذانیں سنائی دینے لگی تھیں۔ سجاول نے جھیموں کی ماں کو پکارا۔

"کیوں بھئی اب تمہیں اس کے گھر کا پتہ چل جائے گا نا۔"

"ہاں۔ ہاں ویرا کیوں نہیں۔ میں ایک بار اپنے گھر والے بہشتی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔" وہ بیل گاڑی کا جنگلا تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اردگرد دیکھنے لگی۔

کسان ہل اور بیل لے کر نکل رہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کر کے اس کے گھر کا پتہ پوچھا اور چل دیئے۔ سجاول کو اس کی بہت فکر تھی کہ معلوم نہیں وہ لوگ کیسے ہوں اور یوں اکیلی عورت کو اپنے گھر رکھنے پر تیار ہوں گے یا نہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ کہ جھیمو کی ماں کی سہیلی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان دونوں کو بھی ناشتہ کروا کر روانہ ہونے دیا۔ اس نے چلتے چلتے جھیمو کی ماں کو تسلی دے دی کہ اسے جیسے ہی بابے اور جھیمو

کے بارے میں کچھ علم ہوگا۔ وہ اسے فوراً خبر کردے گا۔

جب وہ کاکے لوہار کے ساتھ چلنے کے لئے نکلا۔ تو آسمان پر طلوع کا منظر سنہرے رنگوں سے نمودار ہو رہا تھا۔ کھیتوں کی طرف سے آتی ہوئی ہوا میں مٹی کی خوشبو اور سرسوں کا ذائقہ تھا۔ صبح کے نکھرے ہوئے مناظر نے انہیں تازہ دم کردیا تھا۔ کاکا لوہار بڑی شگفتہ باتیں کر رہا تھا اور بڑے میٹھے سر لگا رہا تھا۔ اپنے گاؤں کی پگڈنڈی پر بیل گاڑی کو ہانکتے ہوئے وہ بولا۔

''یار! آج تو میرے ساتھ ہی چل۔ ساری رات کا جگراتہ ہے۔ کچھ دیر آرام کر لے۔ میں کل سامان لے کر قصبے کی طرف جاؤں گا۔ تم بھی ساتھ چلے چلنا۔''

سجاول یونہی سوچنے لگا کہ اس کو کہاں جانا ہے؟ اس کا کون سا ٹھکانہ ہے؟ اس کو کہاں جانے کی جلدی ہے؟ کون اس کے انتظار میں ہے؟

''کس سوچ میں پڑ گئے ہو یار!؟'' کاکے نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں یار! سوچنا کیا ہے۔ تم اتنی محبت سے اپنے یہاں چلنے کو کہہ رہے ہو۔ تو میں کیسے انکار کرسکتا ہوں۔''

''تو بس پھر ٹھیک ہے۔'' اس نے خوش طبعی سے کہا اور بیلوں کی رسیاں جھٹک کر انہیں تیز کرتا ہوا بولا۔ ''چلو بھئی۔ چلو۔ چاچے تاج نے تمہیں بھی خوب دانہ پٹھا کھلایا ہے۔ اب ذرا دوڑ کر بھی دکھاؤ۔''

O......O......O

کاکے لوہار کا گھر کیا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا ایک کچا کمرہ تھا اور لمبے چوڑے صحن میں گھاس پھوس کا چھپر سا ڈال کر اس نے بیلوں کیلئے ناند بنا رکھی تھی۔ اس چھوٹے سے کچے گھر میں سجاول کو اس گھر کی دھندلی سی تصویر نظر آنے لگی۔ جس کو ماں کے محبت بھرے ہاتھ سنوارتے تھے اور جہاں وہ اپنا بچپن چھوڑ آیا تھا۔

کاکے لوہار نے بیلوں کو باندھا۔ ان کے سامنے چارہ رکھا اور اپنے اکلوتے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''یار! تم تو شہری بندے ہو۔ تمہیں یہ کچا گھر تو بہت عجیب لگ رہا ہوگا۔''

''میں اتنا شہری بھی نہیں ہوں۔ جتنا تم سمجھ رہے ہو۔'' سجاول نے ہنس کر جواب دیا۔ میں بھی ایسے ہی کچے گھر میں پلا بڑھا ہوں۔ بلکہ اس گھر کو دیکھ کر تو مجھے اپنا گھر یاد آنے لگا

ہے۔''

''یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے یار! اسے اپنا ہی سمجھو۔ اس کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' وہ خلوص سے بولا۔

دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ جس کی کل کائنات دو چارپائیاں' صندوق اور کچھ کچے پکے برتن تھے۔ کاکے نے اسے چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود اس سے پوچھنے لگا کہ اسے پانی یا کسی اور شے کی خواہش ہے تو وہ اس کا انتظام کردے۔

سجاول کو کسی شے کی خواہش نہیں تھی۔ اس گھر کی چھت تلے بیٹھا تھا۔ تو بوجھل من کو قرار سا آ گیا تھا۔ رات کی کھوئی ہوئی نیند آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔ وہ پاؤں سے جوتے اتار کر چارپائی پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

''بس یار! ابھی تو صرف سوؤں گا۔ اٹھ کر دیکھیں گے کہ کس چیز کی ضرورت ہے۔''

''چنگا بھئی۔ جیسی تمہاری مرضی۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ کوئی تردد نہ کرنا۔'' کاکے نے بھی سر پر سے میلا صافہ اتارا اور دوسری چارپائی پر دراز ہوگیا۔

''یار! نیند تو مجھے بھی زوروں کی آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر آرام ہی کر لیتے ہیں۔ پر تو خراٹے ذرا آہستہ لینا۔ نہیں تو میری نیند کھل جائے گی۔''

اس کے شگفتہ انداز پر سجاول کو ہنسی آ گئی۔ کاکے نے بھی ہنستے ہوئے کروٹ بدل لی۔

جلد ہی دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ اور نہ جانے کتنی دیر دونوں ہی سوئے رہے۔ جب سجاول ہوشیار ہوا۔ تو آنگن میں بھری ہوئی چمکیلی دھوپ کمرے کی دہلیز پھلانگ کر ان کے چارپائیوں سے چھو رہی تھی۔ سجاول نے کاکے کی طرف دیکھا۔ اس کے بے ہنگم خراٹوں کی آواز سن کر اسے ہنسی آ گئی۔ وہ کچھ دیر یونہی چارپائی پر چت پڑا۔ سرکنڈوں اور نرسلوں سے بنی ہوئی چھت کو گھورتا رہا۔

اسی وقت باہر سے کسی نے پکارا۔ ''لوہار پائیا! لوہار پائیا۔!''

آواز نسوانی تھی۔ سجاول نے کاکے لوہار کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح بے خبر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ پکارنے والی کوئی جواب نہ پا کر خود ہی واپس چلی جائے۔ لیکن کچھ ہی دیر میں اس کی آواز کچھ اور صاف سنائی دی۔ یوں جیسے قریب سے آ رہی ہو۔

''پائیا لوہار! پائیا لوہار!! سنتا کیوں نہیں۔ میں تیرے پیو کی نوکر نہیں۔ جو یہاں دھوپ

میں کھڑی رہوں۔"

اس کی آواز نے بھی کاکے کی نیند میں کوئی خلل نہیں ڈالا۔ سجاول کو اٹھنا ہی پڑا اور جوتے پہنتا ہوا دروازے تک آیا۔

"ہا۔ ہائے۔!!" وہ اسے دیکھتے ہی ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر دو تین قدم پیچھے ہٹی۔

چھینٹ کا گھیردار فراک اور رنگین موتیوں اور سیپیوں کے بہت سے زیور پہنے ہوئے ایک خانہ بدوش لڑکی اس کے روبرو تھی۔ سنہری بالوں کو اس نے رنگ برنگی پراندوں کے ساتھ دو چوٹیوں میں گوندھ رکھا تھا۔ گھنگھریالے بالوں کے چھلے اس کی پیشانی پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کے رنگ برنگی انگوٹھیوں میں سجے ہوئے ہاتھ نے اس کا آدھا چہرہ چھپا لیا تھا۔ اس کی بے حد خوبصورت سبز آنکھیں اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ مٹی سے اٹے ہوئے ننگے پاؤں وہ جلتی زمین پر کبھی رکھتی اور کبھی اٹھاتی تھی۔

سجاول نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "کاکا تو سویا ہوا ہے۔"

"اونہہ۔ اس کے سرہانے تو ڈھول بھی بجاؤ۔ تو اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔ دھوپ میں کھڑا رہنے کے سبب اس کی دلکش سبز آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

سجاول نے دروازے سے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔ دھوپ میں نہ کھڑی رہو۔"

"نہیں۔ میں کیوں آؤں۔" اس نے شانے اچکائے اور جانے کیلئے پلٹی۔ تو اس کا پھولدار فراک لہرا کر ایک پھول سا بن گیا۔

"ٹھہرو۔ میں کاکے کو جگا دیتا ہوں۔" اس نے پلٹ کر جواب دیا اور اپنے زیور چھنکاتی ہوئی صحن پار کر گئی۔

وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ تو سجاول پلٹا۔ تو کاکا لوہار ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اس کے بے ہنگم خراٹے سارے کمرے میں تیرتے پھرتے تھے۔ اس کے چہرے پر آسودگی اور اطمینان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ سجاول کو اس پر رشک آنے لگا۔ وہ کتنا مطمئن تھا۔ اور وہ کتنا بیکل اور بے چین۔

وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا اور ان گنت سوچوں کی گلیوں میں راستہ تلاش کرنے کی

کوشش کرتا رہا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بے چینی نے اسے بیٹھنے نہیں دیا اور وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مختصر سے کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلتے ہوئے وہ بے خیالی میں کاکے لوہار کی چارپائی کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔ اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے زور سے چارپائی ساری کی ساری ہل گئی۔ کاکا لوہار ہڑبڑا کر کلمہ پڑھتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" سجاول کو اس کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔

"بھونچال آ گیا تھا شاید۔"

"خواب میں کیا سچ مچ؟"

کاکے لوہار نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور اسے ہنستے ہوئے دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے پھر تکیے پر سر رکھ دیا اور بولا۔

"کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ مجھے یونہی تو نہیں لگا کہ بھونچال آیا ہے۔"

"ہاں۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔" سجاول نے کہا۔

"کیا؟"

"ایک لڑکی آئی تھی۔ تیرا پوچھ رہی تھی۔" سجاول نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"لڑکی!!" اس نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر بولا۔

"اچھا۔ وہی ہو گی چڑیل لہر۔ خانہ بدوشوں کی لڑکی ہے۔ دودھ، مکھن، گھی وغیرہ بیچتی ہے۔ میرا پتہ کرنے آئی ہو گی۔ میں آج دو دن بعد آیا ہوں نا۔"

"اچھا۔ تیرا بڑا پتہ رکھتی ہے وہ۔" سجاول نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

"اف نہیں یار۔ وہ میرے لئے بہنوں جیسی ہے۔ اسی اعتبار پر تو یہاں گھر آ جاتی ہے۔ ورنہ کسی کے گھر کے اندر قدم نہیں رکھتی۔" وہ پھر اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"یار! چاچے تاج نے جو ناشتہ کھلایا تھا۔ وہ تو ہضم ہو گیا۔ اب تو بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"

سجاول نے بھی سر ہلایا۔ "ہاں یار! کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہو جائے تو اچھا ہے۔"

کاکا اٹھ کر تندور سے روٹیاں اور دال لے آیا۔ دونوں کھانا کھا کر ایک بار پھر بستر پر

دراز ہو گئے۔ کاکا لوہار کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں اس کے خراٹوں نے سارا کمرہ سر پر اٹھا لیا۔

سجاول کو کچھ اس کے خراٹوں کے شور اور کچھ اپنی پریشانیوں نے سونے نہیں دیا۔ وہ اپنی ہی لاحاصل سوچوں میں الجھا نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا کہ ایک بار پھر اسی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''پائیا! پائیا لوہار!'' سریلی گھنٹیوں ایسی آواز سن کر اس نے کاکے کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ نیند میں بے سدھ پڑا تھا۔ تب تک پائیا لوہار کی سریلی صداؤں میں غصہ اور تاؤ جھلکنے لگا تھا۔ سجاول نے جلدی سے اٹھ کر باہر جھانکا۔

دوپہر ڈھل گئی تھی اور سفید چمکیلی دھوپ پیچھے ہٹتی ہٹتی صحن کی آخری دیوار سے جا لگی تھی۔ لہر اپنی تمام تر شادابیوں کے ساتھ تیوری چڑھائے کھڑی تھی۔ زمین پر دودھ کا برتن رکھا تھا۔

''تمہارا پائیا! تو سو رہا ہے۔'' سجاول نے اسے اطلاع دی۔

''کیا مصیبت ہے؟'' وہ غصے سے بڑبڑائی اور اس نے اپنے پاؤں زمین پر زور سے پٹخے۔

''جگا دے اس کو جا کر۔ جب دیکھو سویا ہوا ہے۔'' اس نے جیسے حکم دیا۔

''چل رہنے دے۔ اسے کیا جگانا۔ میں دودھ کا برتن لا دیتا ہوں۔ تو دودھ ڈال دے۔'' سجاول نے ادھر ادھر کسی برتن کی تلاش میں دیکھا۔

وہ دودھ کے برتن کے برابر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور پیمانے سے ناپ کر دودھ اس کے برتن میں ڈالنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی جنبش سے اس کی کلائیوں کی چوڑیاں بجنے لگیں۔

''نی بلائے!'' دروازے میں سے کاکے لوہار کی آواز سنائی دی۔

لہر نے سر اٹھا کر دیکھا۔'' جا۔ دو گھڑی اور سو لے پائیا! تو ابھی سے کیوں اٹھ گیا ہے۔''

''تیری آواز سن کر اٹھا ہوں۔ میں نے کہا تیرا حال چال پوچھ لوں۔ تیرا دادا تو ٹھیک ہے نا۔'' کاکا قریب چلا آیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ تجھے پوچھ رہا تھا۔ پائیا! تو نے اتنے دن کہاں لگا دیئے۔'' وہ چہکی۔

''تیری سسرال گیا تھا۔ وہ آنے ہی نہیں دیتے تھے۔'' کاکے نے شرارت سے کہا۔

اس کے رخساروں پر گلابی رنگ پھوٹا۔'' جا پائیا! میں نہیں تجھ سے بولتی۔''

''اچھا۔ نہیں بولتی۔ میں تیرے دادے سے شکایت لگاؤں گا۔'' کاکے نے آنکھیں نکال کر کہا۔ تو وہ ہنس پڑی۔ پھر دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ کون ہے پائیا؟''

''میرا یار ہے۔'' کاکے نے جواب دیا۔

''کچھ دن یہیں میرے پاس رہے گا۔ تو گھبرا مت شریف آدمی ہے؟''

''اچھا!!!'' اس نے کچھ ناپسندیدگی سے کہا اور دودھ کا برتن اٹھا کر جانے لگی۔ چند قدم چلی۔ پھر پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور کاکے سے بولی۔

''پائیا! ڈیرے پر آنا۔ دادا تیرا پوچھتا تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی طویل صحن پار کر گئی۔

''یار! یہ خانہ بدوشوں کی لڑکی ہے۔ اس کے ماں باپ کسی دشمنی میں قتل ہو گئے تھے۔ اس کو اس کے دادا نے پالا ہے۔ اچھے شریف لوگ ہیں۔ عام خانہ بدوشوں کی طرح چورا چکے نہیں۔ کسی روز چلنا تجھے ملواؤں گا ان سے۔ دادا بہت چاہتا ہے اس کو۔ ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا اس نے۔''

سجاول نے منہ سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

کاکے نے خالی ڈول اور بالٹی اٹھائی۔'' میں ذرا پانی لے آؤں تو منہ ہاتھ دھو لیتے ہیں۔ اگر نہانا ہے تو نہر پہ چلے چلتے ہیں۔ پھر رات کو ڈرامہ دیکھنے چلیں گے۔ نیا تھیٹر آیا ہے یہاں۔ ہیر رانجھے کا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ ہیر تو سمجھو اصلی ہیر لگتی ہے۔ بھئی غضب کا کام کرتی ہے۔ بڑی مشکلوں سے ٹکٹ ملتا ہے۔''

''چل یار! میں تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ نہا لوں گا۔ سارے دن کی گرد سر پہ پڑی ہے۔'' سجاول بھی اٹھ کر اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

گاؤں سے باہر کھلے میدان میں ڈرامے کے لئے پنڈال لگا ہوا تھا۔ ایک طرف ٹکٹ لینے والوں کا ہجوم تھا۔ کاکے لوہار نے اسے اس طرف متوجہ کیا۔

"دیکھا یار! پہلے دن سے ہی یہاں اتنا رش ہے۔ لوگوں کا تو دیکھ دیکھ کر دل نہیں بھرتا۔ میں نے آپ پانچ دفعہ یہ ڈرامہ دیکھا ہے۔ تم یہاں ٹھہرو میں ٹکٹ لے آؤں۔"

اس قدر ہجوم کے باوجود وہ جلد ٹکٹ لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ٹکٹ بیچنے والے سے اس نے جان پہچان بنا رکھی ہے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پنڈال کو ایک جانب سے کھول دیا گیا اور گھنٹی بجنے لگی۔ کاکے لوہار نے اس کا بازو پکڑا اور تیز تیز چلتا ہوا بولا۔

"چل آ جلدی کر یار نہیں تو سامنے کی سیٹیں بھر جائیں گی۔"

پنڈال میں داخل ہوتے ہی اسٹیج پر نگاہ پڑتی تھی۔ جو بڑی میزیں جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ لوگ دھکم پیل کرتے اندر آ رہے تھے۔ جلد ہی سارا پنڈال بھر گیا تو من چلے آوازیں لگانے لگے کہ جلد پردہ اٹھایا جائے۔

پردہ ہولے ہولے سرکا اور اسٹیج پر سکھیوں کے جھرمٹ میں پھول کی طرح کھلی ہوئی ہیر نظر آئی۔ کاکے لوہار نے سجاول کو کہنی ماری۔ "یہ درمیان نصیبہ ہے۔ عنابی سوٹ والی۔ دیکھو ذرا۔ کیا لاجواب شے بنائی ہے اللہ نے۔"

سجاول نے عنابی دوپٹے میں گھرے ہوئے دلکش چہرے کو دیکھا۔ وہ سکھیوں کے ساتھ مل کر ایک شوخ سا گیت گا رہی تھی۔ تماشائی اس کی ایک ایک ادا پر جیسے دل تھام لیتے تھے۔ وہ اٹھکیلیاں کرتی۔ مورنی کی سی چال چلتی۔ جب گھوم جاتی تو اس کی گھٹنوں کو چھوتی ہوئی لمبی چوٹی لہرانے لگتی۔ تماشائیوں کے دل ان کی پرشوق نگاہوں میں دھڑکنے لگتے۔

وہ لمحے بھر کو کانپ سا گیا۔ اس کا چہرہ دیکھا ہوا سا کیوں لگتا تھا۔ اس خیال نے اسے

بے چین کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ وہ کون تھی۔ اور وہ اسے کس طرح جانتا تھا۔ کہیں۔؟ کہیں۔ وہ بھاگ بھری تو نہیں؟؟

اس خیال نے اسے چکرا دیا۔ اس نے سر جھٹک کر پھر غور سے دیکھا۔ اس نے اس کے دلربا چہرے کو دیکھا۔ جو میک اپ سے رنگین تھا۔ اس کی متوالی آنکھوں کو دیکھا۔ جو کاجل سے سجی ہوئی تھیں۔ اس کے لپ اسٹک سے گلنار تراشیدہ لبوں کو دیکھا۔ اس کی ساری یادیں گڈمڈ سی ہو گئیں۔ بھاگ بھری کا شرمیلا چہرہ جس کا دھندلا سا عکس اس کی یادوں میں کہیں جاگتا تھا۔ کبھی تو اس کے چہرے سے ملنے لگتا اور کبھی اس سے بالکل مختلف نظر آتا۔

"ہائے۔ غضب!" کاکے لوہار نے محظوظ ہو کر سجاول کو متوجہ کرنے کے لئے اس کا زانو دبایا۔ مگر سجاول تو نہ اس کی دلکش اداؤں کو دیکھ رہا تھا۔ نہ اس کے دلربا نغموں کو سن رہا تھا۔ وہ تو اس کے چہرے کو، اس کے سراپے کو، اس کے پیکر کو، شوخ میک اپ اور متوالی اداؤں سے علیحدہ کر کے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ بار بار اسے اس دھندلے عکس کے ساتھ ملا کر دیکھتا تھا۔ جو اس کی یادداشت میں کہیں محفوظ تھا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ کوئی ایسی مماثلت نہیں ملتی تھی۔ جو خون کا رشتہ بن کر اسے پکارے۔ جو یقین بن کر اسے یقین دلا دے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں۔ وہ چہرہ دیکھا ہوا سا لگتا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک نام چکرایا۔ اس نے پھر غور سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے دماغ سے جیسے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ "بخت آور!!"

اس کے ذہن کی الجھن تو دور ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بات نے اسے مطمئن کیا ہے یا ایک بار پھر الجھا دیا ہے۔ بار بار یہ خیال اس کے ذہن میں آتا تھا کہ اگر یہ لڑکی بخت آور کے بجائے اس کی بہن بھاگ بھری ہوتی تو وہ کیا کرتا؟ اس کے دل کی کیا حالت ہوتی۔ وہ کیا کچھ نہ کر گزرتا۔ اس کی یہ تلاش اور تگ و دو تو پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی۔ پھر نہ اسے کوئی خوف رہتا۔ نہ وہ اس طرح سرگرداں رہتا۔ وہ اپنے خاندان کی عزت کو دنیا کی دستبرد سے بچا کر ہمیشہ کیلئے آسودہ ہو جاتا۔ خواہ اس کے لئے اسے پھانسی کے پھندے کو ہی گلے لگانا پڑتا۔

وہ اپنے ہی سلگتے خیالوں میں جلتا رہا اور ڈرامہ ختم بھی ہو گیا۔ وہ پنڈال سے نکل کر گھر

آئے۔ تو بھی کاکا لوہار ڈرامے کی باتیں ہی کرتا رہا۔ سجاول کو اس تذکرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یونہی بس ہوں ہاں کرتا رہا۔

"پایا! او پایا۔!!!" ننھے جیسی سریلی صدا نے انہیں صبح ہی صبح آواز دی۔ سجاول نے آنکھ کھول کر کاکے لوہار کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں مست پڑا تھا۔ سجاول اپنے بال برابر کرتا ہوا اٹھا۔ تب تک اس نے دو تین مرتبہ اور پکار لیا۔

سجاول نے اٹھ کر باہر صحن میں جھانکا۔ لہر دودھ کا برتن زمین پر رکھے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کا فراک اور اوڑھنی۔ دونوں ہی خوش رنگ اور صاف ستھرے تھے۔ اس کا چہرہ کھلا کھلا اور تروتازہ تھا۔ سجاول کو صبح ہی صبح بہار کا یہ رنگ دیکھنا اچھا معلوم ہوا۔

لہر نے اسے دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ سجاول دو ہی قدموں میں اس کے قریب آ گیا اور اسے چھیڑنے کو بولا۔ "تو کیا منہ اٹھائے کھڑی ہے۔ صبح صبح سلام کر لے تو تیرا کیا چلا جائے گا۔"

"جا نہیں کرتی سلام۔ تو میرا کیا لگتا ہے جو تجھے سلام کروں؟" وہ تڑخ کر بولی۔

سجاول کو ہنسی آ گئی۔ "تیرا مسلمان بھائی نہیں ہوں میں۔"

اس کی سبز خوبصورت آنکھیں ذرا سا مسکرائیں اور وہ بات بدلنے کو بولی۔

"پایا لوہار کدھر ہے۔"

"خراٹے لے رہا ہے۔" سجاول نے بتایا۔

"آئے ہائے۔" اس نے ناک بھوں چڑھائی۔ "اتنا دن چڑھ آیا ہے اور ابھی اس کے خراٹے ہی ختم نہیں ہوئے۔"

"اے بلا۔ تو یہ صبح صبح کیوں میرے خراٹوں کو نظر لگا رہی ہے۔" کاکے لوہار کی آواز دروازے میں سے سنائی دی۔ وہ جمائیاں لیتا اسی طرف آ رہا تھا۔

"اب نہیں آؤں گی۔ تیرے خراٹے گننے۔ تجھے نظر لگانے۔ سمجھا تو۔" وہ منہ پھلا کر دودھ کا برتن اٹھانے کیلئے جھکی۔

"جا... جا... جاتی ہے تو چلی جا۔ پھر بعد میں نہ کہنا کہ دادے سے شکایت کیوں لگائی تھی۔" کاکا لوہار ہنس کر اسے چھیڑنے لگا۔

وہ بھی ہنس پڑی۔ "لا برتن دودھ ڈال دوں۔ تیرا کیا بھروسہ۔ تو دادے سے شکایت

لگانے ہی چل پڑے۔"

"اب سیدھی ہوئی ہے نا۔" وہ اندر سے برتن لے آیا۔ لہر نے اس کے برتن میں دودھ ڈالا اور چلتے چلتے کہنے لگی۔ "پایا! دادا کہتا تھا۔ جب شہر جائے گا۔ تو تھوڑا سامان اس کا بھی لے جانا۔"

"جا۔ جا۔ میں تیرے دادے کا نوکر نہیں ہوں۔ جو اس کا سامان ڈھوتا پھروں۔" کاکے لوہار نے منہ بگاڑ کر اسے پھر چڑایا۔

وہ ناراض نہیں ہوئی اور مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ "اچھا۔ اسی طرح کہہ دوں دادے سے جا کر۔"

"جا کہہ دے۔ میں کوئی ڈرتا ہوں تیرے دادے سے۔" وہ کچھ کچھ روٹھی۔

"او جھلیئے۔ تو کہیں سچ مچ ہی میری شکایت لگانے نہ بیٹھ جانا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "دادے سے کہہ دینا۔ میں کل یا پرسوں آ کر سامان لے جاؤں گا۔"

"اچھا!!" وہ لہراتی ہوئی پلٹی اور دودھ کا برتن ہاتھ میں جھلاتی۔ اپنے زیور چھنکاتی باہر نکل گئی۔

ناشتہ وغیرہ کر کے کاکے نے اس کے اور اپنے کپڑے دھو کر پھیلائے اور اس سے بولا۔

"یار! یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ جب تک دل چاہے یہاں رہ۔"

سجاول نے اس کی اس غیر متوقع بات پر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ بولا۔

"یار! دل کو پریشانیاں نہ لگا۔ خوش خوش رہ اور اللہ پر سب کچھ چھوڑ دے۔"

کاکے کی بات اس کے دل کو لگی۔ ابھی اس کے سامنے کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے کوئی فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے اس نے یہی طے کیا کہ اسے کچھ عرصہ کاکے کے ساتھ ہی گزار لینا چاہیے۔ یہ اس کے لئے اچھا ٹھکانہ تھا۔ وہ گاؤں گاؤں پھرتا۔ وہ اس کے ساتھ مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر جھیمو اور بوڑھے گورکن کو بھی تلاش کر سکتا تھا۔ شاید کہیں اس کا گوہر مقصود بھی ہاتھ آ جائے۔

وہ کاکے کے پاس رہ کر مفت کی روٹیاں نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ

سامان لانے لے جانے میں اس کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ اور سارا دن دونوں نے یہی کچھ کیا۔ وہ مختلف جگہوں سے لوگوں کا سامان اکٹھا کرتے رہے۔ اور اسے اچھی طرح باندھ کر رکھ لیا۔ کاکا سرِشام ہی کھانا لے آیا۔ پھر جلدی سونے کے لئے لیٹ گیا۔

خلاف معمول وہ بہت سویرے اٹھا۔ اس نے سجاول کو بھی جگا دیا۔ دونوں نے مسجد میں نماز پڑھی۔ دودھ گرم کر کے پیا اور بیل گاڑی پر سامان لاد کر دونوں روانہ ہوئے۔ تو ہلکا ہلکا سا گلابی نور سورج کی آمد کا اعلان بن کر مشرق کی سمت بکھر رہا تھا۔ ہوا خنک اور خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ بیل تازہ دم تھے۔ اور اٹکھیلیاں کرتے ہوئے معمول سے زیادہ تیز چل رہے تھے۔

دونوں طرف لہلہاتا ہوا سبزہ اور صبح کے طلوع کا منظر اتنا دلکش اور چھا جانے والا تھا کہ سجاول صبح کے ان جلوؤں میں کھو کر کچھ دیر کیلئے اپنے سارے غم' اپنے سارے دکھ وقتی طور پر بھول گیا۔ کاکے لوہار نے بیل گاڑی کا رخ گاؤں سے باہر جانے والی پگڈنڈی کے بجائے ایک اور تنگ سے راستے پر موڑ دیا۔

"یار! اب کس طرف جا رہے ہو؟" سجاول نے اسے یاد دلایا۔

"بھئی اس شودین لہر کے دادے کا سامان بھی تو ڈھونا ہے۔ ادھر سے اس کا سامان اٹھائیں گے اور دوسری طرف سے نکل کر پھر شہر کے راستے پر۔"

"اچھا۔ وہ لوگ اس طرف رہتے ہیں۔" سجاول نے پوچھا۔

"ان خانہ بدوشوں کا کیا ہے۔ انہیں تو جہاں تھوڑی سی جگہ نظر آتی ہے۔ یہ گھر بنا لیتے ہیں۔ اس طرف زمین کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے بستی بسا لی۔ کسی نے اٹھا دیا۔ تو یہ سامان اٹھائیں گے اور کہیں اور ڈیرے جا لگائیں گے۔"

سجاول نے سر ہلایا۔" ہم سے تو یہی لوگ اچھے ہیں۔ نہ گھر بناتے ہیں۔ نہ اس کے دکھڑے سہتے ہیں۔"

"تو بھی بھولا بادشاہ ہے۔" کاکا ہنسا۔

"جہاں بوریا بسترا ڈال دیں وہی گھر بن جاتا ہے اور گھر کے ساتھ اس کے دکھ سکھ لگے ہی ہوئے ہیں۔"

"ہوں۔" سجاول نے لمبی سی ہوں کی اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر نگاہ ڈالی۔ سبزے کا رنگ آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اتر رہا تھا۔ ہوا میں بسی ہوئی خوشبو پژمردہ روح کو تازگی سی عطا کر رہی تھی۔ رات کی نسبت سجاول کا ذہن کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ کاکا لوہار بھی موج

میں تھا اور سیٹی پر کوئی شوخ سی لے اپنائے ہوئے تھا۔ بیل گاڑی کی مخصوص آواز اس کے ساتھ ساتھ تال دے رہی تھی۔ سجاول لہلہاتے ہوئے سبز اور سنہری کھیتوں کو نظر بھر کر دیکھ رہا تھا کہ وہ چونک سا پڑا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک نام پھسلا۔

"چھیمو۔!!"

اس نے پھر جیسے اپنے آپ سے کہا۔"چھیمو!!!" اور بیلوں کی رسی کھینچ لی۔

"یار کاکے۔ ٹھہرنا۔ ذرا روکنا۔"

"کیا بات ہے یار!؟" کاکے نے بیلوں کو روکنے کی مخصوص آواز نکالتے ہوئے ان کی رسی کھینچ لی۔

جیسے ہی بیلوں کی رفتار سست ہوئی۔ سجاول چھلانگ مار کر اترا اور کھیتوں کے درمیان میں سے گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر دوڑتا ہوا پکارا۔

"چھیمو! او چھیمو! او چھیمو۔!!!"

کچے راستے پر دوڑتی بھاگتی۔ چھوٹی سی لڑکی رکی اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹھٹکی اور اس کی طرف دوڑی۔ سجاول لمبے لمبے ڈگ بھرتا اسے آدھے راستے میں ملا۔ وہ خوشی سے چاچا! چاچا! کہتی ہوئی اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ سجاول نے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اسے ہوا میں اچھالا۔ اور محبت آمیز خفگی سے بولا۔" مرجانی۔ تو کہاں چلی گئی تھی اپنے چاچے کو چھوڑ کر۔"

وہ کھل کھل ہنسنے لگی۔" چاچا! چاچا! ہمیں ماما قدیر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ اب بابا بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ آرام کرے۔ اسے کوئی ضرورت نہیں قبریں کھودنے کی۔"

"اچھا۔ تیرا ماما آ گیا ہے۔ کب؟" سجاول نے حیرت سے پوچھا۔ اسے اس عجیب اتفاق پر ایک شادمان سی مسرت ہوئی کہ چھیمو کی ماں اور اس کا بھائی دونوں بوڑھے کے پاس لوٹ آئے تھے۔

"چاچا! بھول گیا ہے۔ تیرے ساتھ ہی تو آیا تھا ماما قدیر۔ تجھے یاد نہیں۔ تو ہی تو اس کو لایا تھا۔" چھیمو نے بھولپن سے کہا۔

سجاول پر حقیقت حال واضح ہو گئی۔ گویا باس ابھی تک بوڑھے کے گمشدہ بیٹے کا کردار نبھا رہا تھا۔ اور انہیں یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہی قدیر ہے۔

"تیرا بابا تو ٹھیک ہے نا۔" سجاول نے پوچھا۔

"ہاں چاچا! وہ بالکل ٹھیک ہو گیا اور بڑا خوش ہے۔ ماما قدیر جو آ گیا ہے۔" اس نے خوشی سے اطلاع دی۔

"واہ بھئی۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اچھا بتا تو سہی کہ تم لوگ کہاں رہتے ہو۔ یہیں کہیں نزدیک ہی۔"

"کیا معاملہ ہے بھئی؟" کاکا لوہار بھی ان کے برابر آ پہنچا۔

سجاول نے اسے بتایا کہ یہی وہ لڑکی چھیمو ہے۔ جس کی ماں اس سے بچھڑ گئی تھی۔ کاکا مسکرایا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"واہ مولا! تیرے رنگ نیارے ہیں۔"

"چل آ جا چاچا۔ بابے کے پاس چلیں۔ وہ تجھے دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ وہ تجھے یاد کرتا ہے۔" چھیمو نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"چل آ جا کڑیے۔ تجھے گڈ کی سیر کرائیں۔" کاکے نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے پھول کی طرح اٹھا لیا۔ چھیمو گدگدی ہونے کی وجہ سے کھل کھل کر ہنستی چلی گئی۔

تینوں بیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ تو سجاول نے چھیمو سے پوچھا۔

"تو یہاں اکیلی کیا کر رہی تھی؟"

"چاچا! ہمارا گھر تو قریب ہی ہے۔ میں کھیلتی کھیلتی اس طرف آ گئی تھی۔ بس ابھی آ جاتا ہے۔" وہ بولی۔

"اس طرف سے تھوڑا دور پڑے گا۔ ہیں نا۔" کاکے نے بیلوں کو ہانکا چھیمو بیل گاڑی کا جنگلا تھام کر کھڑی ہو گئی۔ صبح کی خنک ہوا اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ وہ بہت خوش تھی اور اچک اچک کر پگڈنڈی کے قریب سایہ ڈالے ہوئے درختوں کی لٹکتی ہوئی شاخوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

سجاول کے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہوا تھا۔ بوڑھے اور چھیمو کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ باس سے ملنے کی توقع بھی تھی۔ وہ پہلے کی نسبت خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

سورج کی روپہلی کرنوں نے مشرق کی طرف ایک طلائی حاشیہ باندھ دیا تھا۔ صبح کے ٹھنڈے اور دھیمے رنگ اب گہرے اور واضح ہو چلے تھے۔ ہوا سے خنکی اور تازگی دھیرے دھیرے الگ ہو رہی تھی۔

چھیمو کسی خوش آواز پرندے کی طرح چہکی اور انگلی سے اشارہ کر کے بولی۔

"آ گیا...... آ گیا...... چاچا! وہ دیکھو گھر آ گیا۔"

سجاول نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ کاکا لوہار بولا۔ "یہ تو خانہ بدوشوں کی بستی ہے۔ اوکا کی۔ تو یہاں رہتی ہے۔"

"ہاں چاچا! ہاں۔ یہی ہمارا گھر ہے۔"

"چلو۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہمیں بھی یہیں آنا تھا۔" کاکے نے بیلوں کو ہنکایا تاکہ وہ جلدی قدم اٹھائیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ان کے پھٹے پرانے خیموں کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ ننھے منے ننگ دھڑنگ بچے متجسس نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بیل گاڑی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ سجاول نے چھیمو کو اٹھا کر نیچے اتارا۔ تو وہ جوش سے بولی۔

"آ جا چاچا! آ جا۔ بابا تجھے دیکھ کر بڑا خوش ہو گا۔"

کاکے نے بیلوں کی رسی باندھ دی اور ان کے سامنے کچھ دانے اور گھاس کا ڈبہ رکھ کر ان کے ساتھ چلا آیا۔

"چل بھئی۔ پہلے تیرے بابے سے مل لیں۔ پھر چلتے ہیں اپنے کام پر۔" اس نے پیار سے چھیمو کے بالوں کو چھوا۔

وہ اپنی چھوٹی سی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی ان سے آگے آگے دوڑنے لگی۔ اسے بابے کو یہ اچھی خبر سنانے کی بہت جلدی تھی۔ وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کے پیچھے چلتے گئے۔ چھیمو ایک خیمے کے سامنے رکی اور باہر کھڑی ہوئی ایک لڑکی کے بازو میں جھول گئی۔

"اوئے ہوئے۔ یہ تو لہر مرجانی ہے۔" کاکے نے قدرے حیرت سے کہا۔ سجاول نے بھی دیکھا۔ چھینٹ کے گھیردار فراک اور سنہری چوٹیوں میں رنگ برنگے پراندے پہنے لہر ان کے روبرو تھی۔ چڑھتے سورج کی سنہری کرنیں۔ اس کی سبز حسین آنکھوں میں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔

چھیمو! بڑے فخر سے بولی۔ "یہ لہر باجی ہے۔ میری لہر باجی۔"

"تو ان کے پاس رہتی ہے۔" سجاول نے تصدیق کرنے کو پوچھا۔

"ہاں چاچا! میں یہیں رہتی ہوں۔ ماما قدیر بھی۔ بابا بھی اور یہاں دادا بھی ہے۔" اس نے پوری تفصیل سے آگاہ کرنا ضروری خیال کیا۔

تب لہر بھی قریب آ گئی اور کچھ حیرت سے چھیمو کی یہ بے تکلف گفتگو سننے لگی۔ کاکے

نے لہر سے پوچھا۔ ''یہ رشتہ دار ہے تمہاری؟''

''نہیں رشتہ دار تو نہیں۔ ہاں اس کا ماما قدیر دادا کا بیٹا بنا ہوا ہے۔ دادا اس کو بہت چاہتا ہے۔ اس نے ایک بار دادا کی جان بچائی تھی۔'' لہر نے بتایا۔

''قدیر کہاں ہے؟'' سجاول نے لہر سے براہ راست پوچھا۔

''وہ سیر کرنے گیا ہے۔'' اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''اور بابا؟'' سجاول نے استفسار کیا۔

''وہ اندر ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔

اسی وقت چھیمو اچھلتی پھاندتی خیمے میں سے باہر آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک بھاری بھرکم دراز قد بوڑھا تھا۔ جس کی داڑھی بالکل سفید تھی۔ لیکن اس کے باوجود عمر رسیدہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کمر میں خم نہیں تھا اور وہ بالکل سیدھا جیسے سینہ تانے ہوئے چل رہا تھا۔ اس نے خانہ بدوشوں کی طرح پیشانی پر پٹی باندھ رکھی تھی اور اس کے ایک کان میں بالی تھی۔ وہ ہاتھ کا چھجا سا آنکھوں پر رکھے ان کی طرف دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔

چھیمو نے شور مچایا۔ ''چاچا! چاچا! دادا آ گیا۔ دادا آ گیا۔!!''

سجاول نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ کاکے نے بھی اس سے ہاتھ ملایا۔ اور اس کی خیر خیریت پوچھنے لگا۔

''آؤ......آؤ بچہ۔ اندر آ جاؤ'' وہ تھوڑا سا جھک کر خیمے میں داخل ہوا اور انہیں بھی اندر آنے کے لئے کہا۔

سورج کا روشن اجالا خیمے میں جا کر ملگجا سا ہو گیا تھا اور انہیں گردوپیش اتنا صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسے ہی ان کی نگاہیں تاریکی سے مانوس ہوئیں سجاول نے دیکھا کہ بوڑھا گورکن خیمے کے ایک کونے میں چٹائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ سجاول نے اسے سلام کیا اور جھک کر تعظیماً اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

بوڑھے نے گرمجوشی سے اسے پیار کیا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا اور اس کا شانہ ہلا کر بولا۔ ''بس پتر۔ اب تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب قدیر آ گیا ہے۔ وہ مجھے اور چھیمو کو سنبھال لے گا۔ تو اب فکر نہ کرنا۔''

''لہر! کوئی چاء پانی لا۔ بھائیوں کیلئے۔ دادا نے بھاری آواز میں کہا۔

''نہیں......نہیں دادا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہم ناشتہ کر کے گھر سے نکلے ہیں۔''

کاکے نے جلدی سے کہا۔ سجاول نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

دادا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ خیمے کے چھوٹے سے دروازے میں سے آواز آئی۔ ''یہ کون آ گیا ہے۔ چھیمو کا چاچا۔''

ان سب نے پلٹ کر دیکھا۔ باس مسکراتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ سجاول کو اس سے اتنے دنوں بعد ملنا اچھا معلوم ہوا۔ وہ اٹھ کر یوں اس سے ملا جیسے کسی بچھڑے ہوئے دوست سے ملا جاتا ہے۔

''عجیب ہو یار تم بھی۔ وہاں سے چوروں کی طرح نکل آئے۔ نہ کوئی پتہ۔ نہ ٹھاہ۔'' سجاول نے شکوہ کیا۔

''کیا کریں۔ آخر ہوئے جو چور'' باس نے ہنس کر کہا اور وہیں چٹائی پر بیٹھ گیا۔

بوڑھا گورکن آنکھوں میں ایک تفاخر آمیز چمک لئے اس کی طرف والہانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر نچھاور ہو رہا ہے۔ سجاول کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ باس نے خواہ اپنی غرض کیلئے سہی۔ قدیر بن کر بوڑھے کی زندگی کے آخری لمحوں کو مسرت سے سنوار دیا تھا۔

سجاول نے کاکے سے اس کا تعارف کروایا۔ وہ ابھی ادھر ادھر کی باتیں ہی کر رہے تھے کہ لہر کے زیور کھنکنے کی آواز اس جانب آئی۔ اس نے ایک بڑی سی قاب میں بہت سا حلوہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ چھیمو پراٹھوں کی چنگیر لے آئی۔

''واہ۔ واہ۔'' کاکے نے چٹخارہ لیا۔ ''آج تو مزے آ گئے۔''

''بڑا تکلف کیا آپ نے۔ ہم تو ناشتہ کر آئے تھے۔'' سجاول نے کہا۔

''اب تک تو وہ ہضم بھی ہو گیا ہو گا۔ چلو تم بسم اللہ کرو۔'' باس نے کہا۔

کاکے اور سجاول نے لقمہ توڑا۔ باس نے اچک کر خیمے کے دوسرے سرے پر لہر کو دیکھا۔ اور اسے آواز دی۔

''بات سن لہر۔ رات کا سالن ہے۔ تو مجھے لا دے۔ تجھے پتہ ہے۔ میں ایسی چیزیں نہیں کھاتا۔''

لہر قریب آئی۔ ''تھوڑا کھا کر تو دیکھو۔'' اس کے لہجے میں سجیلے ارمان چھپے تھے۔

''نہیں بھئی۔ تھوڑا سالن ہو تو لا دے۔'' باس نے بے نیازی سے کہا۔

لہر نے غصے سے ہونٹ چبائے اور چولھے کی طرف چلی گئی۔

''یار! اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یوں ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ تم کھا کے دیکھو بڑا مزیدار ہے۔'' کاکے لوہار نے بڑے بڑے لقمے توڑتے ہوئے کہا۔

باس نے جواب نہیں دیا۔ بس برا سا منہ بنا کر کھانے سے انکار کر دیا۔

تھوڑی دیر میں لہر ماتھے پر بل ڈالے ہوئے آئی اور ایک پلیٹ میں تلا ہوا انڈہ اس کے سامنے رکھ گئی۔ ''اتنا غصہ کیوں کرتی ہے۔ اگر میں یہ حلوہ کھا لوں گا۔ تو تجھے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا۔''

''نہیں کھاتا تو نہ کھا۔'' وہ غصے سے کہہ کر پلٹ گئی۔

ₒ......ₒ......ₒ

سجاول نے کاکے لوہار کو تنہا ہی شہر روانہ کر دیا۔ مگر وہ اس سے وعدہ لے کر گیا کہ وہ آتی بار اسے اپنے ہمراہ لے جائے گا۔ وہ جب تک یہاں ہے۔ اس کے پاس ہی ٹھہرے گا۔

اس کی بیل گاڑی میں دادا کا سامان رکھ کر وہ اسے دور تک خدا حافظ کہنے گئے۔ وہاں سے پلٹتے ہوئے وہ سبز لہلہاتے کھیتوں کے ساتھ ساتھ بل کھاتی ہوئی۔ پگڈنڈی پر ہو لئے۔ سجاول نے باس سے کہا۔

''آ یار! ذرا تھوڑا گھومتے ہیں۔''

''میں تو ابھی لمبی سیر کر کے لوٹا ہوں۔ کچھ تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔'' اس نے کسلمندی سے جواب دیا۔

''چلو۔ پھر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔'' سجاول نے کہا۔ اور دونوں برساتی نالے کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی کچی مینڈھ پر بیٹھ گئے۔

سجاول نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''یار! تو نے خوب قدیر کا روپ بھرا ہے۔ بابے کو تو پکا یقین ہو گیا ہے۔''

باس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سجاول نے بات آگے بڑھائی۔ ''مجھے تو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بیچارہ بوڑھا آدمی۔ بہت خوش ہے۔ اچھا اس کی زندگی کے آخری دن تو سکھ میں گزر جائیں گے۔''

باس نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ تو سجاول جو پہلے برساتی نالے میں بہتے ہوئے چند خشک پتوں پر نگاہیں جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔ گھوم کر باس کی طرف دیکھا۔ کہ وہ کس خیال میں کھویا ہوا ہے۔ جو اس کی بات ہی نہیں سن رہا۔

وہ یوں چپ بیٹھا تھا۔ جیسے کہیں بہت دور دیکھ رہا ہو۔ سجاول نے اس کا بازو ہلایا۔

''کیا بات ہے یار! کہاں پہنچے ہوئے ہو؟ میری بات سنی ہے یا نہیں تم نے؟''

''سنی ہے میں نے تمہاری بات۔'' اس نے کئی بار سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''یار سنی ہے۔ اور تم بھی میری بات سن لو۔ کہ میں قدیر بنا ہوا نہیں ہوں۔ میں واقعی قدیر ہوں۔''

''کیا؟'' سجاول نے ایک خوشگوار استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں یار! ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں قدیر ہوں۔ بابے کا بیٹا۔ میں سیلاب میں اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی چھ سات سال ہوگی۔ سب کچھ مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح سے۔''

''اچھا۔ کیا واقعی!'' سجاول نے بے یقینی سے کہا۔

''کمال ہے یار! تم نے تو بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا۔''

''ہاں!'' وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ خود مجھے بھی یقین کرنے میں وقت لگا تھا۔ دکھوں اور پریشانیوں نے بابے کی صورت اتنی بدل دی ہے کہ میں شاید اسے نہ ہی پہچانتا۔ لیکن جب اس نے قدیر کا نام لیا۔ اور سیلاب میں اس سے بچھڑ جانے کا ذکر کیا۔ تو مجھے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آ گیا۔''

سجاول کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک مار دینے والے احساس محرومی نے اسے ڈس لیا۔ باس کتنے عرصے بعد بھی آن کر اپنے بچھڑے باپ سے مل گیا تھا اور ایک وہ تھا کہ اپنے بچھڑے رشتوں کی تلاش میں اب تک بھاگ رہا تھا۔ مگر ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

''خوش قسمت ہو یار تم۔ بچھڑے ہوؤں کا مل جانا تو بڑی بات ہے۔'' سجاول نے بڑی حسرت سے کہا۔

''ہاں یار! میں خود حیران ہوتا ہوں کہ یہ سب کس طرح سے ہو گیا۔ میں تو زندگی میں اتنا آگے نکل گیا تھا کہ کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ایک بار پھر اتنا پیچھے آ جاؤں گا۔ جیسے ماضی میں رہ رہا ہوں۔''

''کیوں؟ تم خوش نہیں ہو یار!؟'' سجاول نے پوچھا۔

''خوش۔'' وہ ایک لفظ کہہ کر کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر جیسے

اس سوچ کے درمیان بولا۔'' کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ وقت اچھا تھا۔ یا یہ اچھا ہے۔ میں نے وہ مقام بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا۔ ہزار طوفانوں سے لڑ کر میں نے اپنا آپ بچایا تھا۔ لیکن یکدم ایسی موج آئی کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اور بہت کچھ مل بھی گیا۔ سوچتا ہوں کہ اگر یہ واردات مجھ پر نہ گزرتی۔ تو شاید میں بابے سے کبھی نہ ملتا۔ اور وہ اس کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ دیتا اور معصوم چھیمو غیروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی۔ مگر اب بھی کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا کروں۔ ان اپنے لوگوں کو کس طرح سکھ دوں۔ اور اپنی زندگی کو کیونکر سنواروں۔؟''

''کیا مطلب؟ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔؟'' سجاول نے پوچھا۔

''میں!'' باس نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔''میں نے کوئی ہنر نہیں سیکھا۔ جو ہنر میرے پاس ہے۔ میں اس کو آزما نہیں سکتا۔ وقت نے' حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ اب ایک بیٹی کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔ بہن کی اولاد بھی تو اپنی اولاد کی طرح ہی ہوتی ہے۔ اپنی عزت' اپنا خون ہے۔ اگر میں اپنا دھندا پھر شروع کرتا ہوں۔ تو اس کا کیا ہوگا؟ اس کی ڈولی کون لے جائے گا۔ اس کو میرے نام کے طعنے ملتے رہیں گے۔''

''پھر!!'' سجاول نے متاثر ہو کر کہا۔

''پھر۔ پھر یہ کہ میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ کہ کیا کروں۔ میں کہیں بھی آزادی سے کام نہیں کر سکتا۔ پولیس نے میرے خلاف کتنے ہی مقدمے بنا رکھے ہوں گے۔ سب کچھ چھوڑتا ہوں۔ مجھے چھیمو کی فکر ہے۔ وہ میری مری بہن کی نشانی ہے۔'' باس کی اس بات پر سجاول چونکا اور اسے چھیمو کی ماں کا خیال آیا۔ جو بیٹی کی جدائی میں تڑپ رہی تھی۔ اس نے باس سے پوچھا۔

''یار! تمہیں کس نے بتایا ہے کہ چھیمو کی ماں مر گئی ہے۔''

''بابے نے بتایا ہے کہ چھیمو بہت چھوٹی تھی کہ وہ فوت ہو گئی تھی۔ چھیمو کے باپ کا غم اسے کھا گیا۔'' باس نے بتایا۔

سجاول کو اندازہ ہو گیا کہ بابے نے جان بوجھ کر اسے چھیمو کی ماں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ ایک عرصے بعد بیٹے کو پا کر پھر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب اسے اس کے بارے میں بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے محتاط سے لہجے میں کہا۔

''یار! میری بات ذرا دھیان سے سننا۔ تمہاری بہن مری نہیں وہ زندہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بابے نے مجھے خود بتایا

ہے کہ وہ مر چکی ہے۔''

''ہاں۔ وہ بیچارا بھی کیا کرے۔ اس کے لئے تو سمجھو مر ہی گئی ہے۔ بوڑھا آدمی ہے۔ کسی کا کیا مقابلہ کرے۔ وہ تو اس کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔''

''کیا تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو یار!'' باس نے تلخی سے کہا اور پھر کچھ سوچ کر متغیر چہرے کے ساتھ بولا۔

''کہیں وہ کسی کے ساتھ نکل تو نہیں گئی۔''

''نہیں......نہیں یار۔ ایسی بات نہیں ہے۔'' سجاول نے زور دے کر کہا۔

''اس بیچاری کو تو کچھ جرائم پیشہ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے۔''

''کون؟ کیا؟ کس کے آدمی تھے وہ۔'' اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کوئی گالی بکی۔

''یار! کچھ صحیح پتہ نہیں چل سکا کہ وہ بندے کس کے تھے۔'' یہاں قبرستان میں ایک قبر کے اندر انہوں نے اڈا بنا رکھا تھا۔ بابے نے انہیں دیکھ لیا۔ تو وہ اس کا منہ بند کرنے کیلئے تیری بہن کو اغوا کر کے لے گئے۔''

''قبر......قبر میں اڈا۔ یار تجھے پتہ ہے کہ وہ کونسی قبر تھی۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''ہاں۔ مجھے پتہ تو تھا۔ لیکن اب دیکھتا ہوں۔ تو اس کا نام نشان نہیں۔ پکی قبر تھی۔ سنگ مرمر کا تعویز لگا رکھا تھا انہوں نے۔ دور سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ بالکل اصلی قبر لگتی تھی۔ مگر اب پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ ایک دم غائب ہو گئے ہیں۔''

''اور۔ اور میری بہن۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''وہ ان کے چنگل سے نکل آئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کوئی نشہ کیا تھا۔ جس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئے۔ یہ موقع دیکھ کر نکل آئی۔''

''کہاں ہے وہ؟'' باس نے بیتابی سے سوال کیا۔

''وہ بیچاری چھپتی چھپاتی قبرستان آ گئی تھی۔ بابے کو ڈھونڈنے۔ مگر تم بابے کو لے کر نکل چکے تھے۔ میں اتفاق سے اسے مل گیا۔ اسے تسلی دلاسہ دے کر میں اسے اس کی ایک سہیلی کے گھر چک اٹھانوے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں بابے اور چھیمو کو تلاش کر کے اسے ان سے ملوا دوں گا۔

بس بیچاری اسی آس میں گھڑیاں گن رہی ہوگی۔''

باس نے شدت کرب سے ہونٹ کاٹے۔

''یار! تم نے تو میرے راستے' میری سوچ۔ سب کچھ ہی بدل دیا ہے۔ چل آ اٹھ۔ مجھے اس کے پاس ابھی لے کر چل۔ پتہ نہیں وہ کس طرح ایک ایک لمحہ گن گن کر کاٹ رہی ہو گی۔''

۞......۞......۞

دونوں چک اٹھانوے پہنچے۔ نور جاں اپنی آنسو بھری آنکھیں دہلیز پر بچھائے بیٹھی تھی۔ اس نے باس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور بیقراری سی ہو کر سجاول سے بولی۔

''ویرا۔ کچھ پتہ چلا۔ میرے بابے کا۔ میری چھیمو کا۔''

سجاول' نور جاں کو اتنی ساری خبریں اکٹھی نہیں سنانا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''چل اٹھ رجاں۔ اپنی سہیلی سے مل جل لے۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔''

''کیوں پا۔ خیر ہے نا۔'' اس نے قدرے حیرت سے کہا اور اس کی روئی روئی سی آنکھوں میں امید کی ایک دھندلی سی چمک جاگی۔

''سب خیر ہے۔ سب خیر ہے۔ تو بتا۔ تو نے چھیمو سے نہیں ملنا؟''

''کیا؟'' وہ اتنی جلدی اس کی بات پانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن چھیمو کا نام سن کر اس کے بجھے چہرے پر شادابی کی ایک لہر سی تڑپی۔ اور وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

''ہائے وے پا۔ مجھ نصیبوں جلی کو بجھارتیں نہ بجھوا۔ اللہ کے واسطے مجھے بتا دے۔ میری چھیمو کدھر ہے؟ کہاں ہے میری دمی۔ میری شہزادی۔ میں واری۔ میں صدقے۔''

''اچھا۔ اچھا۔ تھوڑا صبر تو کر۔'' سجاول نے کہا۔

''کچھ اپنے بابے کا بھی پوچھ لے کہ اسے بالکل ہی بھول بیٹھی ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''نہ ویرا! اس طرح مت کہہ۔ بھلا بیٹیاں بھی کبھی ماں باپ کو بھولتی ہیں۔ ہاں بتا۔ میرا بابا کیسا ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

''وہ۔ وہ تو بالکل چنگا بھلا ہے۔ گھوڑے کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔ بڑا خوش ہے وہ۔ اپنی بیماری شاری سب بھول بھال گیا ہے۔ اتنے عرصے بعد اس کا بچھڑا ہوا بیٹا جو اس سے آ ملا ہے۔ اس نے خوش نہیں ہونا۔ تو اور کس نے خوش ہونا ہے۔'' سجاول آہستہ آہستہ اصل بات کی طرف آ گیا۔

''کون؟ کون؟ کون آ گیا ہے۔'' وہ حیرت اور بے یقینی سے پوچھنے لگی۔

''وہی۔ تیرا بھائی قدیر اور کون۔ جو سیلاب میں بہہ گیا تھا۔'' سجاول نے وضاحت کی۔

''ہائے۔ میں مر جاواں۔ سچی کہہ ویرا۔''

باس ایک عجیب حسرت اور دکھ سے اس کے سنولائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اتری ہوئی تھی۔

''اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھ پر یقین نہیں۔ تو لے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ یہ بیٹھا ہے تیرے سامنے قدیر۔ پوچھ لے اسی سے۔'' سجاول نے باس کی طرف اشارہ کیا۔ نور جاں ساکت سی ہو کر اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

باس نے ہونٹوں سے ایک لفظ نہیں کہا اور چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ باس کے صاف ستھرے لباس اور شہری وضع قطع کو دیکھ کر وہ کچھ حیرت' کچھ اچنبھے اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ہونٹوں میں انگلی دابی اور اس سے پوچھنے لگی۔

''ہائے وے۔ تو قدیر ہے؟ قدیریا! تو سچی مچی قدیر ہے۔''

''ہاں آپا۔ میں قدیر ہوں۔'' باس نے آہ سی بھر کر کہا۔ ''تیرا بدنصیب بھائی۔''

شدت جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''نہ وے نہ۔ بدنصیب ہوں تیرے دشمن۔'' اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر ارمان سے کہا اور اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ باس نے اٹھنا چاہا۔ لیکن رجاں نے اسے بیٹھے رہنے کو کہا اور اس کی پیشانی پہ جھکے ہوئے بال ہٹا کر کچھ دیکھنے لگی۔

سجاول دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اسے قدیر تسلیم کرنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔ باس بھی کچھ الجھا ہوا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک وہ خوشی اور حیرت سے بے قابو سی ہو کر چلائی۔

''ہائے میرا ویر! تو تو سچ مچ قدیر ہی ہے۔'' اس نے باس کی پیشانی کو کئی بار چوما اور اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر بولی۔

''وے قدیریا! ہائے میرے ویرا! تیرے پیچھے تو ہم لٹ گئے۔ ہمارے پاس تو کچھ نہیں رہا۔'' وہ زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگی۔ باس کچھ دیر تو جیسے ضبط کئے ہوئے ساکت سا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بھی اپنے بازو رجاں کے گرد لپیٹ دیئے۔

۞......۞......۞

لہر کے خیمے میں خوشی اور رونق اتر آئی تھی۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ ننھی چھیمو تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ بوڑھے گورکن کی بیماری اور ناتوانی غائب ہو گئی تھی۔ آج کے دن تو جیسے اس نے اپنے بڑھاپے کو بھی بھلا دیا تھا۔ وہ لہر کے دادا کے ساتھ بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔

لہر بھی چمکتے ہوئے چہرے اور ہنستی آنکھوں کے ساتھ ان سب کی خاطر داریوں میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اور رجاں چپکے چپکے باتیں کر کے مسکرائے جاتی تھیں۔ ان سب کو خوش اور مطمئن دیکھ کر سجاول خود بھی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن رہ رہ کے اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی۔ رجاں کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر اسے بار بار بھاگ بھری کا خیال آتا تھا۔ شاید وہ بھی کہیں اسی دن کی آس میں ایک ایک لمحہ گن رہی ہوں گی۔ جب وہ اپنوں کے درمیان ہو گی۔ ان سے ملے گی اور ان کے سامنے اپنے سارے دکھ کھول کر رکھ دے گی۔

شام گہری ہوئی تو کاکا لوہار دن بھر کے سفر کی گرد چہرے پہ سجائے ہنستا ہوا سجاول کو لینے آ موجود ہوا۔ وہ بھی زندہ دلی سے ان سب کی خوشیوں میں شریک ہو گیا۔ اس کے آ جانے سے جیسے اس چھوٹے سے خیمے کی رونقوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے بوڑھے دادا کے ساتھ حساب کتاب کیا۔ رجاں کی خیر خیریت پوچھی۔ چھیمو سے پیار بھری باتیں کیں۔ اور لہر کو ستایا۔

پھر وہ سجاول کے سر ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ گاؤں چلے۔ اس کا کہنا تھا کہ سجاول کے بغیر اس کا دل نہیں لگے گا۔ اس کی اپنائیت دیکھ کر سجاول اس کے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو گیا۔ ویسے بھی وہ بوڑھے دادا کی چھوٹی سی جھونپڑی پر بار نہیں بننا چاہتا تھا۔ جہاں پہلے ہی بہت سارے مہمان تھے۔

تب تک لہر اور رجاں نے مل جل کر کھانا تیار کر لیا۔ وہیں زمین پر دستر خوان بچھا لیا گیا۔ نرم گرم سی گھریلو فضا میں سب کے ساتھ گھر کا پکا ہوا کھانا کھاتے ہوئے سجاول کو ایک

بالکل انوکھے اور نئے ذائقے کا احساس ہوا۔ کچھ دیر خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ پھر کاکا چلنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

خانہ بدوشوں کی بستی سے گھر کا راستہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی انہیں گھر تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔ کھانا تو وہ کھا ہی آئے تھے۔ کاکے نے بیلوں کو کھول کر ان کی ناند پر باندھا ان کے آگے چارہ پانی رکھا۔ لالٹین جلائی اور بستر پر دراز ہو گیا۔

سجاول بھی لیٹ گیا۔ کاکا دن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ باتیں کرتے کرتے ہی خراٹے لینے لگا۔ سجاول نے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن چہرے کے ساتھ آسودگی کی نیند سو رہا تھا۔ اور ایک وہ تھا کہ اس کی قسمت میں رت جگے ہی لکھے ہوئے تھے۔

کاش! وہ کاکے لوہار کی طرح اپنے اندر سلگتے ہوئے جوالا مکھی کو ایک پھونک مار کر ٹھنڈا کر سکتا۔ مگر یہ سب اس کے لئے اتنا ہی دشوار تھا۔ جتنا کاکے لوہار کے لئے سہل تھا۔ دل میں پڑے ہوئے گھاؤ سے بے خبر ہو جانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی بے چین سوچوں میں الجھا ہوا بہت دیر تک جاگتا کاکے لوہار کے بلند آہنگ خراٹے سنتا رہا اور کروٹیں بدل بدل کر گھلتا رہا۔

نہ جانے کب اسے نیند آئی۔ جو بار بار درمیان سے اچٹتی رہی۔ جب صبح صبح لہر نے آ کر آواز دی۔ تو کاکے سے پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ کاکا اتنی جلدی کبھی بیدار نہیں ہو گا۔ اسی لئے وہ آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دودھ کا برتن لے کر صحن میں آیا۔ تو گلاب ایسے شاداب چہرے والی لہر صبح کے اجلے رنگوں میں نہائی بہت دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے خلاف عادت اسے دیکھ کر ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ اور ایک شناسا سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''سلام پائیا!!''

سجاول نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے سلام کا جواب دیا۔ دودھ کا برتن اس کے پاس رکھتے ہوئے وہ اس کو چھیڑنے کو بولا۔ ''دودھ پورا ڈالنا۔ اچھا۔'' اس نے دودھ ڈالتا ہوا ہاتھ روک لیا اور تڑخ کر بولی۔

''اللہ کو جان دینی ہے۔ اتنی سی بے ایمانی کر کے ہم نے کون سا پار اتر جانا ہے۔''

''اچھا تو تم بڑی بے ایمانی کرنا چاہتی ہوں۔'' سجاول نے اسے چڑایا۔

لہر نے خوبصورت سبز آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی شرارت دیکھ کر وہ جان گئی کہ وہ اسے چڑا رہا ہے۔ کچھ اور کہنے کے

بجائے وہ ہولے سے ہنس کر پھر دودھ ڈالنے لگی۔ اس کی چوڑیوں میں لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنگھریاں بجنے لگیں۔

دودھ نکالتے ہوئے اس نے دو ایک بار سجاول کی طرف دیکھا اور پھر نگاہ جھکا لی۔ اس کے دلکش چہرے پر ایک تذبذب سا جھلکا اور اس کے ہونٹ یوں کپکپائے۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر کہہ نہ پاتی ہو۔

دودھ برتن میں نکال کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سجاول کی طرف پھر ایک بار کچھ کہتی ہوئی سی نظروں سے دیکھا۔ لیکن اس کے ہونٹ اسے لفظوں میں نہیں ڈھال سکے۔ سجاول نے اس کی مشکل کو سمجھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے لہر؟"

لہر نے گھبرا کر گلا صاف کیا اور جلدی سے کہنے لگی۔ "پائیا! قدیر تیرا دوست ہے؟" اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ سجاول نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ قدیر کا نام لیتے ہوئے اس کے صندلیں رخساروں پر گلابی رنگ پھوٹا تھا اور اس کی سبز آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے تھے۔ سجاول کو اس کے دلکش چہرے کی اس شرمیلی چمک نے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔

"ہاں بھئی۔ اپنا یار ہے قدیر۔ جگری یار۔"

لہر کی آنکھوں میں اس کے لئے پسندیدگی جھلکی۔

"اچھا!!" اس نے اشتیاق سے کہا اور کچھ دیر یوں کھڑی رہی۔ جیسے کچھ اور کہنا چاہتی ہو۔ کچھ اور پوچھنا چاہتی ہو۔ مگر پھر کچھ جھجک کر اس نے اپنا ڈول اٹھایا اور زیور چھنکاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کاکا لوہار بہت دیر میں سو کر اٹھا۔ ناشتہ کرتے کرتے خاصا دن چڑھ آیا۔ دونوں نے نہر پر جا کر کپڑے دھوئے اور جی بھر کر نہائے۔ جس نے انہیں تازہ دم کر دیا۔ باقی دن مصروفیت میں ہی گزرا۔ کاکا جن لوگوں کا مال لے کر گیا تھا۔ ان کے ساتھ حساب کتاب کرتا رہا۔ شام کو وہ خانہ بدوشوں کی بستی میں سب سے ملنے چلے گئے۔

باس نہ جانے کہاں غائب تھا۔ وہ خاصی دیر تک بیٹھے رہے۔ لیکن وہ نہیں لوٹا۔ رجاں اور لہر نے سرسوں کا ساگ بنایا تھا۔ دونوں نے اصرار سے انہیں کھانے پر روک لیا۔ وہ گھر پہنچے۔ تو رات ہو گئی تھی۔ اسی لئے دونوں سونے کیلئے لیٹ گئے۔

نہ جانے رات کا کونسا پہر تھا۔ کہ اچانک کچھ کھٹ پٹ سے سجاول کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ سجاول نے پھر کچھ کھٹ پھٹ کی آوازیں سنیں۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید مویشیوں نے چارے کے برتن کو ادھر ادھر دھکیلا یا گرایا ہے۔ لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد اسے کسی کے سرگوشیاں کرنے اور دبے پاؤں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ اور ایک بار پھر آنکھیں کھول کر غور سے سننے لگا۔ اسے خشک بھوسے کے روندے جانے کی آواز سنائی دی۔ ان کے کمرے کے ساتھ ہی بھوسے کی چھوٹی کوٹھری تھی۔ آواز اسی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔

سجاول آہستگی سے اٹھا اور تکیئے کے نیچے سے پستول نکال کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ اندھیرے اور خاموشی کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ چھپر تلے مویشی خاموش بیٹھے تھے۔ اس نے ایک تیز نظر سارے صحن میں دوڑائی۔ بھوسے کی کوٹھری کی طرف پھر کھٹکا ہوا۔ سجاول چوکس ہو گیا اور اس نے پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھی اور نپے تلے قدم لیتا۔ کوٹھری کے جھولتے ہوئے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

"یہاں کون ہے؟" اس نے دبنگ لہجے میں کہا۔

جواب میں ایک دبی دبی سی نسوانی چیخ ابھری۔ لیکن فوراً ہی یوں دب گئی۔ جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

"کون ہے یہاں۔ باہر نکلو۔ نہیں تو میں گولی مار دوں گا۔" اس نے سختی سے کہا۔

اب جیسے کسی نے دم سادھ لیا بھوسے کے ڈھیر میں نہ کوئی حرکت ہوئی اور نہ کوئی آواز ہی سنائی دی۔ سجاول نے تھوڑے توقف کے بعد پھر اپنی بات دوہرائی۔ لیکن کچھ اور سخت لہجے میں۔

بھوسے کے ڈھیر میں حرکت ہوئی اور تاریکی میں ایک سایہ سا لہرایا۔ اور ایک گھبرائی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی۔ "ہم چور نہیں ہیں۔ ہمیں صرف پناہ چاہیے۔" اس سے پہلے جو چیخ اس نے سنی تھی۔ وہ نسوانی تھی۔ گویا چھپنے والے مرد اور عورت تھے۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی۔ چوڑیوں کی کھنک سنائی دی اور اس سائے کے ساتھ ایک اور سایہ آن کھڑا ہوا۔

"ہمیں کچھ دیر یہاں پناہ دے دو۔ صبح ہم چلے جائیں گے۔" مرد نے التجا کی۔

سجاول کو سارا معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"یہ کس گھر کی عزت نکال لائے ہو؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اس کی عزت بچا کر لایا ہوں۔" مرد نے فوراً ہی زوردار لہجے میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

"اچھا۔" سجاول نے طنزیہ کہا۔

"اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

"بس جی۔ ہم کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔ تو آگے خیر سلا ہے۔" وہ شخص بڑے اعتماد سے کہنے لگا۔ لڑکی اس کے قریب خاموشی سے کھڑی رہی۔

"اچھا۔ تو تمہارا کوئی پیچھا کر رہا ہے؟" سجاول نے پوچھا۔

"ہاں۔ کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ شاید وہ یہاں بھی پہنچ جائیں۔ تو تم انہیں ہمارا پتہ نہ دینا۔ ہم ساری زندگی تمہیں دعائیں دیں گے۔"

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ پھر کوئی لگاتار دروازہ پیٹنے لگا۔

"ہائے اللہ۔ وہ لوگ آ گئے۔" لڑکی کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔

"یار۔ تیرا بڑا احسان ہوگا۔ ہماری دید رکھنا۔" مرد نے التجا کی۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ چھپ جاؤ۔" سجاول نے کہا۔

تب تک دروازہ دھڑا دھڑ بجتا رہا۔ شور سن کر کاکا بھی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور سجاول کو پکارنے لگا۔ سجاول بھوسے کی کوٹھڑی کا دروازہ بھیڑ کر پیچھے ہٹا اور کاکے نے اس کی طرف دیکھا اور گالی دے کر بولا۔

"یار! یہ کس کو تکلیف ہوئی ہے رات کے وقت۔"

"پتہ نہیں۔" سجاول نے جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"میں بھی یہ شور سن کر ہی اٹھا ہوں۔"

"آتا ہوں بھئی۔ آتا ہوں۔ کیوں دروازہ توڑ رہے ہو۔" کاکے نے دور ہی سے بلند آواز میں کہا اور دروازہ کھولنے کو بڑھا۔

سجاول بھی اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ دروازے پر چار پانچ آدمی کھڑے تھے۔

"اوئے۔ دروازہ توڑنے نکلے ہو گھر سے۔" کاکے نے چھوٹتے ہی کہا۔

ان میں سے ایک شخص یوں آگے بڑھا۔ جیسے دروازے میں سے اندر داخل ہونا چاہتا

ہے اور چلا کر بولا۔

"وہ لوگ اسی طرف آئے ہیں۔ وہ یہیں ہیں۔ وہ اندر ہی ہوں گے۔"

"کون؟ کون لوگ؟" کاکے نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اندر آنے سے روکا۔

"یہ کیا منہ اٹھا کر اندر چلے آ رہے ہو۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

"اوئے۔ یہ کیا مصیبت مچائی ہوئی ہے تم لوگوں نے آدھی رات کو۔" سجاول بھی کاکے کے شانے کے ساتھ شانہ ملا کر کھڑا ہو گیا۔

"یار! تم دیکھو تو سہی۔ کہیں اندر چھپ نہ گئے ہوں۔ اور تمہیں پتہ نہ چلا ہو۔" وہ شخص اپنی بات پر زور دیتا ہوا بولا۔

"پر وہ ہیں کون؟ کون آیا ہے یہاں۔ پتہ تو چلے۔" کاکے نے پوچھا۔

"یار! وہ تھیٹر والی نصیبہ بھاگ گئی ہے۔ اپنے یار کے ساتھ۔" ان میں سے ایک نے دہائی دی۔

"کون تھیٹر والی۔ جو ہیروئن بنتی ہے؟" کاکے نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں وہی۔ روشن کے ساتھ نکل گئی ہے۔ جو رانجھا بنتا تھا۔ یار تم ایک بار اندر دیکھ تو لو۔ کیا پتہ کہیں چھپے بیٹھے ہوں۔"

"او نہیں یار! ہمارے ایسے مقدر کہاں۔ جو نصیبہ یہاں آتی۔ کاکے نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وہ یہاں آئے تو سہی۔ ہم تو عید منائیں۔"

وہ لوگ کاکے کے مسخرے پن سے چڑ کر آگے بڑھ گئے۔ کاکا ان سے ابھی اور سوال جواب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سجاول نے اسے ایک طرف ہٹا کر دروازہ بند کر دیا۔ کاکے نے ایک طویل جماہی لی اور بولا۔

"یار! مزہ ہی آ جانا تھا۔ اگر نصیبہ بھاگ کر یہاں آ جاتی۔"

سجاول کو اس کی اس بات نے بہت محظوظ کیا۔ اس نے سوچا کہ کاکا جانتا نہیں کہ اس کی یہ معصوم آرزو پوری ہو چکی ہے۔ اس نے ہنس کر اس سے پوچھا۔

"یار! اگر نصیبہ بھاگ کر یہاں آ جاتی۔ تو تو نے کیا کرنا تھا؟"

"بس ذرا اسے قریب سے دیکھنا تھا۔ آمنے سامنے۔ ڈرامے میں دیکھ کر تو تسلی نہیں

ہوتی۔ دل ہی نہیں بھرتا۔'' وہ معصومیت سے کہنے لگا۔

''اچھا۔'' سجاول نے اچھا کو لمبا کر کے کہا اور بھوسے کی کوٹھڑی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے کاکے کا بازو تھام کر اسے روک لیا اور بولا۔

''یار! تو نے نصیبہ کو ہی دیکھنا ہے نا۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ تجھے ابھی دکھا دیتے ہیں۔''

''جانے دے یار!'' کاکا سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

سجاول نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''باہر آ جاؤ بھئی۔ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔'' اس نے بلند آواز میں پکارا۔

کاکا ٹھٹکا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو یار؟''

بھوسے کے ڈھیر میں سرسراہٹ ہوئی۔ اور بھوسے میں سے راستہ بناتا ہوا پہلے روشن باہر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نصیبہ بھی تھی۔

کاکا ششدر رہ گیا۔ اور وہیں کھڑا کھڑا ان کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں جھجکے اور وہیں رک کر روشن نے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

''گھبراؤ نہیں۔ یہ اپنا ہی آدمی ہے اور نصیبہ پر مرتا ہے۔ اس سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔''

کاکا بھی جیسے حیرت کی کیفیت سے نکل آیا تھا۔

''آؤ جی...... آؤ۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ کوئی لسی پانی...... روٹی ٹکر۔ جو کہو حاضر کریں۔'' نصیبہ وہیں سمٹ کر کھڑی رہی۔ روشن آگے بڑھا۔

''یار! اگر تم ہم غریب فنکاروں کی اتنی قدر کرتے ہو۔ تو ہماری کچھ مدد بھی کرو۔'' تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔

''کیوں نہیں جناب! آپ حکم تو کر کے دیکھو۔ ہم تو تمہارے بڑے قدردان ہیں۔'' کاکے نے جوشِ مسرت سے ہانپتے ہوئے کہا۔

روشن اس کی اس غیر معمولی گرمجوشی سے کچھ مطمئن تو ہوا۔ لیکن پھر بھی جیسے اپنی تسلی کو بولا۔

''یہاں اور کون لوگ ہیں؟''

''تو فکر نہ کر جن۔ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں۔ چھڑے چھانٹ ہیں ہم۔'' کاکے نے بتایا۔

''یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔''

روشن نے نصیبہ کو اشارہ کیا اور وہ بھی کچھ سمٹی سمٹی ہوئی سی اس کے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔ کاکے نے گرمجوشی سے ان کی کمرے کی جانب رہنمائی کی۔

''اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ فکر والی کوئی بات نہیں۔ ہم سب کچھ سنبھال لیں گے۔''

سجاول نے نصیبہ کی طرف دیکھا۔ اور حیرت سے سوچنے لگا کہ وہ کتنی بڑی اداکارہ تھی۔ وہ دلشاد کے یہاں اسے ملی تھی۔ تو کتنی مظلوم اور ستم رسیدہ نظر آتی تھی۔ مگر نیلم کے کوٹھے پر جا کر اس کا سارا بھرم کھل گیا تھا۔ یہاں وہ ہیر کے روپ میں کس طرح ڈرامے کی جان بنی ہوئی تھی۔ اور اس وقت نصیبہ کے روپ میں شانے سکیڑے یوں چل رہی تھی۔ جیسے کوئی سیدھی سادھی گھریلو عورت ہو۔

کاکا انہیں ہاتھوں ہاتھ کمرے میں لے گیا۔ اس نے لالٹین جلا دی۔ اور انہیں چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ دونوں کچھ جھجکتے ہوئے سے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کاکے کی زبان تالو سے نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے جو اس کے منہ میں آتا تھا۔ کہتا چلا جا رہا تھا۔

اس نے انہیں کھانے کیلئے پوچھا۔ مگر انہوں نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر کے انکار کر دیا۔ لیکن کاکے کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ انہیں کچھ نہ کچھ کھلانا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے مٹی کے مرتبان میں سے تھوڑا سا میوے والا گڑ نکالا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔

وہ دونوں اس کے خلوص سے متاثر نظر آتے تھے۔ انہوں نے تھوڑا تھوڑا گڑ منہ میں رکھا۔ روشن خوش ہو کر بولا۔

''یار! تم نے منہ میٹھا کرایا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے۔ اب مجھے امید ہو گئی ہے کہ ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''کیوں نہیں میرے بادشاہ۔ میں تمہیں یہاں سے اس طرح نکال دوں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالتے ہیں۔'' کاکے نے انہیں یقین دلایا۔

نصیبہ اور روشن نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کاکے کے اس یقین نے ان کی ڈھارس بندھا دی ہو۔ سجاول نے ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا اور چپ بیٹھا

ان کی باتیں سنتا رہا۔

روشن یہاں سے جلدی نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن کاکے نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ دو ایک روز یہیں ٹھہریں۔ تھیٹر والے ہیرو ہیروئن کے نہ ہونے کی وجہ سے جلد یہاں سے بھاگنے کی سوچیں گے ورنہ عوام انہیں جینے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد وہ جہاں جانا چاہتے ہیں۔ چلے جائیں۔

روشن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے نصیبہ سے کوئی بات کی۔ اس نے آہستگی سے کچھ کہہ کر اثبات میں سر ہلایا۔ تو روشن بولا۔

''یار! صبح ہوگی تو تمہارے گھر اور لوگ بھی تو آ سکتے ہیں۔ کوئی حق ہمسایہ کوئی اور۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' کاکے نے تائید کی۔

''دن کو تم زیادہ تر اسی کوٹھڑی میں رہنا۔ نہیں بلکہ ہم لوگ کام پر گئے۔ تو باہر سے تالا لگا جائیں۔ تم بے فکر ہو کر اندر پڑے رہنا۔ کل میں تھیٹر کا چکر بھی لگاؤں گا۔ وہاں کے سب حالات پتہ کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ تو پھر تم اپنا پروگرام بنانا۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' روشن نے ممنون لہجے میں کہا۔ ''یار! تمہاری بڑی مہربانی۔ تم نے مصیبت کے وقت ہم لوگوں کو سہارا دیا ہے۔''

رات بیتتی جا رہی تھی۔ کاکا دل بھر کے باتیں کر چکا۔ تو اسے ان کی فکر ہوئی کہ انہیں کہاں سلایا جائے۔ اس کے پاس کل دو ہی چارپائیاں تھیں۔ آخر انہوں نے یہی طے کیا کہ وہ دونوں زمین پر سو جائیں اور روشن اور نصیبہ کو چارپائیاں دے دی جائیں۔ لیکن روشن نے بھی اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ زمین پر ہی سوئے گا۔ ہاں نصیبہ کو چارپائی دے دی جائے۔

سجاول زمین پر بستر لگانے لگا۔ کاکا روشن کے ساتھ بھوسے کی کوٹھڑی میں صبح ان کے چھپنے کیلئے جگہ بنانے چلا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ بھوسے کو دروازے کے آگے لگا کر پیچھے چھپنے کے لئے بہتر گنجائش نکال لی جائے۔

روشن اور کاکا کمرے سے باہر چلے گئے اور نصیبہ وہیں چارپائی پر سمٹی ہوئی سی بیٹھی رہی۔ سجاول نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سجاول کا جی چاہا کہ اسے جتائے کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اسے کیا پڑی ہے کہ اس پر یہ سب ظاہر کر کے اسے پریشان یا شرمندہ کرے۔

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔'' اچانک نصیبہ نے کہا۔

سجاول چونک گیا۔ ''کچھ تم نے کہا ہے؟''

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔'' وہ تنتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سجاول نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب تم خوب سمجھتے ہو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔

''میں تمہیں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔''

سجاول کو اندازہ تو ہو گیا کہ وہ اسے پہچان گئی ہے۔ مگر اس نے لاتعلقی برتنی ہی بہتر سمجھی۔

''بی بی! تجھے شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔

''میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں۔ تم وہی ہو نا جو مجھے نیلم کے کوٹھے پر چھوڑ آئے تھے۔ اگر اب تم نے ایسی کوئی سازش کرنے کی کوشش کی۔ تو میں روشن کو سب کچھ بتا دوں گی۔ تم نے شاید ہمیں اسی لئے پناہ دی ہے۔''

سجاول اس کی بات سن کر پریشان سا ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اتنا غلط سمجھ رہی ہے۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں تم جیسے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ پتہ نہیں تم لوگوں نے خدا کو جان دینی ہے یا نہیں۔ پتہ نہیں تمہاری اپنی کوئی ماں بہن ہے کہ نہیں۔ جو تم اس قسم کا کاروبار کرتے نہیں ڈرتے۔ تم جیسوں کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے تم......

بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی اور اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ کاکا اور روشن کمرے میں واپس آ گئے تھے۔ سجاول کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ یہ لڑکی نصیبہ اسے کتنا غلط سمجھ رہی تھی۔ اس نے اس پر کیسا الزام لگا دیا تھا۔ کاکے نے آتے ہی اپنی مخصوص بے تکلفی سے کہا۔

''باجی! ہم نے کوٹھڑی کو شیش محل بنا دیا ہے۔ جیسے ہی کوئی خطرہ ہو تم آرام سے وہاں چھپ جانا۔''

روشن نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''ہاں۔ نصیبہ! فکر نہ کرو۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں نے پورا اطمینان کر لیا ہے۔''

''تم کہتے ہو۔ تو پھر ٹھیک ہے۔'' وہ اکھڑے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"کیوں باجی! تمہیں کوئی بے اعتباری ہے۔" کاکے نے اس کے اکھڑے ہوئے لہجے کو محسوس کر کے کہا۔

سجاول کچھ جز بز سا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسا طرز عمل اختیار کرے۔ نصیبہ کی اس غلط فہمی سے وہ خوامخواہ چور سا بن گیا تھا۔ نصیبہ نے پھر ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی اور سرد سے لہجے میں بولی۔

"کیا کریں بھائی ڈرنا ہی پڑتا ہے۔ لوگ اندر سے کچھ ہوتے ہیں اور باہر سے کچھ۔ دل بدلتے دیر تو نہیں لگتی۔ نیت کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم نصیبہ! روشن نے اسے ٹوکا اور دونوں سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"یار! اس کی بات کا خیال نہ کرنا۔ یہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے۔ اس لئے ایسی باتیں کر رہی ہے۔"

"نہیں۔ نہیں باجی! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہوتے کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔" کاکے نے پورے خلوص سے کہا۔

سجاول بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"اگر تمہارے دل میں کوئی غلط فہمی ہے۔ تو اس کو نکال دو۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔"

"نصیبہ! تم حوصلہ رکھو۔ دل نہ چھوڑو۔ شریف آدمیوں کے لیے اعتبار اور بھروسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی پر دنیا کا دارومدار ہے۔"

"میں نے بڑے دھوکے کھائے ہیں۔ میں اس لئے ڈرتی ہوں۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر کرب اور اذیت تھی۔

کاکے نے فوراً اس کی بات پکڑی۔ "باجی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی سارے کاج سنوارے گا۔" اس نے اوپر دیکھ کر کہا۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ نصیبہ لاجواب سی ہو گئی۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے خود کو حالات کے سپرد کر دیا ہو۔

⁂

ابھی صبح پوری طرح سے طلوع نہیں ہوئی تھی کہ سجاول کو نصیبہ کی آواز سنائی دی۔

سجاول نے آدھے سوتے، آدھے جاگتے میں سنا کہ نصیبہ بار بار روشن کو پکار رہی ہے۔

"روشن! روشن! اٹھو۔ اٹھو۔ دیکھو باہر کوئی ہے۔ پتہ نہیں کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ روشن دیکھو۔"

کاکا اور روشن ہلے تک نہیں۔ البتہ سجاول کی آنکھ پوری طرح کھل گئی۔ اس نے غور سے سنا۔ واقعی کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نصیبہ اسے اٹھتے دیکھ کر کچھ جھجک گئی۔ اور یونہی اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے ناگواری سے بولی۔

"ان لوگوں کو اٹھاؤ۔ باہر پھر کوئی آ گیا ہے۔" وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔

سجاول نے اپنے قریب ہی لیٹے کاکے اور روشن کا بازو باری باری ہلایا۔ روشن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟" کاکے نے بھی آنکھ مل کر دیکھا۔

"اوئے۔ کیا ہو گیا ہے۔ صبح ہی صبح۔ کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"باہر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔" سجاول نے اطلاع دی۔

دونوں نے غور سے سنا۔ اور کاکا ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"یار! یہ کون آ گیا ہے منہ اندھیرے۔" چل کر دیکھتا ہوں۔

"ٹھہر جاؤ۔ پہلے ہمیں چھپ تو جانے دو۔" نصیبہ گھبرا کر چارپائی سے اٹھی۔

"نہیں باجی! ابھی رہنے دو۔ میں یہ دروازہ بند کر جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"نہیں یار! نصیبہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم چھپ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ مفت میں کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔" روشن بھی اٹھا۔

سجاول نے کہا۔ "ٹھہر کاکے۔ میں چل کر دیکھتا ہوں۔ جو کوئی بھی ہوا۔ اسے دروازے پر ہی روک لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے صحن میں پہنچا اور بڑھ کر مرکزی دروازے کی زنجیر گرائی۔ پٹ کھولے۔ دروازے پر باس جھنجھلایا ہوا کھڑا تھا۔ "اوئے۔ کیسے گھوڑے گدھے بیچ کر سوئے ہو تم۔ دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر میں تو تھک گیا۔"

"تم۔ اس وقت۔ خیر تو ہے نا۔" سجاول حیران ہوا۔

"ہاں۔ سب خیر ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تم میرے

ساتھ چلو۔ ذرا جلدی۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''کہاں...... کدھر......؟'' سجاول نے پوچھا۔

''تم چلو تو سہی۔'' وہ عجلت میں بولا۔

''یار! کچھ بتاؤ تو سہی۔ ایسی کیا افراتفری ہے۔''

''کوئی افراتفری نہیں۔ تم بس چلنے کی کرو۔'' باس اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

''یار! میں ہاتھ تو دھو لوں۔ ابھی ابھی تو اٹھا ہوں۔''

''زیادہ دیر نہ لگانا۔'' وہ رضامند ہو گیا۔

سجاول نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کاکے نے ان دونوں کو چھپا دیا ہوگا۔ اگر وہ نہیں بھی چھپے تھے۔ تو بھی باس کو پتہ چل جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ اسے اندر لے آیا۔ کاکا انہیں صحن میں ہی مل گیا۔ اور باس کو دیکھتے ہی بڑی محبت سے بغلگیر ہو گیا۔ واہ بجنا۔ آج تو صبح ہی صبح دیدار کرا دیا۔ سب خیر سکھ ہے نا؟''

''ہاں...... ہاں یار! سب خیریت ہے۔'' باس نے گرمجوشی سے اس کی پشت تھپتھپائی۔

''شہر میں کچھ کام ہے۔ سوچا سجاول کو ساتھ لے لوں۔ صبح ہی صبح نکل چلیں تو وقت پر پہنچ جائیں گے۔''

''شہر بھی چلے جانا۔ پہلے کوئی روٹی پانی تو کھا لو۔'' کاکے نے کہا۔

''نہیں بھائی۔ مہربانی۔ ناشتہ تو ہم اڈے پہ جا کر کریں گے۔ بس ہمیں اجازت دو۔'' باس نے تیزی سے کہا اور ادھر ادھر سجاول کو دیکھا۔

''بھئی یہ سجاول کہاں رہ گیا ہے۔ اس نے عورتوں کی طرح تیار ہونے میں کتنی دیر لگا دی ہے۔''

''آ گیا ہوں بھئی۔ آ گیا ہوں۔ یہ لے۔'' سجاول کپڑے بدل کر آ گیا۔ دونوں نے کاکے کو خدا حافظ کیا اور دروازے سے باہر نکل آئے۔

دونوں کچھ دیر خاموشی سے ایک ساتھ چلتے رہے۔ سجاول کے دل میں کھدبدی ہو رہی تھی۔ یہ اچانک باس کو صبح سویرے کیا سوجھی تھی کہ وہ منہ اٹھائے۔ جیسے ناک کی سیدھ میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال بھی سلیقے سے جمے

ہوئے تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے سیٹی بجاتا ہوا چل رہا تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد سجاول پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''کیوں یار! کدھر کا ارادہ ہے؟''

وہ سیٹی بجاتے بجاتے رک گیا۔ ''بس یار! دعا کرو کہ جس مقصد سے جا رہا ہوں۔ وہ پورا ہو جائے؟''

''آمین!'' سجاول نے فوراً کہا۔ ''مگر پتہ تو چلے کہ بات کیا ہے؟''

''یار! ایک بندہ کام کا مل گیا ہے۔ پرانا یار ہے۔ اس کے ساتھ مل کر ذرا آج کچھ کام کی بات ہو جائے۔ میں نے سوچا۔ تمہیں بھی ملوا دوں۔ شاید میں اتنی جلدی نہ کرتا۔ مگر جمیو اور رجاں کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے۔ جوان پر کوئی آنچ آئے۔ میں اپنا راستہ سیدھا ہی کر لوں۔ تو ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔

''کیا کوئی کاروبار وغیرہ کرنے کا ارادہ ہے۔'' سجاول نے پوچھا۔

''دیکھتے ہیں اب کیا پروگرام بنتا ہے۔ فی الحال ملاقات تو کریں۔'' وہ لاابالی پن سے کہنے لگا۔

تھوڑی دیر میں وہ لاریوں کے اڈے پر تھے۔ دونوں بغیر کچھ کھائے پیئے چلے تھے۔ اس لئے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے اڈے پر ہی ایک فٹ پاتھ ہوٹل پر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ باس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سجاول سے کہا۔

''یار! تمہیں میرے حلیے میں کوئی فرق نظر آتا ہے۔''

سجاول نے اب غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بالوں کا انداز بدل لیا تھا۔ اور بڑی بڑی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ وہ پہلے کی نسبت کچھ بدلا ہوا تو نظر آتا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر پہچانا جا سکتا تھا۔ ''ہاں۔ تھوڑا فرق تو ہے مگر زیادہ نہیں۔ تمہیں ذرا خیال رکھنا چاہیے۔''

باس نے بے نیازی سے شانے جھٹکے۔ ''چھوڑو یار! جو دن سلاخوں کے اندر چڑھنا ہے۔ وہ تو چڑھنا ہی ہے۔ پھر کیا اپنی جان کو روگ لگائیں۔''

سجاول ہنس پڑا۔ ''واہ۔ تم نے تو فیصلہ ہی کر دیا یار۔ بس اب فکر کس بات کی۔''

انہیں پہلی ہی بس مل گئی۔ لیکن فاصلہ طویل تھا۔ منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے انہیں دوپہر ہو گئی۔ خاصے غیر آباد علاقے میں درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی ایک قدیم طرز کی حویلی نما عمارت میں وہ اترے تو دو ملازم لپک کر آئے۔ اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یوں معلوم

ہوتا تھا کہ وہ باس کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ جیسے وہ پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے۔

ملازم انہیں بجی سجائی بیٹھک میں لے گیا۔ انہوں نے ملحقہ غسلخانے میں منہ ہاتھ دھویا۔ تب تک وہ لوگ کھانا لے آئے۔ کھانا پرتکلف اور لذیذ تھا۔ ایک طویل سفر کے بعد انہیں خوب بھوک لگی تھی۔ دونوں رغبت سے کھانے لگے۔ ملازموں میں سے ایک پانی رکھنے آیا۔ تو باس نے پوچھا۔

''چودھری صاحب کہاں ہیں؟''

نیچے تہہ خانے میں۔ بازی لگی ہوئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کوئی اور بھی آیا ہوا ہے؟''

''ہاں جی کچھ مہمان اور بھی آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے آنکھ دبائی اور ذومعنی ہنسی کے ساتھ بولا۔

اسی وقت اچانک تابڑ توڑ دھماکوں کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے گولیاں چل رہی ہیں۔ باس نے ہاتھ سے نوالا رکھ دیا۔ سجاول بھی چوکنا ہو گیا۔ ملازم کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا اور وہ باہر بھاگا۔

سجاول اور باس بھی اٹھ کر دروازے کی طرف لپکے۔

باہر ایک نوجوان بدحواسی میں دوڑتا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور پگڑی کھل کر گلے میں آ پڑی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا متوحش لہجے میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

باس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟''

وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور بوکھلایا ہوا بولا۔

''کون ہو تم؟''

''آرام سے۔ آرام سے بتاؤ۔ یہ کیا ہوا ہے؟ گولیاں کس نے چلائی ہیں؟'' باس نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔

''خون ہو گیا ہے۔ قتل ہو گیا ہے۔ گولی چل گئی ہے۔ گولی۔'' وہ بے ربط انداز میں ہکلا کر بولا۔

''کون قتل ہو گیا ہے؟ کس نے گولی چلائی ہے؟'' باس نے اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر

سوال کیا۔

وہ کم عمر جوان تھا اور سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

''چودھری قتل ہو گیا ہے۔ چودھری۔ اور پتہ نہیں کس کس کو گولی لگی ہے۔ اوئے کوئی مجھے بتاؤ کہ اللہ بخش کدھر ہے۔ کدھر ہے اللہ بخش۔ اوئے اللہ بخشا۔'' وہ باس سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بدحواسی میں چلایا۔

باس نے پریشانی میں جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''چودھری قتل ہو گیا ہے۔'' اور اس شخص کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کرسی پر دھکیل دیا اور درشتی سے بولا۔

''بندہ بن۔ آرام سے بیٹھ۔ ادھر ادھر شور نہ مچاتا پھر۔ صحیح طرح بتا کہ کیا ہوا ہے؟''

''مجھے نہیں پتہ۔ مجھے کچھ نہیں پتہ۔ تم خود جا کر دیکھ لو۔ مجھے کیا پتہ۔'' وہ پریشانی میں جو منہ میں آتا تھا کہتا جا رہا تھا۔

''رنگو۔ وے رنگو۔ تو کدھر مر گیا ہے۔ موت جو گے۔'' دروازے میں سے ایک کرخت آواز نے پکارا۔

باس اور سجاول نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے میں ایک بھاری بھرکم عورت کا سیاہی مائل چہرہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ کالے برقعوں میں لپٹی۔ میک اپ سے لتھڑے چہرے لئے دو لڑکیاں بھی تھیں۔ جو گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

''وے رنگو ٹٹ پینے۔ تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ مرن جو گے۔ چل اٹھ۔ جلدی کر۔'' وہ غصے سے پیشانی پر بل ڈال کر بولی۔

''آیا بی بی! آیا'' لڑکے نے مستعدی سے کہا اور عجلت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

باس نے اسے پھر پکڑ کر بٹھا لیا۔ ''کیوں بھئی۔ تم موقع سے کہاں بھاگے جاتے ہو۔''

''کیوں بھئی۔ تم نے اسے کیوں بٹھا رکھا ہے۔ اس نے کون سا جرم کر دیا ہے۔'' اس عورت نے آگے بڑھ کر لڑکے کا بازو تھام کر اسے اٹھا لیا اور باس سے بولی۔

''ہمارا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ سمجھے تم۔ ہم تو یہاں ناچ گانا کرنے آئے تھے۔ جو ہمارا کام ہے۔ چودھری چودھریوں کے ساتھ۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔'' وہ اتنا کہہ کر لڑکے کو ہمراہ لے گئی۔

باس نے بھی اس کو روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ اس معاملے میں دخل

دیتا۔ سجاول نے اس کی طرف دیکھا۔

''یار! یہ کیا پسوڑی پڑ گئی ہے۔''

باس نے متاسفانہ انداز میں سر جھٹکا۔

''یہ تو سارا کھیل ہی بگڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں معاملہ کیا ہے۔ چل کر دیکھتے ہیں۔''

''دیکھنا یار! لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ پولیس کچہری کا معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے یہاں سے نکل چلو۔ ہمیں خوانخواہ دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔'' سجاول نے کہا۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ یہاں سے نکل ہی چلیں تو اچھا ہے۔'' باس بھی قائل ہو گیا۔

دونوں نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ بھاری بھرکم نائیکہ' دونوں لڑکیوں اور سازندوں کے ساتھ گرتی پڑتی حویلی کا صحن پار کر گئی تھی۔ ایک آدھ ملازم ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ مگر وہ بھی لگتا تھا۔ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہیں۔ سجاول نے پھر کہا۔

''چل یار! ہم بھی چلتے ہیں۔''

باس نے کچھ سوچا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تہہ خانے میں کیا واقعہ ہوا ہے اور کون مارا گیا ہے۔ پھر وہ چند قدم تہہ خانے کے دروازے کی طرف چلا۔ اور بولا۔

''یار! چودھری بندہ کام کا تھا۔ میرا خیال ہے۔ کچھ اس کا اتہ پتہ لے ہی لیتے ہیں۔ پولیس کو آنے میں تھوڑی دیر لگے گی۔''

''عقل سے کام لے یار!'' سجاول نے اس کا بازو پکڑا۔

''ابھی جو یہ میراثی گئے ہیں۔ کیا خیال ہے تیرا۔ ان کے منہ میں بات رہ جائے گی۔ یہ کسی نہ کسی طرح بات پولیس تک پہنچائیں گے۔ اب کوئی اعتبار نہیں پولیس کب پہنچ جائے۔ بس۔ تو نکل یہاں سے۔''

بات باس کی سمجھ میں بھی آ گئی اور وہ واپس پلٹا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی چیخیں مارتی ہوئی باہر نکلی۔ اس کے پیچھے پیچھے نشے میں دھت ایک آدمی تھا۔ جس کے ہاتھ میں اس کے دوپٹے کا ایک سرا تھا۔

''چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو۔'' لڑکی نے پلٹ کر اپنا دوپٹہ زور سے کھینچا۔ لیکن اس شخص نے نہیں چھوڑا۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں نہ جانے کیا اول فول بکتا اس کا آنچل کھینچنے لگا۔

باس نے دوڑ کر اسے دھکا دیا اور دوپٹہ اس کے ہاتھ سے چھین کر لڑکی کی طرف پھینک دیا۔ وہ شخص مغلظات بکتا ہوا۔ باس پر جھپٹا۔ لیکن نشے میں ہونے کی وجہ سے اس کے دو تین ہاتھ ہی سہہ سکا اور ڈھیر ہو گیا۔

لڑکی نے دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا تھا اور سہمی ہوئی سی کھڑی کانپ رہی تھی۔ سجاول نے اس کی طرف دیکھا اور بھونچکا سا رہ گیا۔ خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں اور دھلے ہوئے سپید کپڑے کی مانند سفید چہرے کو وہ اچھی طرح پہنچانتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر حیرت اور پریشانی سے کہا۔

''استانی نور! تو یہاں۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ باس بھی قریب آ گیا اور قدرے درشتی سے بولا۔

''لڑکی۔ یہ رونا دھونا ختم کر اور سیدھی طرح بتا تو یہاں کیا کر رہی تھی؟''

وہ ایک دم سہم کر خاموش ہو گئی اور سسکیاں روکتے ہوئے بولی۔

''پلیز۔ مجھے یہاں سے نکال دو۔'' آنسو اس کے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔

باس نے سجاول کی طرف دیکھا۔ ''تم جانتے ہو اس کو؟''

''یار! یہ گاؤں کے سکول میں استانی ہے۔ خوانخواہ چودھری کی باتوں میں آ کر خوار ہوئی ہے۔ میں نے تو اس کو سمجھایا تھا۔ مگر اس نے کسی کی نہیں سنی۔''

نور نے ہونٹ کاٹ کر اس کی طرف دیکھا اور غصے سے بولی۔

''تم خوانخواہ پتہ نہیں کیا بولے جا رہے ہو۔ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی۔ میں اپنے منگیتر کے ساتھ شہر جا رہی تھی۔ کہ چودھری کے بندوں نے مجھے زبردستی اٹھا لیا۔ دلشاد کو بھی گولی لگی تھی۔ پتہ نہیں اس کا کیا بنا۔ انہوں نے تو مجھے یہاں قید کیا ہوا تھا۔'' وہ بات کرتے کرتے ایک بار پھر رو پڑی۔

اور اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ لیکن سجاول کی سمجھ میں دلشاد کے قتل کا معمہ بھی آ گیا۔ اس نے استانی نور سے اس کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ دلشاد قتل ہو گیا ہے۔ وہ پہلے ہی بے حد پریشان اور ڈری ہوئی تھی۔ یہ خبر سن کر نہ جانے اس پر کیا گزرے۔ اس نے عام سے لہجے میں عجلت سے کہا۔

"اچھا۔ یہ رونا دھونا ختم کرو۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔ جلدی سے بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔"

نور نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور بے ساختہ بولی۔

"دلشاد ہاں۔ تم مجھے دلشاد کے پاس ہی پہنچا دو۔" لیکن پھر اس نے سر جھٹکا اور پریشانی سے بولی۔

"پتہ نہیں۔ پتہ نہیں وہ مجھے قبول بھی کرے گا یا نہیں۔ پتہ نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا۔"

سجاول کو افسوس سا ہوا۔ اب جبکہ اس کے اور دلشاد کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ دلشاد ہی دنیا میں نہیں رہا تھا اور وہ اس سے بے خبر تھی۔ اس نے بات ختم کرنے کو کہا۔

"اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے یا اسے تمہارا ذرا سا بھی خیال ہے۔ تو وہ کچھ نہیں کہے گا۔"

"یار! تم اس قصے کو چھوڑو کہ کون کیا کہے گا۔ بس یہاں سے نکلو۔ اب تو یہ لڑکی بھی ساتھ ہے۔ اور مشکل ہو گی۔" باس نے اسے ٹوکا۔

نور نے باری باری سر اٹھا کر ان دونوں کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ اسے یہاں چھوڑ نہ جائیں۔ باس نے ادھر ادھر دیکھ کر پلنگ پر سے بستر کی چادر اٹھائی اور نور کی طرف بڑھا کر بولا۔

"یہ چادر اچھی طرح سے اوڑھ لو۔ تمہارے یہ کپڑے وغیرہ نظر نہ آئیں۔ راستے میں کسی نے کچھ پوچھا۔ تو تم جواب نہ دینا۔ یوں ظاہر کرنا۔ جیسے گونگی ہو۔ اچھا۔"

نور نے اثبات میں سر ہلایا اور چادر کھول کر اسے اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹنے لگی۔

باس نے کھڑکی کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ صحن میں سناٹا چھایا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چودھری کے سب نوکر چاکر غائب ہو گئے تھے۔ وہ پچھواڑے کی طرف سے نکلے اور وہ راستہ اختیار کیا جس طرف خودرو جھاڑیاں اور اکا دکا درخت تھے۔

باس پہلے بھی اس جگہ آ چکا تھا۔ اس لئے وہ راستوں سے کچھ واقف معلوم ہوتا تھا۔ یہاں سے بس لینے کیلئے انہیں پیدل سفر کرنا تھا۔ گاؤں کی آبادی سے دور چودھری کی زمینوں کا ایک سرسبز ٹکڑا تھا۔ جس میں اس نے رنگ و نور کی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ اس طرف عام لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ اور یہ راستہ دوسرے راستے کی نسبت کچھ لمبا بھی زیادہ تھا۔ مگر اس

طرف یہ اندیشہ نہیں تھا کہ کسی سے سامنا ہو جائے گا۔

وہ دونوں تیز چل رہے تھے۔ نور کو ان کا ساتھ دینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ مگر وہ جیسے تیسے ان کے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔

"یار! چودھری ویسے اچھا آدمی تھا۔ کام کا بندہ تھا۔ مجھے اس سے بڑی امیدیں تھیں۔" باس نے چلتے چلتے کہا۔

سجاول نے اس کی طرف دیکھا۔ "یار! اگر تجھے اس کی کرتوتوں کا پتہ چل جائے۔ تو میرا خیال ہے۔ تو ایسا کبھی نہ کہے۔"

"کیا مطلب؟" باس بولا۔ "یار یہ چودھری، زمیندار ایسی حرکتیں نہ کریں۔ تو انہیں چودھری کون کہے؟"

"خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ آپ ہی ایسا انصاف کر دیتا ہے کہ بس۔" سجاول نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"لگتا ہے تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔" باس نے کہا۔

"نہیں اتنا تو نہیں جانتا۔ مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ شخص اپنی بیوی کا بھی مجرم تھا۔ اس کو اس نے سسکا سسکا کر مارا ہے۔ یہ اس لڑکی کا بھی مجرم ہے۔ اس نے اسے ورغلایا۔ اور جس دلشاد کو گولی لگنے کا یہ ذکر کر رہی ہے نا۔ جو اس کا منگیتر تھا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں بتایا۔ اور یار باس۔ تمہیں شاید پتہ نہیں۔ یہ تمہارا بھی مجرم تھا۔"

"میرا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں تمہارا۔ رجاں بہن کو اس کے آدمیوں نے ہی اغوا کر کے یرغمال بنایا تھا۔"

"اوہ۔" باس نے اذیت سے ہونٹ چبائے۔ اور کچھ دیر اس کے منہ سے ایک حرف بھی نہیں نکلا۔ وہ خاموشی سے چپ چاپ چلتے چلے گئے۔

سورج شفق کی سرخی چھوڑ کر غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا پھیلنے ہی والا تھا۔ سجاول اس طرف کے راستے سے واقف نہیں تھا۔ نہ ہی اسے اندازہ تھا کہ بس کہاں سے ملے گی۔ اس نے یونہی بات کرنے کی خاطر باس سے پوچھا۔

"یار! ابھی اڈا کتنی دور ہے؟ کچھ اندازہ ہے؟"

"اگر ہم صحیح سمت میں چل رہے ہیں۔ تو آدھا گھنٹہ اور لگنا چاہیے۔" باس نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں جواب دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔

''چلو۔ پھر تو خیر ہے۔ یہ سفر بھی کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جائے گا۔'' سجاول بولا۔

''ہاں!'' باس نے پیچھے مڑ کر کچھ فاصلے پر چلتی ہوئی نور کی طرف دیکھا۔'' اس لڑکی کے لئے ذرا مشکل ہو گی اتنا چلنے میں۔''

''چلو آہستہ آہستہ۔ وہ بھی ساتھ دے ہی رہی ہے۔'' سجاول نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''اسے لے کر کہاں جائیں گے۔'' باس نے پوچھا۔

''ابھی تو کا کے کی طرف ہی چلتے ہیں۔''

''نہیں یار! میرا خیال ہے۔ اسے لہر کی طرف لے جائیں۔ وہاں آپا رجاں بھی ہے۔ چھیمو اور دادا ہے۔ کا کا تو چھڑا چھانٹ ہے۔ اس کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔'' باس نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

سجاول کو بھی اس کی بات معقول معلوم ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر اسے دلشاد کے قتل کے بارے میں بتا دے گا۔ پھر وہ جہاں جانا چاہے گی۔ وہ خود فیصلہ کرے گی۔

اندھیرا شفق میں گھل مل کر شام کو ملگجا رنگ دینے لگا۔ خودرو جھاڑیوں کے سلسلے اب کم ہونے لگے تھے۔ دور سے اندھیرے میں ڈھکے ہوئے کھیت سایوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ویرانہ رفتہ رفتہ آبادی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ دن بھر کی بے آرامی اور پیدل چلنے کی مشقت نے انہیں تھکاوٹ سے لاد دیا تھا۔ نور بھی بمشکل اپنے پاؤں گھسیٹ رہی تھی۔ دور سے انہیں ایک تنور والی کا تنور روشن نظر آ رہا تھا۔ تازہ پکتی ہوئی گرم روٹیوں کی خوشبو نے انہیں بھوک کا احساس دلا دیا۔

دوپہر کو بھی انہوں نے ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ سجاول نے ارادہ کیا کہ دوڑ کر کھانا لے آئے۔ لیکن باس نے اسے روک کر دوسری طرف متوجہ کیا۔ دور سے آتی ہوئی ویگن کی روشنیاں اسی جانب بڑھ رہی تھیں۔

''شاید یہ اس طرف آنے والی آخری ویگن ہو۔ اب کھانے کا خیال چھوڑ دو۔''

''ٹھیک ہے یار! میں نے تو سوچا تھا کہ چلو وقت ہی گزر جائے۔ ویسے بھی پیدل چل چل کر معدہ خالی ہو گیا ہے۔''

تب تک ویگن نزدیک آ گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی اس میں سوار ہوئے اور منزل تک پہنچنے کی آس میں مطمئن ہو بیٹھے۔ لیکن ویگن آدھے راستے میں خراب ہو گئی۔ وہ بھوکے پیٹ

بیٹھے۔ اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ خدا خدا کر کے وہ کہیں ٹھیک ہوئی۔ جب وہ اڈے پر پہنچے تو صبح ہو گئی تھی۔

انہوں نے وہیں ایک تنور نما ہوٹل سے ناشتہ کیا اور گاؤں تک جانے والی ایک ویگن میں سوار ہو گئے۔ ویگن میں آدھی سے زیادہ نشستیں خالی تھیں۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر ان کے بھرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ نور اپنے گرد چادر لپیٹے باس کے برابر والی نشست پر بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے راستہ بھر ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا اور اس وقت بھی بالکل خاموش تھی۔

اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سجاول نے یونہی اپنے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف دیکھا۔ اسی وقت اس نے بھی سجاول کی طرف دیکھا اور اسے یوں سلام کیا جیسے اس کا شناسا ہو۔

سجاول نے اس کے سلام کا جواب تو دے دیا۔ لیکن اسے پہچان نہیں پایا۔ اس کو بھی غالباً اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ اور مسکرا کر بولا۔

''آپ نے شاید پہچانا نہیں۔''

سجاول کچھ خفیف سا ہو گیا۔ ''جی ہاں۔ بس کچھ یاد نہیں آ رہا۔''

''جی ہاں۔ آپ نے تو شاید ہمیں نہ دیکھا ہو۔ پر ہم نے آپ کو نیلم بائی کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔'' اس نے آواز مدھم کی۔

''آپ تو نیلم جی کے بڑے منظور نظر ہیں۔''

سجاول نے یوں ظاہر کیا۔ جیسے اس نے اس کی بات سنی نہیں اور یونہی بات بدلنے کو بولا۔

''کیا حال ہیں آپ کے۔ سب ٹھیک ہے نا۔''

''ٹھیک کیا ہونا ہے جی۔ نیلم بائی کے دم سے تو سب بہاریں تھیں۔ اسی کی تو رونقیں تھیں۔ پر۔'' اس نے تاسف کے اظہار میں منہ سے چچ چچ کی آواز نکالی۔

سجاول چونک گیا۔ ''کیوں؟ کیا ہوا۔ خیریت تو ہے۔''

''کیوں جی۔ آپ کو نہیں معلوم؟''

''کیا؟'' سجاول کے اندر کھد بد سی ہونے لگی۔

''نیلم بائی کے زخمی ہونے کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں معلوم؟''

''زخمی!'' سجاول نے دوہرایا۔

''لیکن کیسے؟''

''اوہو!'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''حالت ٹھیک نہیں اس کی۔ اللہ ہی ہے۔ جو اپنا کرم کرے۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''تیزاب پھینک دیا جی کسی نے اس پر۔ پتہ ہی نہیں چل رہا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ پر جی اب پتہ چل بھی جائے تو کیا فائدہ۔ بچاری نیلم بائی تو کسی کام کی نہ رہی جی۔ بچ بھی گئی۔ تو کیا زندگی گزارے گی۔ ہائے ہائے!''

سجاول کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اس کی روح میں کہیں کوئی ٹیس سی اٹھی۔ اسے نیلم کا پھول سا حسین چہرہ اور ستارہ سی آنکھیں یاد آئیں۔ اس کے اندر ایک تڑپ سی جاگی۔ اس نے کبھی نیلم کے وجود اس کے جذبوں اور اس کی باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن اس کے بارے میں یہ بری خبر سن کر اس کا دل بڑی شدت سے چاہنے لگا تھا کہ وہ اس سے ملے۔ اسے دیکھے۔ اسے تسلی دے۔ اس کا حوصلہ بڑھائے۔

یہ خیال اس کے سارے وجود میں اس تیزی کے ساتھ اٹھا۔ کہ وہ اسے رد نہیں کر سکا۔ اس نے پیچھے گھوم کر باس کی طرف دیکھا۔

''یار! میں ذرا جا رہا ہوں۔ تم گھر پہنچو۔ میں شام تک آ جاؤں گا۔''

''کیوں؟ خیریت۔!!'' باس نے سوال کیا۔

''ہاں۔ بس خیریت ہی سمجھو۔'' سجاول نے اٹھتے ہوئے کہا۔

باس جو غالباً اس شخص سے ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''میری طرف سے بھی پوچھنا۔'' سجاول نے اثبات میں سر ہلایا اور ویگن سے نیچے اتر گیا۔

O......O......O

ہوسپٹل میں نیلم کے نرم و نازک وجود کو سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوا دیکھ کر اسے اس کی حالت کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ یہ نیلم پر کیا قیامت گزر گئی تھی۔ زندگی نے اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

وہ بیڈ پر بالکل چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پاس کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ جو اسے دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کون ہے؟'' نیلم نے مدھم سی نقاہت آلود آواز میں کہا۔

''میں ہوں سجاول!'' سجاول افسردہ سا اس کے بیڈ کے قریب جا کر بولا۔

''اوہو!'' اس کے ہونٹوں سے کرب میں ڈوبی ہوئی ایک صدا نکلی۔ اس نے ہلنے کی کوشش کی۔ لیکن زخموں نے اسے ہلنے نہیں دیا۔ وہ ٹوٹے ہوئے سے لہجے میں بے چارگی سے بولی۔

''سجاول! دیکھو میرا کیا حال ہو گیا ہے؟''

''حوصلہ نہ ہارو نیلم! تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ فکر نہ کرو۔'' سجاول نے اس کے پٹیوں سے ڈھکے ہوئے ہاتھ کو چھو کر کہا۔

''نہیں سجاول! اب میں نہیں بچوں گی۔ میں تو کب کی مر چکی ہوتی۔ میں تو صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔''

''اس طرح نہ کہو نیلم! ہمت سے کام لو۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم......''

''سجاول!'' اس کی آواز جیسے بہت دور سے ابھری۔ ''تم میری ایک بات سن لو۔ اکاش میں نے یہ سب تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ تو تمہیں تمہاری بہن مل جاتی۔ لیکن۔ لیکن سجاول۔ میں ڈرتی تھی۔ کہیں تم کچھ کر نہ بیٹھو۔'' اتنی سی بات کہنے میں وہ بری طرح ہانپ گئی۔ اس کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی۔

سجاول جیسے خشک پتے کی طرح طوفان کی زد میں آ گیا۔ نیلم کے ان لفظوں نے اسے انگاروں پر کھڑا کر دیا۔ اسے اپنی سماعت پر دھوکا ہوا کہ شاید اس نے صحیح طور پر نہیں سنا۔ یا وہ بیماری کی شدت میں بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ مگر وہ اس کی بہن کا نام کیوں لے رہی تھی۔ وہ اس کا تذکرہ کیوں کر رہی ہے۔

وہ خود پر قابو پا کر اس پر جھکا۔ ”نیلم! نیلم! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

نیلم کی جھپکتی ہوئی آنکھیں نیم وا سی ہو گئیں۔ اور تکیے پر رکھا ہوا اس کا سر ایک جانب ڈھلک سا گیا۔ سجاول نے گھبراہٹ میں اسے ہاتھوں سے چھوا۔ لیکن وہ بے سدھ ہو گئی۔

سجاول نے بے چینی سے اسے دو تین مرتبہ پکارا۔ لیکن وہ اسی طرح بے دم سی پڑی رہی۔ سجاول کے انگ انگ میں بیتابیاں جاگ اٹھیں۔ وہ نہ جانے اس کی بہن کے بارے میں کیا کہنے والی تھی کہ نقاہت نے اس کی زبان پر قفل ڈال دیئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ اس کا زخمی چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور سانس رک رک کر چل رہا تھا۔

سجاول دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آیا۔ وہی لڑکی جو نیلم کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ ایک عورت سے کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ سجاول کو دیکھ کر وہ سمجھی کہ شاید وہ جا رہا ہے۔ اس عورت سے کچھ کہہ کر وہ کمرے کی طرف چلی۔

سجاول نے اسے راستے میں ہی روک لیا۔

”چل کر دیکھو ذرا۔ نیلم شاید بے ہوش ہو گئی ہے۔“ کسی نرس یا ڈاکٹر سے کہو۔

”ہا۔ ہائے۔“ اس نے بے ساختہ کہا اور اس کے برابر چلتی ہوئی بولی۔

”وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ نے اس سے زیادہ باتیں کی ہوں گی۔ تو وہ تھک گئی ہے۔ اللہ رحم کرے بچاری پر بہت برا وقت پڑا ہے۔“

سجاول کچھ بھی نہیں بولا۔ تجسس اور بے چینی نے جیسے اسے آدھ موا سا کر دیا تھا۔ وہ جیسے تپتے ہوئے صحرا میں برہنہ پا سا ہو گیا تھا۔ نیلم کی اس ادھوری بات نے اسے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ کاش وہ چند لفظ اور کہہ گئی ہوتی۔

اس لڑکی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوا۔ نیلم ابھی تک بے سدھ سی پڑی تھی۔ لڑکی نے جھک کر اسے پکارا۔

”آپا! آپا! نیلم آپا!“

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لڑکی نے میز پر سے کوئی شیشی اٹھا کر اسے سونگھائی۔ تو اس کے وجود میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ اس نے چمچے کے ساتھ کوئی جوس اس کے منہ میں ڈالا۔ سجاول کچھ دور کھڑا بے چینی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔

”سجاول کہاں ہے؟ سجاول! وہ کہیں چلا تو نہیں گیا۔“ اس کی نقاہت آلود آواز ڈوبتے ابھرتے سنائی دی۔

لڑکی نے پلٹ کر سجاول کی طرف دیکھا۔

”شاید آپ کو پوچھ رہی ہے۔“ سجاول ایک قدم آگے بڑھا۔ تو وہ بولی۔

”بھائی جان! ذرا باتیں کم ہی کریں۔ یہ اس کے لئے اچھا نہیں۔“

سجاول نے اسے اشارے سے یقین دلایا کہ وہ کوشش کرے گا۔ وہ پھر کمرے سے نکل گئی۔ سجاول تیزی سے اس کے پلنگ کے نزدیک پہنچا اور اپنی بیتابی کو چھپاتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے نیلم!؟ میں آ گیا ہوں۔“

”سجاول! مجھے معاف کر دینا۔ میں یہ سب تمہیں اس وقت نہیں بتا سکی۔ جب مجھے بتانا چاہیے تھا۔“ اس کے لہجے میں دکھ گھلے ہوئے تھے۔

”پتہ نہیں اس وقت میری زبان پر تالے کیوں پڑ گئے تھے۔ جب تم۔ جب تم!“ اس نے اک آہ سی بھری۔

”اسے خود کوٹھے پر چھوڑ گئے تھے۔ جس کی تلاش میں تم مارے مارے پھرتے تھے۔“

”کون......؟؟ کون؟؟“ سجاول نے سر جھٹک کر یوں کہا۔ جیسے سمجھ آ جانے والی بات کو سمجھنا نہ چاہتا ہو۔

”وہی نصیبوں جلی بخت آور۔ سجاول وہ تمہاری بہن بھاگ بھری ہے۔“ یہ لفظ نہیں تھے۔ پگھلا ہوا سیسہ تھا۔ جو اس کی سماعت میں اتر گیا تھا۔

”او خدایا!“ وہ شدید کرب کے عالم میں پکارا۔ اور اپنے بال نوچتا ہوا بولا۔

”یہ سب کیا ہو گیا ہے؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟ یہ کیوں ہو گیا؟“ وہ پچھتاوے اور ملال کے عذاب میں گھر اپنی انگلیاں چبانے لگا۔

”سجاول! سجاول! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں یہ پہلے نہیں بتا سکی۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بار بار کہہ رہی تھی۔

لیکن سجاول کو گردوپیش کی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ جیسے جیسے بخت آور کے بارے میں سوچتا تھا۔ اسے اس کے خدوخال میں بھاگ بھری کا چہرہ نظر آتا تھا۔ معاً اسے یاد آیا کہ بخت آور نے تو روشن کے ساتھ کاکے کے گھر پناہ لے رکھی تھی۔"

اس خیال نے اسے جیسے نئی زندگی دے دی۔ اس کی بہن ابھی اس کی دسترس میں تھی۔ وہ اسے پناہ میں لے سکتا تھا۔ وہ اس کے دکھوں کا مداوا کر سکتا تھا۔ وہ اسے زمانے کی چیرہ دستیوں سے بچا سکتا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک نیا جوش اور نیا ولولہ امنڈنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی زندگی آج اور اسی لمحے سے شروع ہو رہی ہے۔

اس نے پلٹ کر نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ اس کے بیڈ کے نزدیک آیا۔ تو وہ بولی۔ "سجاول! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری قصوروار ہوں۔"

"تمہیں کیسے پتہ ہے کہ بخت آور ہی بھاگ بھری ہے؟" سجاول نے یقین کرنے کو پوچھا۔

"اس نے مجھے خود بتایا تھا۔ اس نے مجھے اپنی ساری کہانی سنائی تھی۔ اسے یہاں وہ لڑکی زیبو بھی مل گئی تھی۔ جسے تمہارے بھائی نے اس کے منگیتر کے ساتھ فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ جس کی وجہ سے زمیندار تمہارے دشمن بنے تھے اور انہوں نے بھاگ بھری کو اغوا کروایا تھا۔"

"بس۔ بس۔ میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے۔" سجاول نے جوش سے کہا اور چلنے کے لئے مڑا۔

"سجاول! تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟" نیلم نے پریشانی سے کہا۔

"مجھے پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے؟ میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے بہت جلدی ہے۔ میں فوراً وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ پھر ایک بار قریب آ کر دور نہ ہو جائے۔"

نیلم نے شاید اسے پکارا۔ یا نہ جانے کیا کہا۔ لیکن سجاول کو کچھ بھی سننے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ پلک جھپکتے میں بخت آور کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ نیلم کو خدا حافظ کہتا ہوا۔ تیزی کے ساتھ ہوسپٹل کے اس کمرے سے نکلا اور بسوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

کاکے کے گھر تک کا سفر بے چینی اور بیقراری کا سفر تھا۔ ایک ایک لمحہ جیسے پوری صدی بن کر اس پر سے گزر رہا تھا۔ فاصلے تھے کہ سمٹنے میں نہیں آتے تھے۔ اس کا بس نہیں چلتا

تھا کہ پلک جھپکتے میں کاکے کے یہاں پہنچ جائے۔ جہاں اس کی دکھیا بہن نے زمانے کی چیرہ دستیوں سے بھاگ کر پناہ لے رکھی تھی۔ جس طرح وہ اس کی تلاش میں جگہ جگہ بھٹکتا پھرتا تھا۔ اسی طرح وہ بھی عزت کی زندگی کی بھیک لینے کو در در کی ٹھوکریں کھاتی رہی تھی۔ سختیوں کے دن بیتنے والے تھے۔ تقدیر کی گردشیں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں دشوار گزار راستوں پر سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک چھت تلے آن جمع ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار سچی مسرت سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ اپنے لہو کا ذائقہ' اپنے سگے رشتوں کی حلاوت وہ پہلی بار محسوس کرنے والا تھا۔

اس نے کاکے کے دروازے پر دستک دی۔ تو اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس دروازے کے پار اس کی عمر بھر کی تلاش کا نقطۂ اختتام' اس کے خون کا رنگ اور اس کے رشتوں کی باس تھی۔ وہ اپنی آنکھوں میں آنے والے لمحوں کی آس جگائے۔ کاکے کے دروازے پر دستک دیتا چلا گیا۔

کاکے نے دروازہ کھولا۔ تو وہ یوں اندر داخل ہوا۔ جیسے کاکے کو دیکھا ہی نہ ہو۔

"اوئے اوئے یار! کہیں پولیس تو تیرے پیچھے نہیں لگی ہوئی۔" اس نے ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگانے کی کوشش کی۔

سجاول بس یونہی سا اس کے گلے سے لگا اور چھوٹتے ہی بولا۔

"یار! وہ بخت آور۔ میرا مطلب ہے۔ وہ نصیبہ اور روشن دونوں یہیں ہیں نا؟"

"یہ تمہیں آتے ہی ان دونوں کی کیا پڑ گئی ہے۔ خیر تو ہے۔" کاکا اپنی مخصوص خوش مزاجی سے پوچھنے لگا۔

"ہاں۔ سب خیر ہے یار! تم بتاؤ تو سہی۔ وہ دونوں یہیں ہیں نا۔"

"نہیں۔ وہ تو چلے گئے ہیں۔ اسی دن رات کے وقت انہیں بڑی مشکل سے نکالا۔ تم تو صبح صبح ہی چلے گئے تھے۔ بعد میں تھیٹر والوں نے تو ہنگامہ مچا لیا۔ وہ چودھری اور نمبردار کو ساتھ لے کر گھر گھر تلاشی کرانے لگے۔ خیر وہ وقت تو کسی نہ کسی طرح نکالا۔ لیکن نصیبہ بہت گھبرا گئی۔ اس نے روشن کو بھی پریشان کر دیا۔ بس رات میں نے انہیں اپنی گڈ پر بٹھایا۔ اوپر ڈالا بھوسہ اور انہیں اگلے اڈے تک چھوڑ آیا۔"

"تمہیں کچھ پتہ ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ وہ کہاں جانا چاہتے تھے؟" سجاول نے اس کی بات کاٹ کر بیتابی سے سوال کیا۔

"نہیں۔ انہوں نے کچھ بتایا نہیں۔" کاکے نے کہا۔

"مگر یار آخر ایسی کیا مصیبت پڑ گئی ہے تمہیں۔ جوان کا اس طرح پوچھ رہے ہو؟"

سجاول کا جی چاہا کہ اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لے۔ سب کچھ خاک میں مل گیا تھا۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ سب جل کر خاکستر ہو گیا۔ بھاگ بھری اس قدر قریب سے گزر کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وقت کس طرح سے اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

"سجاول یار! آرام سے بیٹھ جاؤ۔ مجھے ٹھیک طرح سے بتاؤ کہ تم انہیں کیوں ڈھونڈنا چاہتے ہو۔ پھر مل بیٹھ کر سوچتے ہیں کچھ۔" کاکے نے اس کی بے چینی دیکھ کر ملائمیت سے کہا۔

سجاول نے سر جھٹکا اور ناامیدی سے بولا۔

"یار! مل بیٹھ کر کیا سوچنا ہے۔ تمہیں پتہ جو نہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"یار! ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ کبھی نہ کبھی تو مل جائیں گے۔ ہم کوشش کرتے رہیں گے۔ دیکھتے رہیں گے۔" تو اتنا پریشان کیوں ہوتا ہے۔ اس نے بڑے عزم سے کہا۔

لیکن سجاول کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ وہ ابھی اور اسی لمحے اس کی تلاش میں نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے پھر کاکے سے کہا۔ "یار کاکے! کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہو۔ تو میں ابھی ان کے پیچھے نکل جاؤں۔"

"یار یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والا کام تو نہیں ہے۔ تھوڑا صبر و تحمل سے کام لینا پڑے گا۔ تم کچھ کھا پی لو۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔ میں تو جگہ جگہ پھرتا ہوں۔ کہیں سے کوئی سن گن مل ہی جائے گی۔"

"پائیا! او پائیا۔" صحن کی جانب سے لہر کی آواز سنائی دی۔

"آ گئی مرجانی۔" کاکا دودھ کا برتن اٹھا کر باہر نکلا۔

سجاول بھی اس کے ساتھ صحن میں آ گیا کہ باس اور نور کے بارے میں اس سے کچھ معلوم کرے۔ وہ بہار کے نوشگفتہ پھول کی طرح آنگن میں کھڑی تھی۔ سجاول کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے سلام کیا اور جلدی سے پوچھنے لگی۔

"پائیا! تیرا دوست کدھر ہے؟"

"کون دوست؟" سجاول نے پوچھا۔

"قدیر اور کون۔ بھائی کاکے نے بتایا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ گیا تھا۔ وہ بھی آیا ہے؟" اس کے انداز میں سو ارمان جھلکتے تھے۔

سجاول کچھ حیران سا ہوا۔ باس تو اسی وقت گاؤں روانہ ہو گیا تھا۔ جب وہ نیلم کو دیکھنے کیلئے وہیں رک گیا تھا۔ اب تک تو اسے گاؤں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ سجاول کے دل میں شک سا بیٹھ گیا کہ نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ اب تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ مشکوک آدمی تھا اور اس کے ساتھ نور بھی تھی۔ کہیں وہ کسی پریشانی میں نہ الجھ گیا ہو۔ یہی سوچ کر اس نے بات بنائی تاکہ جب تک وہ خود کوئی تصدیق نہ کرے۔ وہ لوگ کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔

"وہ کسی کام سے شہر رک گیا ہے۔ کچھ دن لگ جائیں گے اسے۔"

لہر کا پھول سا چہرہ مرجھا گیا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔ اور پاؤں زمین پر مار کر ناراضگی سے بولی۔

"اونہہ۔ اس کے تو کام ہی ختم نہیں ہوتے۔ بڑا آیا کاما کہیں کا۔"

کاکا اس کے چڑ جانے پر محظوظ ہو کر اسے چھیڑنے لگا۔ لیکن سجاول کا دل اندیشوں سے لرز گیا۔ اس کے اندر یہی وسوسہ بار بار کسی سانپ کی طرح پھن پھیلانے لگا کہ اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ پیش آ گیا ہو۔ لہر کے مرجھائے ہوئے چہرے نے اسے بھی مغموم سا کر دیا۔ اس نے پھر اس کی تسلی کیلئے کہا۔

"گھر جا کر بابے اور رجاں کو بھی بتا دینا کہ وہ کسی کام سے شہر رک گیا ہے۔ اسے کچھ دیر لگ جائے گی۔ فکر نہ کریں۔"

"اونہہ۔ فکر نہ کریں۔" لہر نے جل کر فقرہ دوہرایا۔

"اس کا کیا جاتا ہے۔ چاہے کوئی مرے یا جیئے۔ اسے تو بس اپنی پڑی ہے۔" کاکا اسے پھر چھیڑنے اور چڑانے لگا۔ لیکن سجاول ایک نئی چکرا دینے والی سوچ میں گھرا اندر چلا آیا۔

ابھی وہ بھاگ بھری کے ایک بار پھر کھو جانے کی قیامت کو نہیں سہہ پایا تھا کہ یہ ایک اور عذاب اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ بھاگ بھری اپنی ایک جھلک دکھا کر اس کے اندر بیتابیوں کے الاؤ روشن کر گئی تھی۔ اس پر باس کی فکر اس کی جان کا روگ بن گئی تھی۔ بھاگ بھری کی تلاش میں کسی جانب نکلنے سے پہلے وہ باس کو ڈھونڈتا پھرا۔ وہ استانی نور کے اسکول بھی گیا اور دلشاد

کی حویلی بھی۔ اس کو خدشہ تھا کہ شاید نورا سے ادھر ادھر نہ لے گئی ہو۔ لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔

یہ اندیشہ بھی اسے پریشان کر رہا تھا کہ راستے میں اسے کوئی حادثہ نہ پیش آیا ہو۔ یہی شبہ دور کرنے کیلئے وہ ویگن کے اڈے بھی گیا۔ یہ سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ پچھلے دنوں ایک ویگن حادثے میں اس بری طرح تباہ ہوئی تھی کہ مسافروں کی لاشیں بھی شناخت کے قابل نہیں رہی تھیں۔

کچھ لاشوں کے وارث تو انہیں کسی نہ کسی طرح شناخت کر کے لے گئے تھے۔ مگر ایک عورت اور مرد کی لاش لاوارث قرار دے کر دفن کر دی گئی تھیں۔ انہوں نے سجاول کو مسافروں کی کچھ چیزیں بھی دکھائیں۔ جن میں سجاول نے باس کی دھات کی انگوٹھی پہچان لی۔

اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اسے یقین کرنا محال ہو گیا کہ ہنستا کھیلتا' نئی زندگی گزارنے کے منصوبے بناتا باس یوں ایکدم پیوند خاک ہو گیا تھا۔ شاید وہ اسی لئے اس ویگن سے اتر آیا تھا کہ بوڑھے گورکن اور رجاں کو یہ منحوس خبر سنانے کے لئے زندہ رہے۔

اسے لہر کا خیال بھی آیا۔ جس نے اپنے معصوم جذبوں کے سارے حسن کو باس کے نام کر رکھا تھا۔ لیکن وہ ان جذبوں کے حسن سے بے خبر ہی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ وہ لہر کی خوبصورت آنکھوں کے بیتاب سوالوں کا کیا جواب دے گا۔

وہ لرز کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس دنیا سے ناطہ توڑ کر کسی اور دنیا میں جا بسے۔ جہاں اس دنیا کی الجھنیں' تفکرات اور غم نہ ہوں۔ وہ حالات کی ستم ظریفی سے حیران کھڑا اندر ہی اندر ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

اس نے رجاں کو بہن کہا تھا۔ جیمو نے اسے رشتوں کے نرم گرم ذائقوں سے آشنا کیا تھا۔ زندگی کے دامن پر سے محبت سے محرومی کا داغ اس کے معصوم پیار نے دھو دیا تھا۔ بوڑھے گورکن نے اسے اس وقت پناہ دی تھی۔ جب وہ موسموں کی سختی میں بے سائباں کھڑا تھا۔ وہ ان سب کو کس طرح بے سہارا ہو جانے کی اندوہناک خبر سنائے گا۔ انہوں نے جو کھویا ہوا رشتہ برسوں کی ریاضت کے بعد پایا تھا۔ کس طرح اس کے ہمیشہ کیلئے کھو جانے کی منحوس خبر انہیں دے گا۔

اس پریشانی نے اسے کچھ دیر کیلئے بھاگ بھری کا خیال بھلا دیا تھا۔ وہ گھر آیا۔ تو کاکا اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ محبت سے اس کا بازو تھام کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا اور اس سے روٹی پانی کا پوچھنے لگا۔

سجاول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ بجلی کی سی سرعت سے ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اور لمحے بھر کو اسے سنبھالا دے گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے تفکرات کا بوجھ اس کے ذہن سے ہٹ گیا ہے۔ اس نے پھر کاکے کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا ہی رہا۔

"کیا بات ہے سجاول! اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟"

سجاول نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یار۔ تم نے مجھے اپنا بھائی کہا ہے نا؟"

"کیوں؟ تمہیں کوئی شک ہے۔" کاکے نے اپنے شانے پہ رکھے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"یار! میری ایک بات مانو گے۔" سجاول نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ایک کیا۔ یار تو سو باتیں کہہ۔ تو جان مانگ کر دیکھ۔" وہ یقین سے بولا۔

سجاول چند لمحے لفظوں کو اپنے منہ میں ہی تولتا رہا۔ پھر اچانک کہنے لگا۔

"یار! اگر میں کہوں کہ تو بیاہ کر لے تو؟"

"شادی۔" وہ ہنس پڑا۔

"یار یہ بیاہ شادی کا کونسا موقع ہے۔"

"بس ہے نا یار۔ اگر تو ہاں کر دے۔ تو میں ساری عمر تیرا احسان مند رہوں گا۔" سجاول نے رسان سے کہا۔

"احسان کیسا یار! تو حکم کر حکم!" وہ بولا

سجاول کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے کاکے کا ہاتھ تھام لیا۔

"یار کاکے۔ میں بھائی ہو کر اپنی بہن کیلئے تیرے سامنے جھولی پھیلا رہا ہوں۔"

"تیری بہن!" وہ سوچنے لگا۔

"یار! میں نے رجاں کو بہن کہا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ اس کو کوئی سہارا مل جائے۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ بیچاری نے بڑے دکھ سہے ہیں۔ بڑے غم اٹھائے ہیں۔ کچھ دن سکھ کے وہ بھی دیکھ لے۔ اگر تجھے منظور ہو۔ تو میں......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن یار! اس کا بھائی؟" وہ بولا۔

''اسی نے تو مجھ سے بات کہی ہے۔ اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا۔ پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ وہ جلدی میں ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ وہ اپنی بہن اور بابے کو میرے حوالے کر گیا ہے۔ پتہ نہیں اس کی واپسی کب ہو۔ اس لئے۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ تم ان کا سہارا بن سکتے ہو۔ یار! تمہارا بھی گھر بس جائے گا۔ اور وہ لوگ بھی تمہارے آسرے جی لیں گے۔'' سجاول نے رک رک کر کہا۔

''ٹھیک ہے یار۔ جیسا تو کہے۔ تجھے سب اختیار ہے۔ میں تیرے ہاتھ میں ہوں۔''

سجادل نے بے ساختہ کاکے کو گلے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یار کاکے! تو نے میرا مان رکھ لیا ہے۔''

۞......۞......۞

سجاول کو بوڑھے گورکن سے بات کرتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے کام لینا پڑا۔ اس نے بوڑھے سے بھی یہی کہا کہ یہ تجویز باس کی ہے۔ وہ اچانک کوئی کام پڑ جانے کی وجہ سے ملک سے باہر چلا یا ہے۔ لیکن اس نے تاکید کی تھی کہ وہ اس کی غیر موجود میں اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

بوڑھے کے لئے باس کی ایک بار پھر جدائی کسی شدید دھچکے سے کم نہیں تھی۔ وہ بار بار مشکوک لہجے میں پوچھتا تھا کہ قدیر کہاں ہے؟ اسے کیا کام پڑ گیا تھا؟ وہ کدھر چلا گیا؟ وہ بتا کر کیوں نہیں گیا؟ وہ کب آئے گا؟

سجاول کیلئے اسے مطمئن کرنا خاصا مشکل تھا۔ لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر ہی لیا۔ لہر کے دادا نے بھی اسے سمجھایا۔ کہ یہ تجویز بہت ہی معقول ہے۔ اگر اس کی زندگی میں ہی رجاں کو سہارا مل جائے۔ تو اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

وہ رضامند تو ہو گیا۔ لیکن کبھی ہنستا۔ اور کبھی روتا۔ اور بار بار یہی کہتا کہ قدیر خود آ کر اپنی بہن کو ڈولی میں ڈالتا۔ تو اچھا تھا۔ سجاول نے اس وقت زیادہ زور دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ لیکن اس تجویز کی معقولیت سے اسے انکار نہیں تھا۔

اس گفتگو میں اسے کافی دیر ہو گئی۔ لیکن وہاں سے اٹھتے ہوئے اسے اطمینان تھا کہ اس نے بوڑھے کو اس عمر میں صدمے سے بچا لیا تھا۔ رجاں کا گھر بس جانے کی امید ہو چلی تھی۔ وہ بوڑھے سے رخصت ہو کر باہر آیا تو شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی تپتی ہوئی کرنیں دن بھر کی مسافت طے کر کے درختوں کی چوٹیوں پر ٹکی ہوئی آسودگی کا سانس لے رہی تھیں۔

مغرب کی سمت شفق کے آتشی رنگ طلوع ہو رہے تھے۔ سجاول اپنی ہی سوچ میں گم آہستگی سے قدم دھرتا چلا جاتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ میں سے کسی نے پکارا۔ سجاول نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا اور ٹھٹک گیا۔

ایک سوکھے درخت کے خشک تنے سے ٹیک لگائے لہر کھڑی تھی۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی دلکش آنکھوں کی سبز جھیلوں میں گہری اداسی کنول کی طرح تیر رہی تھی۔ جو روح میں اضطراب جگاتی تھی۔

سجاول کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ باس کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس کی تسلی کیلئے الفاظ ڈھونڈتا۔ پگڈنڈی سے اتر کر نیچے آیا۔ اور اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''کیا بات ہے لہر۔ یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو۔ جاؤ گھر شام ہو رہی ہے۔''

لہر کی خوبصورت آنکھوں میں ایک دم ہی موٹے موٹے آنسو بھر آئے۔ لیکن اس نے انہیں گالوں پر نہیں بہنے دیا اور آنسوؤں کا ایک گولہ سا حلق سے نیچے اتارتے ہوئے بولی۔

''پائیا! تم کیوں ہمارے صبر کا امتحان لیتے ہو۔ بتاتے کیوں نہیں ہو کہ تمہارا دوست کدھر گیا ہے۔''

''بھئی بتایا تو ہے۔ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ یہاں اس کی جان کو خطرہ تھا۔ اسی لئے تو وہ چھپ چھپا کر نکل گیا۔ تم تو گھر میں رہتی ہونا۔ تمہیں کیا پتہ کہ باہر کیا بکھیڑے ہوتے ہیں۔'' سجاول نے بردباری سے کہا۔

''پر...... پر...... پتہ نہیں کیوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ تم اصل بات نہیں بتا رہے۔'' اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

سجاول اندر ہی اندر پریشان تو ہوا۔ مگر اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بظاہر عام سے لہجے میں بولا۔

''بھئی۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس میں میرا کیا فائدہ؟ جو اصل بات ہے۔ وہ میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ جب وہ کبھی خط لکھے گا۔ یا حالات اچھے ہوئے تو واپس آئے گا۔ تو تم خود اس سے پوچھ لینا۔ کہ اصل بات کیا ہے؟''

''اس وقت تک کون جیئے گا؟ کیا خبر۔'' وہ رخساروں پہ بہہ جانے والا ایک آنسو صاف کرتے ہوئی بولی۔

''لہر۔ ایک بات بتائے گی۔'' سجاول نے موضوع بدلنے کو کہا۔

''کیا؟'' وہ قدرے حیران ہوئی۔

''برا تو نہیں مانے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''لہر تو نے کبھی قدیرے سے بھی کوئی بات کی تھی۔ اسے بھی اپنے دل کا حال سنایا تھا؟''

اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اس کے دلکش چہرے پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ اس کا سر جھک سا گیا اور اس نے آہستہ آہستہ سر کو یوں نفی میں جنبش دی۔ جیسے پچھتاؤں میں گھری ہوئی ہو۔

''تو کبھی اس سے کچھ کہتی تو سہی۔ اسے کچھ بتا تو دیتی۔ اسے کچھ تو سمجھاتی۔'' سجاول نے زور دے کر کہا۔

''میں کس طرح کہتی؟'' وہ دوپٹے کا ایک سرا انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

''میں کیا کہتی؟ میں کس طرح اسے سمجھاتی؟ وہ تو۔ وہ تو شاید کچھ بھی نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ وہ تو سب کچھ جان کر بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ کچھ نہیں۔ وہ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اس کے من میں کیا تھا؟'' اس کے لفظ آنسوؤں میں بھیگنے لگے۔ تو وہ آپ سے آپ چپ ہو گئی۔

سجاول بھی چپ رہا اور اندر ہی اندر غم سے پگھلتا رہا۔ اس کے پاس کوئی آس، کوئی امید نہیں تھی۔ جو وہ لہر کے حوالے کر دیتا۔ اس کے پاس ایسی کوئی آرزو۔ کوئی خوشی نہیں تھی۔ جو وہ لہر کو باس کی نشانی بنا کر سونپ دیتا۔

لہر نے ایک بار پھر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پی کر اس کی طرف دیکھا اور امید و بیم کی کیفیتوں میں ڈوبتی ابھرتی ہوئی بولی۔

''پائیا! پائیا! وہ...... وہ تجھے مل کر گیا ہے؟''

سجاول نے لمحے بھر کو سوچا اور نفی میں سر کو جنبش دی۔

''نہیں۔ مجھے تو اس کے کسی دوست نے پیغام دیا ہے کہ وہ چلا گیا ہے۔''

''اوہ......!'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک آہ سی پھسل گئی۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

''پائیا! اس نے۔ اس نے کبھی۔ کبھی میرے بارے میں بھی کچھ کہا تھا۔ کبھی۔'' اس نے جھجک کر سر جھکا لیا۔

''میں جھوٹ کیوں بولوں لہر۔ وہ بندہ ہی کسی اور ٹائپ کا ہے۔ وہ اس قسم کے بکھیڑوں میں نہیں پڑتا۔ تو بہت سادہ اور معصوم ہے۔ تجھے کیا پتہ کہ وہ کس دنیا میں رہتا ہے۔

اسے کہاں فرصت ہے کہ اس قسم کی باتیں کرے یا سوچے۔''

''اونہہ......'' اس نے غصے سے سر جھٹکا اور بھرے ہوئے گلے سے بولی۔

''وہ ہے ہی ایسا۔ بے ایمان۔ بے وفا۔ بے فیض۔ ہم تو اس کے پیچھے۔'' اس کے گلے میں جیسے پھر کوئی پھندا سا آ پڑا اور وہ چپ ہو کر۔ ہونٹ چباتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

لہر کے دادا کے اصرار اور سجاول کی کوششوں سے بوڑھا گورکن بالآخر رضامند ہو گیا کہ وہ باس کے آنے کا انتظار کیے بغیر ہی رجاں کو ڈولی میں ڈال دے گا۔ تھوڑے ہی دنوں میں کاکا لوہار رجاں کو بیاہ لایا۔ معصوم چھیمو۔ یہ انوکھی محبت' یہ نیا رشتہ پا کر کچھ حیران سی تو ہوئی۔ لیکن جلد ہی اسے اس تبدیلی کی خوشگواری کا احساس ہو گیا۔ کاکے کے چھوٹے سے گھر میں اس کی چہکار رونق سی بن کر بکھر گئی۔ وہ بوڑھے گورکن کو بھی اپنے ہمراہ لے آیا۔ اور رجاں کو اس نے سکھوں اور خوشیوں سے لاد دیا۔

سجاول کو اب رجاں کی طرف سے کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ کاکے کے پاس زندگی اس کے لئے ایک نئے اور خوبصورت رنگ میں تھی۔ جس نے اسے نہال کر دیا تھا۔ سجاول کو باس سے دوستی نبھانے کے فرض نے باندھ لیا تھا۔ لیکن اس کا دل اپنے محور سے نہیں ہٹا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملا۔ وہ اس کی تلاش میں چپہ چپہ کھنگالنے کو نکل گیا تھا۔ اب تو وہ بھاگ بھری کو ایک نظر دیکھ کر پہچان سکتا تھا۔

وہ شہر گیا۔ تو اسے نیلم کا خیال آیا۔ معاً اس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ بھاگ بھری نیلم کی سہیلی بھی تو تھی۔ کیا خبر اسے کسی ایسے ٹھکانے کی خبر ہو جہاں وہ پناہ لے سکتی ہو۔ یہی سوچ کر وہ کہیں اور جانے کے بجائے ہسپتال چلا گیا۔ وہ اس کے کمرے میں پہنچا۔ تو اس کا بستر خالی تھا۔

سجاول کچھ گھبرایا۔ اس نے اسے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ تو اسے ایک نرس نے بتایا کہ نیلم کے زخم تو ٹھیک ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کا دلکش چہرہ داغ دار ہو گیا ہے۔ اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی ہے۔ وہ بے حد دلبرداشتہ ہے اور لوگوں سے ملنے سے گریز کرتی ہے۔ چند دنوں میں اسے ہسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔ نرس نے بتایا کہ وہ پچھلے برآمدے میں بیٹھی ہے۔

وہ اس طرف آیا۔ تو اس نے نیلم کو دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہ ململ کا بڑا سا دوپٹہ اوڑھے

کرسی پر رخ پھیرے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ سامنے نہیں تھا۔ لیکن وہ کرسی کے ہتھے پہ رکھا ہوا اس کا جھلسا ہوا ہاتھ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چاند کو گہن میں دیکھنے کیلئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ اور نپے تلے قدموں میں قریب آ کر اس نے اس کا نام لے کر پکارا۔

وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اوہ سجاول تم۔'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اپنی بات مکمل نہیں کر سکی۔ آنسو اس کے داغدار رخساروں کو بھگونے لگے۔

چاند کو گہن لگ گیا تھا۔ پھول مرجھا گیا تھا۔ نیلم اس کے مقابل تھی۔ لیکن پہچانی نہیں جاتی تھی۔ سجاول بھی چپ کا چپ رہ گیا۔ وہ بھی کچھ نہیں کہہ پایا۔ چند لمحے دونوں ہی بالکل چپ کھڑے جیسے ایک دوسرے کے پہل کرنے کا انتظار کرتے رہے۔ پھر نیلم نے اپنے آنسو صاف کیے اور قدرے مدھم لہجے میں بولی۔

''سجاول! میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں روز تمہاری راہ دیکھتی تھی۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔ مجھے جلدی بتاؤ۔ تمہیں تمہاری بہن تو مل گئی ہے نا۔''

سجاول کو اس کے سوال نے ڈس لیا۔ وہ کرب سے ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

''بس نیلم! قسمت میں تو جیسے ناکامی ہی لکھی ہوئی ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟''

''اوہ......! نیلم نے دکھ اور افسوس سے ہاتھ ملے۔'' مجھے معاف کر دو سجاول۔ یہ ساری غلطی میری ہی ہے۔ سب قصور میرا ہے۔ اگر میں تمہیں اسی وقت بتا دیتی تو۔

''چھوڑو نیلم! جانے دو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ہماری تو قسمت میں ہی بھٹکنا لکھا ہے۔ وہ کئی بار میرے قریب آ کر دور چلی گئی۔ کسی کا کیا گلہ؟ تمہارا کیا قصور؟!! کبھی نہ کبھی تو تقدیر کو مجھ پر رحم آئے گا۔ تمہیں اگر اس کے کچھ ملنے جلنے والوں کا پتہ معلوم ہو۔ تو مجھے بتا دو۔ یا کوئی ایسی جگہ جہاں تمہارا خیال ہے کہ وہ پناہ لے سکتی ہے۔''

نیلم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''اس کا میرا اتنا ساتھ تو کبھی نہیں رہا۔ ہم کبھی کبھی تھوڑی دیر کیلئے ملتے تھے۔ تو اپنے اپنے دکھ ایک دوسرے کو سنا کر اپنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے۔ اور بس۔''

''ہوں۔'' سجاول نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم بھی مجھے کچھ نہیں بتا سکتیں۔''

نیلم نے نفی میں سر کو جنبش دی اور تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور جیسے خودکلامی کی سی کیفیت میں بولی۔

"سجاول! میں نے سوچا تھا کہ تم بخت آور سے مل جاؤ گے۔ تو شاید تمہاری چھت تلے مجھے بھی پناہ مل جائے۔ میں تم دونوں کی خدمت کر کے زندگی گزار لوں گی۔ لیکن اب۔ لیکن اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر جاؤں؟ کیا کروں؟

"سب نے منہ موڑ لیا ہے۔ سب نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ میرے پاس رہا ہی کیا ہے۔ جوجمع جتھہ تھا۔ وہ سب علاج پر اٹھ گیا ہے۔ اب تو میرے پاس اس داغدار چہرے کے سوا کچھ نہیں رہا۔" اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔

سجاول کا دل دکھ گیا۔ اس نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"فکر نہ کرو نیلم! جس کا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کا خدا ہوتا ہے۔ دل چھوٹا مت کرو۔ ہمت سے کام لو۔"

اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کرب واذیت سے ہونٹ کاٹ کر بولی۔

"آپا کہتی ہے۔ دو چار لڑکیاں آگے رکھ کر دھندا شروع کر دو۔ لیکن سجاول! میں ساری عمر جس جال سے نکلنے کیلئے تڑپتی رہی ہوں۔ میں دوسروں کو کس طرح......" آنسوؤں نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ وہ سر جھکا کر ایک بار پھر رو پڑی۔

سجاول کانپ گیا۔ اس کی بات سن کر اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے تیزی سے کہا۔

"میری بات سنو نیلم! اگر تمہیں کسی شریف گھر میں پناہ مل جائے۔ تو تم۔ میرا مطلب ہے تم؟" وہ اٹکا۔

"تم گزارا کر لو گی۔"

نیلم نے کچھ حیرت۔ کچھ حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"سجاول! میں تو پھر سے جی اٹھوں گی۔"

"تمہیں کب ہوسپٹل سے ڈسچارج کریں گے؟" سجاول نے پوچھا۔

"میں کہوں تو آج ہی کر دیں گے۔ میں تو خود ہی رکی ہوئی ہوں۔ یہاں سے نکل کر جاؤں گی کہاں۔ بس اسی سوچ نے پریشان کر رکھا تھا۔ پھر مجھے تمہارا بھی انتظار تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے امید تھی کہ تم میری ضرور مدد کرو گے۔"

"کوئی تمہارا پیچھا تو نہیں کرے گا؟"

"نہیں۔ انہیں اب مجھ سے کیا لینا؟"

"تو پھر ابھی چلتی ہو میرے ساتھ؟"

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔" وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ نیلم کو ہسپتال سے لے کر نکلا۔ تو اس کا خیال تھا کہ وہ کاکے کی طرف چلا جائے۔ لیکن اچانک ہی اس کا ذہن بدل گیا اور اس کا رخ آپ ہی آپ اس چھوٹے سے گھر کی طرف ہو گیا۔ جہاں گل کی مہک تھی۔ وہ ایک عرصہ بعد اس دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ گل کے پاس پہنچ کر سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

اس کی دستک کے جواب میں دروازہ یوں کھلا۔ جیسے روح میں کوئی دریچہ کھل جائے۔ جیسے ریگستان میں کوئی شاداب نخلستان مل جائے۔ گل کا پھول ایسا شگفتہ چہرہ اتنے دنوں بعد دیکھنا بہت اچھا معلوم ہوا۔ وہ اسے ایک اجنبی عورت کے ساتھ دروازے پہ کھڑا دیکھ کر کچھ حیران ہوئی۔ لیکن پھر یوں مسکرائی۔ جیسے کوئی ننھی منی کلی چٹک گئی ہو۔

"اوہ!! سجاول۔ یہ آج تم کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے؟ آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا اور دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی۔

نیلم کچھ جھجکتی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔ اس نے چہرے کا ایک حصہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا اور آنکھوں پر گہرے شیشوں کا چشمہ تھا۔ گل نے اسے بیٹھنے کیلئے کہا اور سجاول سے بولی۔

"سجاول یہ کون ہے؟ تعارف تو کراؤ۔"

"اس کی کہانی بہت لمبی ہے۔ میں اسے تمہارے پاس لے کر آیا ہوں۔ اگر تم اسے پناہ دے دو تو۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور گل کے فیصلے کے انتظار میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

گل نے نیلم کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نظر سجاول پر ڈالی اور اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں بولی۔

"اسے تم میرے گھر لے آئے ہو۔ تو سمجھو کہ یہ اب اس گھر کا فرد ہے۔"

نیلم نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ سیاہ چشمے کے نیچے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگنے لگیں۔ سجاول نے ایک تشکر نگاہ اس پر ڈالی اور کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ اسے کچھ نہیں سوجھا کہ وہ اپنا مفہوم اس تک کس طرح پہنچائے۔ اکھڑ اور درشت لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے وہ نرم و نازک زندگی کے قرینے بھول گیا تھا۔ اسے اچھے اور خوبصورت لفظ نہیں مل رہے تھے۔ جو اس کے مطلب کو واضح کر سکیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

اسی وقت ماسی چادر کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی اندر آئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کیوں پتر! خیر تھی نا؟ بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے۔ تم تو بھول ہی گئے ہو۔''

ماسی کے مشفق ہاتھوں کے لمس کو اپنے بالوں میں محسوس کر کے اسے ایک انوکھی سی تازگی کا احساس ہوا۔ اس نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ عاجزی سے کہا۔

''بس ماسی! یہ دنیا کے بکھیڑے ہی کہیں سانس نہیں لینے دیتے۔''

''یہ تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہی ہے نا پتر۔ پر بھی انسان عزیزوں رشتہ داروں کی بھی تو خبر لیتا ہے۔'' ماسی نے کہا اور نیلم کے قریب جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اس کے پوچھنے سے پہلے ہی گل آپ سے آپ بول اٹھی۔

''ماسی! یہ بیچاری بے سہارا ہے۔ سجاول اس کو لے کر آیا ہے کہ ہمارے پاس رہے۔''

ماسی نے سر سے پاؤں تک ایک تنقیدی نگاہ نیلم پر ڈالی۔ اس کے جھلسے ہوئے ہاتھ اور چہرے نے شاید اسے کچھ سمجھا دیا۔ اس نے نیلم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''چل اچھی بات ہے دھیئے۔ ہم لوگ تو یہاں اکیلے پڑے ہیں۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتے دار۔ تیرے آنے سے ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔'' نیلم نے ماسی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور محتاط سے لہجے میں بولی۔

''میں بھی آپ کو ماسی کہہ سکتی ہوں۔''

ماسی ہنس پڑی۔ ''میں تو جگت ماسی ہوں۔ چھوٹے بڑے سب کی ماسی ہوں۔ تو بھی یہی کہہ لے۔''

''ماسی! میں کوشش کروں گی کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔'' نیلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں دھیئے۔ تکلیف کیا ہوتی ہے۔ انسان تو انسان کے دکھوں کا علاج ہے۔'' ماسی نے محبت سے کہا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''اچھا۔ میں تمہارے لئے کچھ روٹی پانی کا بندوبست کروں۔''

نیلم بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ماسی کے پیچھے لپکی۔

''ماسی! میں بھی تمہاری کچھ مدد کراؤں۔''

''نہ دھیئے۔ تو ابھی آئی ہے۔ منہ ہاتھ دھو۔ کچھ آرام کر۔''

ماسی نے پلٹ کر کہا۔

''بھئی یہاں رہو گی۔ تو مدد کراتی ہی رہو گی۔ فی الحال تو تم منہ ہاتھ وغیرہ دھو۔'' گل نے بھی ہانک لگائی۔

''نہیں آپا! مجھے یہ گھر۔ اس کے لوگ۔ یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے اس سے نہ روکو۔'' نیلم نے کچھ اس انداز میں کہا کہ گل خاموش ہو گئی اور ماسی نے بھی اسے اپنے پیچھے پیچھے آنے دیا۔ وہ دونوں صحن میں ایک طرف بنے ہوئے مٹی کے چولہے میں آگ روشن کرنے لگیں۔

گل وہیں تنہا بیٹھی رہ گئی۔ سجاول کو اس کی موجودگی' اس کا معصوم خوبصورت چہرہ' اس کی خاموشی۔ سب کچھ بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گل سے کیا بات کرے۔ کیا کہے۔ کونسے موضوع کا انتخاب کرے۔

گل نے خود ہی اسے مخاطب کر لیا۔

''سناؤ سجاول! آج کل کیا کچھ کر رہے ہو۔ تم تو بڑے مصروف رہے ہو۔''

''کیا کرنا ہے میں نے۔ بس دربدر کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ لیکن حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' وہ آہ سی بھر کر بولا۔ ''میں آج بھی وہیں کھڑا ہوں۔ جہاں سے چلا تھا۔''

''کیوں؟ اتنا عرصہ تم نے کچھ بھی نہیں کیا؟ بھئی کچھ تو کیا ہوگا۔'' گل نے کہا۔

''یہی تو ساری پریشانی ہے کہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔'' وہ پشیمانی سے بولا اور اپنے بھرے ہوئے افسردہ و رنجور دل کا سارا حال کہنے لگا۔ وہ چپ بیٹھی سنتی رہی۔ بڑی ہمدردی' بڑے لگاؤ کے ساتھ۔ وہ کہتا رہا۔ جو اس کے دل میں آیا۔ کہتا رہا۔ وہ شاید خاموش نہ ہوتا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں نے اس کے حلق میں پھندہ سا ڈال دیا۔

''بس سجاول! شاید اللہ کو ابھی تمہاری اور آزمائش کرنی ہے۔ مگر دیکھو تم اتنا تو آگے

بڑھے ہوتا کہ اب تم اپنی بہن کو پہچانتے ہو۔ اس کا نام تمہیں معلوم ہے۔ تم اسے ضرور ڈھونڈ لو گے۔"

سجاول نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور شدت کرب سے ہونٹ کاٹتا ہوا بولا۔

"گل! گل! مجھے ایک بار بھاگ بھری مل جائے۔ تو میں پھانسی چڑھنے کو بھی تیار ہو جاؤں گا۔ خدا کی قسم۔ جب مجھے اس کا خیال آتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ساری دنیا کو تہس نہس کر دوں۔"

"اوہو ہو ہو۔!!! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ پاگل! اپنی بہن کو تلاش کر کے تم پھانسی چڑھ گئے۔ تو اس کا جینے کو دل چاہے گا؟ وہ تو پھر بے سہارا رہ جائے گی۔ تمہارے بغیر وہ اس دنیا کا مقابلہ کس طرح کرے گی۔"

گل کی یہ بات سجاول کے دل پر جا لگی۔ وہ بھاگ بھری کو تلاش کر کے اپنے خاندان کی عزت کو پناہ میں لینا چاہتا تھا۔ اگر وہ ہی نہ ہوا۔ تو بھاگ بھری۔ ایک بار پھر اس بھری دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ اس نے الجھ کر گل کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے نگاہ ملتے ہی وہ بولی۔

"سجاول! دیکھو۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ یہ صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ اسے ضائع نہ کرو۔ اسے اپنے لئے، اپنی بہن کیلئے وبال نہ بناؤ۔ تم اپنی بہن کو ضرور تلاش کرو۔ لیکن ایک اچھی زندگی گزارتے ہوئے۔ حلال کی روزی کماتے اور کھاتے ہوئے۔ سجاول! تم اپنی بہن کو جس محفوظ چھت تلے لانا چاہتے ہو۔ پہلے اس کو بنا تو لو۔ وہ تمہیں مل گئی۔ تو تم اسے کیا بتاؤ گے؟ کہ تم کیا کرتے ہو؟ اسے کہاں رکھو گے؟ اسے کون سے گھر میں لے کر آؤ گے؟"

گل کے ان سوالوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی وہ بھاگ بھری کو کیا بتائے گا؟ اس کے سوالوں کا کیا جواب دے گا؟

اس نے پریشانی سے گل کی طرف دیکھا۔ اور سٹپٹایا ہوا سا پوچھنے لگا۔

"تم ہی بتا دو گل کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مجھے کچھ نہیں سوجھتا کہ میں کیا کروں؟ میں نے اس دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ جن لوگوں کو دنیا اچھا کہتی ہے۔ جو بڑے پہنچے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں، میں نے ایسی ایسی باتیں دیکھی ہیں کہ......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سر جھٹکا۔

"اور ایک ہم ہیں کہ۔" وہ پھر خاموش ہو کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

گل نے مدھم سے لہجے میں کہا۔ "سجاول! دنیا کی طرف نہ دیکھو۔ یہاں تو بڑی بڑی شعبدہ بازیاں ہوتی ہیں۔ تم اپنا واسطہ اپنے ضمیر کے ساتھ رکھو۔ اچھا کام اس لئے نہ کرو کہ تمہاری واہ واہ ہو۔ برے کام سے اس لئے نہ رکو۔ کہ دنیا دیکھ رہی ہے۔ اچھائی تو اچھائی ہے اور برائی، برائی۔ کسی صلے یا لالچ کے بغیر۔ کسی سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر۔"

سجاول کے متفکر چہرے پر تازگی کی ایک شاداب پھوار سی پڑی۔ اسے جیسے زندگی کی ایک نئی راہ نظر آنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں کھو سا گیا۔ سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔

اسی وقت ماسی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دسترخوان زمین پہ بچھی ہوئی دری پہ بچھا دیا۔ نیلم ٹرے میں کھانا لئے ہوئے اندر آئی اور دسترخوان پر رکھنے لگی۔

"آؤ سجاول کھانا کھاؤ۔" گل نے کہا۔

تو وہ چونک کر اٹھا اور ہاتھ دھونے کیلئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

نیلم جلد ہی ماسی اور گل کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ اس کی دکھ بھری داستان نے ماسی اور گل کے دل میں اس کے لئے ہمدردی جگا دی تھی۔ وہ جو اپنے چہرے کے بگڑ جانے کی وجہ سے بہت دل برداشتہ ہوگئی تھی۔ اس گھر کی چار دیواری نے اس کا اعتماد بحال کر دیا تھا۔ اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھا دیا تھا۔ وہ اس گھریلو ماحول میں رچ بس گئی تھی۔

وہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی۔ گل نے اسے اس پر بھی رضامند کر لیا تھا کہ وہ اسکول میں بچوں کو پڑھا دیا کرے گی۔ سجاول کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اس کا ضمیر اس خیال سے مطمئن تھا کہ اس نے اپنی کھوئی ہوئی بہن جیسی ایک بے بس لڑکی کو گناہ کی دلدل میں ڈوب جانے سے بچا لیا تھا۔ وہ گل کے سائے میں آ گئی تھی۔ جو عذاب جیسی زندگیوں کو سنوار کر آسودہ بنا دیتی تھی۔

وہ اسے یہاں چھوڑ کر پھر اس ہجوم میں نکل سکتا تھا۔ جس میں بھاگ بھری اس سے بچھڑ گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ اسے پہچان سکتا تھا۔ گل نے اسے ایک نرالی راہ سجھائی تھی۔ وہ اس پر چلنا چاہتا تھا۔ لیکن اس طرح کہ اس کی وجہ سے گل پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اسے یہاں رہتے ہوئے کچھ دن ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ گل سے اجازت لے لے۔

ایک دوپہر۔ سب کھانا کھا چکے۔ تو نیلم جھوٹے برتن دھونے بیٹھ گئی۔ ماسی کسی ہمسائی سے ملنے چلی گئی۔ گل اپنی نامکمل کشیدہ کاری میں الجھ گئی۔ سجاول خاموشی سے اس کے پاس آ بیٹھا اور اسے کڑھائی کرتے ہوئے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

وہ بڑی نفاست سے نازک نازک سے رنگ برنگے پھول کاڑھ رہی تھی۔ اس کی انگلیوں میں دبی ہوئی سوئی بڑی مہارت سے چل رہی تھی۔ دھاگہ ختم ہو گیا۔ تو اس نے کڑھائی کا فریم چھوڑا۔ اور سوئی میں پرونے کیلئے رنگ کا انتخاب کرنے لگی۔ سجاول نے کڑھائی والا

فریم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

"تم کتنے اچھے پھول بنا لیتی ہو۔" اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

گل نے فریم اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہونٹوں میں سے سوئی نکال کر بولی۔ "یہ ذرا مکمل ہو جائے۔ تو تمہارے کرتے پر بھی کڑھائی کر دوں گی۔"

سجاول لمحے بھر کو ششدر سا رہ گیا۔ جیسے جیسے اس پر اس بات کی خوبصورتی کھلتی گئی۔ وہ خوشگوار سی حیرت میں ڈوبتا چلا گیا۔ گل اس کے لئے کڑھائی کرے گی۔ اس تصور نے اسے سرشار سا کر دیا۔ جس سے وہ کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ بس اس کی جانب بھیگی ہوئی ممنون نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

گل نے کچھ الجھا ہوا دھاگہ اسے دیتے ہوئے کہا۔

"سجاول! ذرا اس دھاگے کو سلجھا دو۔ سارے رنگ الگ الگ کر دو۔ بہت الجھ گیا ہے۔ دیکھنا گرہ نہ پڑ جائے۔"

سجاول کچھ دیر بڑے انہماک سے دھاگہ سلجھاتا رہا۔ رنگوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے رکھتا رہا۔ پھر اس نے گل کی طرف دیکھا۔ جو اپنے کام میں لگی ہوئی تھی اور قدرے محتاط لہجے میں بولا۔

"گل! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"فرمایئے جناب!" اس نے شگفتگی سے کہا اور اپنے کام سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

سجاول بوکھلا گیا۔ "کہیں برا۔ تو نہیں مان جاؤ گی؟"

"برا ماننے والی بات ہوئی۔ تو ضرور برا مانوں گی۔" وہ بردبار شوخی سے بولی۔

"پھر تو میں نہیں کہتا۔" وہ اور سٹپٹایا۔

"نہیں...... نہیں...... کہو بھئی۔ آخر بات کیا ہے؟" وہ اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوئی۔

سجاول نے گہرا سانس لیا۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"لو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟" گل مسکرائی۔

"میں تمہیں خفا نہیں کر سکتا۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ سادگی سے بولا۔

"نہیں بھئی۔ میں خفا نہیں ہوتی۔ تم مجھ سے ہر بات کہہ سکتے ہو۔ تمہیں کھلی چھٹی

ہے۔" وہ فراخدلی سے کہنے لگی۔ اور اسے سوچنے کا موقع دینے کو پھر اپنی کڑھائی میں الجھ گئی۔

سجاول کچھ ہچکچایا۔ پھر جیسے لفظوں کو تولتا ہوا بولا۔ "گل! میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں بھئی؟" وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔

"دراصل میرا یہاں رہنا مناسب نہیں۔" وہ جیسے صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

"میں...... میں ایک مشکوک بندہ ہوں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کن کن سے چھپتا پھرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم پر کوئی حرف آئے۔ یا تمہیں کوئی پریشانی ہو۔"

"ہوں۔" گل نے سوچ میں ڈوبی ڈوبی سی لمبی ہوں کی۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"نہیں۔ مجھے پریشانی کیا ہونی ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایک اچھی اور باوقار زندگی گزارو۔" پھر اس نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھ کر زور دے کر بولی۔

"سجاول اب تم یہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ختم کر دو۔ اپنا گھر بساؤ اور شریفانہ زندگی گزارو۔"

سجاول نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور تھکے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ "تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو گل۔ میں گھر بسا کر کیا کروں گا؟ گھر اندیشوں سے بے نیاز ہو کر بسائے جاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں۔ یا میں ہی کوئی انتظام کروں۔"

سجاول کو رانی کی بادامی آنکھیں بڑی شدت سے یاد آئیں۔ اسے گلابی کی گلابی ڈوروں والی نشیلی آنکھیں یاد آئیں۔ اسے شہزادی کی شوخ اور متحرک آنکھیں یاد آئیں۔ اور اس نے گل کی جھیل ایسی گہری شفاف آنکھوں کی طرف دیکھا۔ جو سوالیہ انداز میں اس کی جانب تک رہی تھیں۔ وہ کیا کہے۔ کس طرح کہے۔ وہ کیسے سمجھائے۔ وہ صرف ان آنکھوں کی پناہ میں رہنا چاہتا تھا۔ وہ ان کی نگرانی میں۔ ان کی موجودگی میں رہنا چاہتا تھا۔ وہ انکے آس پاس بس تھوڑی سی جگہ چاہتا تھا۔

"بھئی۔ کچھ بولو تو سہی۔" گل نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔

سجاول نے سر جھٹکا۔ "میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔"

"اچھا۔" گل نے مصنوعی حیرت سے کہا اور ہلکی سی شرارت کے ساتھ اسے مشورہ دیا۔ "تو اب سوچ لو۔"

سجاول کا جی نہ جانے کیوں چاہا کہ اس سے روٹھ جائے۔ اس سے خفا ہو جائے۔ وہ اس سے کیسے سوال کر رہی تھی۔ عجیب' خوفزدہ اور لاجواب کر دینے والے۔ وہ کیا سوچے اور اپنی سوچوں کو آگے بڑھنے اور بھٹکنے سے کیسے روکے۔ وہ اپنی سوچوں کو زبان کیسے دے؟ وہ یوں ہی چپ بیٹھا رہا۔ جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور تاثرات سے خالی تھا۔ گل نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولی۔

"سجاول! ارے بھئی تم نے تو ابھی سے سوچنا شروع کر دیا۔ ابھی تو تمہارے پاس وقت ہے۔"

سجاول نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا دکھ اور ایسی محرومی تھی۔ جیسے رونا چاہتا ہو۔ لیکن آنسو نہ نکلتے ہوں۔ اس نے زمین پر انگلی سے لکیریں کھینچتے ہوئے بجھے سے لہجے میں کہا۔

"میں نے کیا سوچنا ہے۔ میں نے سوچ کر کرنا بھی کیا ہے؟"

"تو چلو۔ ہم سوچ لیں گے تمہارے لئے۔ ہیں۔ کیا خیال ہے؟" گل نے مسکرا کر کہا۔

سجاول نے کوئی جواب نہیں دیا۔

نیلم دروازے میں داخل ہوئی اور گل کو بتایا کہ ہمسایوں کی لڑکی اسے بلا رہی ہے۔

"اچھا۔" گل اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھی اور چلتے چلتے سجاول سے بولی۔

"اتنی جلدی نہیں ہے۔ تم بھی سوچ لو۔ اور ہم تو سوچیں گے ہی۔"

سجاول اب بھی خاموش رہا۔ گل کمرے سے باہر نکل گئی۔ نیلم چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی اندر آئی۔ لیکن سجاول کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ قریب آ کر بولی۔ "بیٹھ جاؤں۔"

"ہوں!! ہاں!!" سجاول نے جیسے بے خیالی میں کہا۔

وہ چٹائی پر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ "سجاول! یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ میں یہاں عزت سے ساری عمر گزار سکتی ہوں۔ سجاول میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں

بھولوں گی۔"

"ہوں۔" سجاول نے پھر بے خیالی میں ہنکارا بھرا اور خاموش ہو گیا۔ نیلم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"شاید تم کچھ سوچ رہے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے جیسے کسی سوچ سے ابھر کر کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "ابھی گل بھی تو تم سے کہہ گئی ہے کہ تم سوچ لو۔ ایسی کیا بات ہے۔ "مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

سجاول کو نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ "بتاؤں تمہیں۔"

"ہاں۔ اگر بتانا چاہتے ہو۔ تو ضرور بتاؤ۔" وہ بولی۔

سجاول ایک مرتبہ پھر زور سے ہنس پڑا۔ "بھئی گل مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں گھر بسا لوں۔ شادی کر لوں۔"

"اچھا؟" نیلم نے اس کی ہنسی میں شریک ہوئے بغیر قدرے حیرت سے کہا۔ اور سنجیدگی سے بولی۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا؟"

"بھئی خیال کیا ہونا ہے۔ میں اس بیکار کے جھنجھٹ میں پڑ کر کیا کروں گا۔" سجاول نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تم اسے بیکار جھنجھٹ کیوں کہتے ہو۔ گھر تو خوشی دیتا ہے۔ تحفظ دیتا ہے۔ نئی امید دیتا ہے۔ گل ٹھیک کہتی ہے۔ تم نے بہت آوارہ گردی کر لی۔ اب پاؤں میں زنجیر پہن لو۔" وہ ہنس کر بولی۔

سجاول نے اس کی طرف دیکھا۔ جھلسے ہوئے زخموں نے اس کے خوبصورت چہرے کی ساری دلکشی چاٹ لی تھی۔ اپنی آنکھوں کے زخم چھپانے کو وہ گہرے شیشوں کا چشمہ لگانے لگی تھی۔ جس سے وہ اپنی عمر سے بڑی اور سنجیدہ لگتی تھی۔

سجاول کو وہ چمکتی دمکتی شوخ نیلم یاد آئی۔ جس کا میک اپ سے چمکتا دلنشین چہرہ اور ستارہ سی جگمگاتی آنکھیں دنوں کو موہ لیتی تھیں۔ اس نے اس وقت اسے دل میں جگہ دی تھی۔ جب لوگ اس کے قدموں میں دل رکھتے تھے۔

وہ جب کبھی بھی اس کے یہاں بھولے بھٹکے سے جا نکلتا تھا۔ تو وہ اپنے سارے

دل آویز جذبوں سے اسے شرابور کر دیتی تھی۔

لیکن اب اس ناگفتہ بہ حالت میں اس نے کبھی محبت کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ اس نے جیسے اپنے سارے جذبوں کو مار لیا تھا۔ وہ اب بھی اس کے سامنے یوں لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ جیسے اسے کسی لطیف جذبے سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔

سجاول نے یونہی اسے چھیڑنے کو کہہ دیا۔

"تو بھلا مجھ جیسے آوارہ گرد سے کون لڑکی شادی کرے گی۔"

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ اس کے داغدار چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن پھر خاموش ہو گئی۔ کچھ سوچا اور بولی۔

"نہیں۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔ تم تو۔" وہ پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی اور اس کے چہرے پر محرومیوں کے کتنے ہی سائے جھک آئے۔

سجاول چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"ہاں کہو تم کیا کہنے والی تھی؟"

وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔ پھر سٹپٹا کر بولی۔ "نہیں کچھ بھی نہیں میں تو کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔"

"اچھا! کچھ نہیں کہہ رہی تھیں؟" سجاول نے اس کی بات دوہرائی۔ اور بولا۔

"تو پھر اب کہو کہ تم شادی کرو گی۔ مجھ جیسے بے ٹھکانہ۔ آوارہ گرد کے ساتھ۔"

"کیا؟" وہ بھونچکی سی رہ گئی۔

"شادی کرو گی مجھ سے؟" سجاول نے صاف لہجے میں دوہرایا۔

اس کا چہرہ متغیر سا ہو گیا اور وہ بے بسی سے بولی۔ "سجاول! میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں جس حال میں ہوں۔ مجھے اسی میں رہنے دو۔"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"سجاول! یہ تو وہ بات ہے۔ جسے تمہارے ہونٹوں سے سننے کیلئے میرا رواں رواں ترستا رہا ہے۔ مگر اب۔ اب تو میرے پاس تمہیں دینے کیلئے کچھ بھی نہیں۔ میں اپنے اس بھیانک چہرے کے ساتھ خود کو تم پر مسلط نہیں کرنا چاہتی۔"

"نیلم! تمہارا صرف چہرہ ہی پہلے جیسا نہیں رہا۔ لیکن تمہارا دل تو وہی ہے نا۔" سجاول نے رسان سے کہا۔

"مگر!"

"اگر مگر کو چھوڑو۔ تم مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو یا نہیں؟" وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

نیلم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور چند لمحے دیکھتی ہی رہی۔ آنسوؤں کے دو شفاف قطرے اس کے داغدار رخساروں پر بہہ گئے۔ اس نے سر جھکا لیا اور ہولے ہولے رونے لگی۔

سجاول ننگے فرش پر سلاخوں کے پیچھے بیٹھا۔ بدلے ہوئے وقت کو سکتے کی سی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔ لوہے کی ان سلاخوں نے اس پر حیات کے سارے در بند کر دیئے تھے۔ زندگی کا کوئی دریچہ اس طرف نہیں کھلتا تھا۔ سلاخوں سے باہر کی دنیا بہت دور اور دسترس سے باہر ہو گئی تھی۔ اس کا اپنا وجود ایک تاریک سائے کی طرح اس نیم تاریک کوٹھڑی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ وہ جیسے کسی بے مصرف شے کی طرح گندے فرش پر پڑا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کے حواس مختل تھے۔ چاروں طرف اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دن اس طرح سے رات بن جائیں گے۔ چمکتا دمکتا اجالے بکھیرتا سورج سیاہ پڑ جائے گا۔ زندگی میں بہت تھوڑی سی خوشی کے بعد غم کے بادل گھر آئیں گے۔ باہر کی دنیا سے اس کا ہر رابطہ کٹ گیا تھا۔

وہ دن بھی اس کے چھوٹے سے آنگن میں اجلی خوشی بن کر طلوع ہوا تھا۔ نیلم اس کے سرہانے کھڑی اسے محبت سے بیدار ہونے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ تو نیلم اسے صبح کی دیوی کی طرح پر جمال اور نکھری نکھری سی معلوم ہوئی تھی۔ اس کے دل کی خوبصورتی نے اس کے داغدار چہرے کو بھی دلکشی عطا کر دی تھی۔ اس کے پاس محبت کے اتنے خزانے تھے کہ اس کی ظاہری کمی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اس کی زندگی میں ایک گھر کا سکھ شامل کر دیا تھا۔

وہ دن بھر اس کے لئے اپنے چھوٹے سے گھر کو سنوارتی رہتی تھی اور جب وہ شام کو تھکا ہارا دہلیز پر قدم رکھتا۔ تو اس کی مسکراہٹیں اسے اپنی منتظر ملتیں۔ زندگی حیرت انگیز طور پر سلجھ گئی تھی۔ اسے ایک دکان پر معمولی ملازمت مل گئی تھی۔ وہ دن بھر کی محنت سے جو تھوڑے سے پیسے لے کر آتا۔ انہیں نیلم کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اسے ایک ایسی خوشی کا احساس ہوتا۔ جو

لاکھوں کا مال لوٹ کر بھی اس کے حصے میں نہیں آتی تھی۔

وہ روز کی طرح اس دن بھی گھر سے نکلا تھا۔ تو نیلم دروازے تک اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ بڑے چاؤ سے کہہ رہی تھی۔ کہ وہ کھانے پر ضرور آ جائے۔ وہ اس کی پسند کی چیزیں بنائے گی۔ اس کے انداز میں لگاؤ تھا۔ اس کی یہ چاہت اس کے جھلسے ہوئے داغدار چہرے کی دلکشی بن گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ناز آمیز تبسم تھا۔ وہ اس کی جانب یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کے سوا اسے کسی کی ضرورت نہیں تھی۔

دروازے سے باہر قدم نکالتے ہوئے اس نے پھر پلٹ کر نیلم کی طرف دیکھا اور چلتے چلتے بولا۔

"فکر نہ کرنا۔ میں جلدی آ جاؤں گا۔"

لیکن اب تو ایسا لگتا تھا۔ جیسے وہ کبھی اس دروازے تک نہیں جا سکے گا' جس کی دہلیز پر وہ نیلم کو جلدی گھر آ جانے کا کہہ آیا تھا۔

وہ دکان کے مالک سے آدھے دن کی چھٹی لے کر ایک گشتی تھیٹر گیا تھا۔ جس کے متعلق اس نے سنا تھا کہ وہاں ہیر رانجھے کا ڈرامہ سٹیج ہوتا ہے۔

وہ بھاگ بھری کی تلاش سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس امید پر ہر تھیٹر میں ضرور جاتا تھا کہ شاید بھاگ بھری اسے وہاں مل جائے۔ لیکن ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس روز بھی وہ تھیٹر کی ملحقہ چھولداریوں میں جھانکتا پھرتا تھا کہ اچانک ایک ہٹے کٹے سیاہ فام آدمی نے اس کا کالر پکڑ کر اسے پیچھے گھسیٹ لیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ دونوں اسے دھکیلتے' دھکے دیتے۔ ایک اور خیمہ نما چھولداری میں لے گئے۔

"کیوں اوئے۔ تو کیا سمجھتا تھا کہ تو پولیس کو جا جا کر رپورٹیں دیتا رہے گا اور ہمیں پتہ نہیں چلے گا۔" ایک شخص نے اچانک ایک زوردار ہاتھ اس کی کنپٹی پر اس طرح دیا کہ وہ چکرا گیا۔

دوسرے نے اسے ٹھوکر لگائی۔ "ہم تو کب سے تیری تاک میں بیٹھے تھے۔"

سجاول کو اس غیر متوقع صورتحال نے حواس باختہ کر دیا۔ انہوں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ نہ ہی اس کی کوئی بات سنی۔ وہ دونوں ہٹے کٹے تھے۔ وہ ان کا مقابلہ بھی نہیں کر سکا۔ انہوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

پھر ایک لمبا تڑنگا شخص ہاتھ میں پستول لیے ہوئے اندر آیا۔ اور اس نے سجاول کے

بال مٹھی میں پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اور بھاری آواز میں غلیظ گالی دے کر بولا۔

''یہ ہے کون الو کا پٹھا۔ ذرا میں بھی تو اس کا دیدار کروں۔ پولیس میں مخبری کر کر کے اس نے ناک میں دم کر دیا ہے۔

نڈھال ہوئے سجاول کے لئے آنکھیں کھولنا بھی محال تھا۔ اسے اپنے منہ میں اپنے ہی خون کا ذائقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

اچانک چاروں طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ کسی نے خیمے کا پردہ ہٹا کر کہا۔ ''پولیس آ گئی ہے۔'' وہ لوگ اسے چھوڑ کر بدحواسی میں باہر نکل گئے۔ سجاول نے سر جھٹک کر خود کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ وہ بمشکل اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ ابھی وہ باہر نکلنے کی فکر میں ہی تھا کہ پولیس اندر گھس آئی۔ سب کے ساتھ اسے بھی ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ یہ سب کچھ اس طرح پلک جھپکتے میں ہو گیا کہ وہ نہ احتجاج کر سکا۔ نہ کسی نے اس کی سنی۔

وہ سب کے ساتھ بےقصور بندھا ہوا تھانے پہنچا دیا گیا۔ کسی نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس کا ان تھیٹر والوں سے کیا تعلق ہے۔ اس نے کوئی جرم کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے خود جب بھی کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اسے گالیوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔

نہ پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ تھا۔ نہ اس کی کوئی ضمانت۔ وہ گل کو اس کی خبر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ پولیس کی حراست میں ہے۔ اور تھیٹر والوں کے سارے جرم اس کے نام بھی لکھے جا چکے ہیں۔ وہ ایک شریف لڑکی تھی۔ وہ اسے تھانے کچہریوں کے چکر میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس کا کوئی موقع نہیں تھا۔ وہ دوسرے ملزموں کے ساتھ وہیں تھانے کے ننگے فرش پر بیٹھا۔ گالیاں اور صلواتیں سنتا رہا۔

اس وقت ایک لاغر اور کمزور بوڑھا جھکی ہوئی کمر کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پریشان چہرے پر بیتے ہوئے لمحوں کا دکھ لکھا ہوا تھا۔ سجاول سکتے کی سی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

''لو آ گئی مصیبت۔'' ایک سپاہی نے تھانیدار کو اس طرف متوجہ کیا۔ تھانیدار نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہانپتا ہوا ہاتھ پیشانی پر لے گیا۔ اور سلام کر کے بولا۔

''تھانیدار جی۔ میری دمی بھاگ بھری کا کچھ پتہ چلا۔ کوئی خبر لگی اس کی۔ وہ ظالم

میری معصوم بچی کو کہاں لے گئے ہیں۔''

''بابا جی۔ او بزرگو۔ تمہیں کہا ہے نا۔ جب بھی تمہاری بیٹی کا کچھ پتہ چلا۔ تو ہم تمہیں اطلاع کر دیں گے۔ تم آرام سے گھر میں بیٹھو۔ یہ روز روز پھیرے نہ ڈالا کرو۔'' تھانیدار نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

بوڑھے کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''رب جانے۔ اس کا پتہ کب ملے گا۔ پتہ نہیں وہ غریبنی کس حال میں ہے۔'' وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا۔ بوجھل قدم گھسیٹتا دروازے کی سمت چلا گیا۔

تھانیدار نے سر کے قریب انگلی گھمائی۔ ''دماغ صحیح نہیں ہے بابے کا۔ پتہ نہیں لڑکی کس کے ساتھ نکل گئی ہے اور یہ روز اس کا پتہ کرنے یہاں آ جاتا ہے۔''

سجاول کے اندر باہر جیسے بھونچال سا آ گیا۔ وہ منجمد سا ہو کر وہیں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بےبسی کے آنسو تیرنے لگے اور وہ آنسوؤں کی اس دھند سے پار بابے کو تھانیدار کے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

یہ بابا اسے کس جگہ آن ملا تھا۔ جب اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گلے میں ناکردہ جرائم کا طوق تھا۔ جب وہ اس کے ساتھ کسی رشتے کے ہونے کا اقرار نہیں کر سکتا تھا جب وہ اسے اپنے دکھوں کی کہانی نہیں سنا سکتا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں تھا۔ کیا کرتا تھا اور کس طرح سے زندگی گزارتا تھا۔

اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھ کر سجاول کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے دنیا سے اس کا ہر رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ کسی انسان سے' کسی ذی روح سے اس کا کوئی تعلق' کوئی ناطہ' کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس کا دل ہر آرزو' ہر تمنا سے یکسر خالی ہو گیا۔ اس کا من ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ اس کا اعتبار ہر چیز سے اٹھ گیا۔ اسے دنیا والوں سے کراہت سی آنے لگی۔ اسے ہر شے زہر لگنے لگی۔

نہ جانے اس دوران عدالت کی کیا کارروائی ہوئی۔ کس کس کے جرائم اس کے نام لکھ دیئے گئے۔ اس نے نہ جانے کیا کیا اعتراف کر لیا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے نہ دن یاد ہے۔ نہ تاریخ۔ نہ مہینہ۔ اسے نہ وقت کا احساس رہا۔ نہ موسموں کی خبر۔ نہ اسے رتوں کے آنے جانے کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ نہ چاند اور سورج کے طلوع و غروب کی خبر ہوتی تھی۔ آہنی سلاخوں سے باہر کی دنیا اس سے لمحہ بہ لمحہ اس طرح دور ہو گئی تھی۔ جیسے کسی ننھے بچے کی

مٹھی سے جگنو چھوٹ کر اڑتا ہوا۔ دور بہت دور۔ فضا کی پہنائیوں میں ہمیشہ کیلئے کہیں گم ہو جاتا ہے۔

اس نے سب کچھ فراموش کر دیا وہ سب کچھ بھول گیا وہ خود کو بھی بھول گیا کہ وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا؟ جیل کی اس سنگین چار دیواری میں کیوں قید تھا؟ وہ ماضی کی تلخیوں‘ حال کی سنگینی اور مستقبل کے خوف سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ جس طرح اس نے خود کو فراموش کر دیا تھا۔ شاید اسی طرح اسے گرفتار کرنے والے بھی اس کو بھول گئے تھے۔ اس کے لئے اب کوئی بات اہم‘ مشکل یا تکلیف دہ نہیں رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ زندگی اس کے اردگرد کس انداز میں بہہ رہی ہے۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ اس نے لفظوں کا احسان لینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت کم کسی سے بات کرتا تھا۔ شدید ضرورت ہی اسے کوئی لفظ بولنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس کے ساتھ رہنے والے قیدی اس سے طرح طرح کے سوالات کرتے‘ کرید کرید کر اس کے بارے میں پوچھتے۔ لیکن وہ سب کے جواب میں خاموش رہتا۔ چپ چاپ۔ خود میں اس طرح مگن جیسے قوت گویائی سے محروم ہو۔

کتنے ہی قیدی آئے اور کتنے ہی سزا کاٹ کر چلے گئے۔ لیکن آگے پیچھے پھسلتے بے شمار دنوں میں اس کی رہائی کا کوئی دن نہیں آیا۔ اسے کسی ایسے دن کی آس بھی نہیں رہی تھی۔ نہ اس نے کبھی کسی ایسے دن کا انتظار ہی کیا تھا۔ اس کے سارے دن ایک جیسے تھے۔ سلاخوں میں مقید‘ سنگین دیواروں میں گھرے ہوئے۔ بے رنگ‘ بے معرف۔ بے نور۔ وہ اپنی ذات کے جزیرے میں قید کسی کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ اسے کے سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ اس کی داڑھی بے ترتیبی سے بڑھ گئی تھی۔ اس کی خاموشی گہری اور گمبھیر ہو گئی تھی۔

دوسرے قیدی اسے کوئی مجذوب یا پہنچا ہوا بزرگ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اس کی خدمت کر کے۔ اس کے پاؤں دبا کر۔ اسے دعا کیلئے کہہ کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ لیکن سجاول کو کسی کی پروا نہیں تھی۔

بدلتی رتیں کبھی کوئی پیغام اس کے نام نہیں لائی تھیں۔ کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ بغیر کچھ محسوس کیئے۔ بغیر کچھ سوچے‘ بغیر کوئی احتجاج کئے زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

O......O......O

”ہیلو! کیا میں میڈم خوش بخت سے بات کر سکتا ہوں؟“

”جی۔ فرمایئے۔! آپ کون صاحب ہیں؟“

”میں احمد مراد ہوں ہفت روزہ ”حقیقت“ کا ایڈیٹر۔ مجھے ملاقات کا وقت چاہیے۔“

”میں معذرت چاہتی ہوں۔ میں اخباری نمائندوں سے نہیں ملتی۔ مجھے کسی طرح کی پبلسٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”مگر یہاں پبلسٹی کا معاملہ تو نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی سنسنی خیز سکینڈلز کا سلسلہ ہے۔ میں تو آپ سے بحیثیت ایک انسان کے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے میں آپ کی آواز کا بے حد پرستار ہوں۔“

”شکریہ۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔“ فون بند ہو گیا۔

احمد مراد نے سر جھٹکا۔ تو گویا ناکامی مقدر تھی۔ گلوکارہ خوش بخت چند ہی برسوں میں دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی۔ اس کی مدھر آواز نے سب کو موہ لیا تھا۔ اس کی پرسوز لے نے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ لیکن وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی وہ انٹرویو یا تصویریں چھپوانے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس کا سیکرٹری لوگوں کو بڑی صفائی سے ٹال دیتا تھا۔ اس کا چوکیدار بڑی تحقیق کے بعد کسی کو اندر جانے کی اجازت دیتا تھا۔

نوجوان احمد مراد نے اس تک رسائی حاصل کرنے کی بہتری کوشش کی تھی۔ لیکن اسے ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس کا پرچہ ”حقیقت“ ہمیشہ نئے موضوعات کی وجہ سے پسند کیا جاتا تھا۔ اسے خوش بخت کی پراسراریت میں کوئی انوکھی کہانی چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جو معاشرے کے کسی ایسے گوشے کی نشاندہی کر سکتی تھی۔ جو اب تک لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ خوش بخت کو بار بار فون کرتا رہا۔ کئی بار اس کے گھر کے

چکر لگائے۔ کوٹھی کے چوکیدار سے کئی بار اس کی تو تو میں میں ہوئی۔ آخر ایک روز اس نے ٹیلیفون پر میڈم خوش بخت سے کہہ ہی دیا۔

''میڈم۔ اگر آپ مجھے شرف ملاقات عطا نہیں کریں گی۔ تو میں دیوار پھلانگ کر آپ کے گھر میں گھس آؤں گا۔''

''اچھا۔ آپ ایسے کام بھی کرتے ہیں۔'' وہ اب اس سے کچھ بے تکلف ہو چلی تھی۔

''کیا کریں جی۔ مجبوری بہت کچھ کراتی ہے۔'' وہ منہ سکھا کر بولا۔

''آپ نے گیٹ کے باہر جو بورڈ لگا ہوا ہے۔ وہ نہیں پڑھا؟'' اس کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔

''جی ہاں۔ بالکل پڑھا ہے اور میں چودہ انجکشن لگوانے کیلئے پوری طرح سے تیار ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

اس کی ہنسی کی آواز آئی۔ ''بڑے ثابت قدم ہیں آپ۔''

''شکریہ عزت افزائی کا۔ تو میں کس وقت حاضر ہو جاؤں؟''

اس نے موقع غنیمت جان کر جلدی سے پوچھ لیا۔

دوسری جانب یوں خاموشی چھا گئی۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ مراد بھی خاموش رہا۔ پھر دوسری طرف سے گہرا سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ اور وہ بولی۔ ''دیکھئے۔ مجھے انٹرویو وغیرہ دینا بالکل پسند نہیں۔''

''توبہ کیجئے جناب۔ میں انٹرویو بالکل نہیں لوں گا۔ میں تو صرف آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' مراد نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

''اچھا!'' اس نے تھوڑا توقف کیا اور بولی۔ ''آپ شام کو کسی وقت آ جائیں۔''

اوہ میڈم۔ شکریہ۔ بہت شکریہ۔ نوازش۔ کرم۔ مہربانی۔'' وہ بہت کچھ کہتا رہا۔ مگر دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

⁂

جب احمد مراد کو چوکیدار نے اندر لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تو بھی اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ واقعی میڈم خوش بخت کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے اور عنقریب اس سے ملاقات کرنے والا ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا اور دل ہی دل میں خوبصورت جملے' موزوں لفظ اور پراثر مکالمے سوچ رہا تھا۔ جو اسے میڈم خوش بخت کو متاثر

کرنے میں مدد دے سکیں۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پردہ ہلا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ مراد احتراماً کھڑا ہو گیا۔ وہ دراز قد اور خوبصورت تھی۔ اس کے حسین چہرے کی دلکشی کو سوگواری نے اور دلنشین بنا دیا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں سے جھانکتی ہوئی اداسی نے اس کی آنکھوں میں بہت سی ان کہی کہانیوں کے رنگ بھر دیئے تھے۔ اس نے ایک تنقیدی نگاہ اس پر ڈالی اور مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''احمد مراد آپ تو بہت چھوٹے سے ہیں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ شاید آپ کوئی گھاگ قسم کے صحافی ہیں۔'' اس نے قریب آ کر بزرگانہ شفقت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تو احمد مراد کو بہت اچھا لگا۔

''تشریف رکھیئے۔'' اس نے ایک نشست کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی باوقار چال چلتی ایک صوفے پر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

احمد مراد کو اپنے دل میں ایک انوکھی تفاخر آمیز مسرت کسی قدرتی چشمے کی طرح پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے میڈم خوش بخت کے متواضع انداز سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے اسے ناپسند نہیں کیا۔ یہ امید کی جا سکتی تھی کہ یہ ملاقات مزید کچھ اور ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ اس نے ایک محتاط سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ بھی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے سوال پڑھے نہیں جاتے تھے۔ وہ اداسی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

احمد مراد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔

''میڈم! میں بہت شکر گزار ہوں۔ کہ آپ نے مجھے شرف ملاقات بخشا ہے۔''

ملازم چائے رکھ گیا۔ وہ اس کے لئے چائے بنانے لگی۔ مراد نے قدرے بے تکلف لہجے میں کہا۔

''میرے لئے کم دودھ' کم میٹھے کی۔ خالص چائے بنایئے گا۔''

وہ چینی ڈالتے ہوئے رک گئی۔ ''تم ایسی چائے پیتے ہو۔'' اس کا انداز گھریلو تھا۔

مراد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نہیں۔ ایسی چائے نہ پیا کرو۔ نقصان کرتی ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔''

میڈم خوش بخت نے پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ لو۔ آج سے ایسی چائے پیا

کرو۔ دودھ اور میٹھے کے ساتھ۔'' اس کے لفظوں میں ایک مشفقانہ سی تھپک تھی۔

مراد نے پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور بولا۔'' میڈم! مجھے آپ کا اس طرح کہنا بہت اچھا لگا ہے۔ آپ کے ''تم'' کہنے میں بڑی اپنائیت ہے۔ مجھے آپ کی یہ شفقت بہت اپنی اپنی سی لگ رہی ہے۔''

'' تم بھی۔ تم بھی۔ نہ جانے کیوں۔'' اس نے بے ساختہ کچھ کہنا چاہا۔ لیکن پھر خاموش ہوگئی اور اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

احمد مراد نے پیالی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے گھونٹ گھونٹ چائے پیتی رہی۔ پھر چند لمحوں بعد اس نے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس سے نگاہ ملتے ہی وہ بولا۔'' میں انتظار کررہا ہوں۔ آپ اپنا فقرہ تو مکمل کیجئے۔''

''کون سا فقرہ؟'' وہ غائب دماغی سے بولی۔

'' ابھی جو آپ کہنے والی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ جو آپ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔ وہ کہہ ڈالیئے نا۔'' مراد نے اصرار کیا۔

اس نے تراشیدہ لبوں کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبایا۔ اور جیسے موضوع بدلنے کو بولی۔

'' چائے پیو نا تم۔ ٹھنڈی ہورہی ہے۔''

مراد نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔'' آپ نے مجھے ٹال دیا ہے۔ چلئے پھر کبھی سہی۔''

اس نے جواب نہیں دیا۔ اور چائے کے ساتھ مختلف لوازمات اسے اصرار سے پیش کرنے لگی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر مراد نے کچھ محتاط سے انداز میں تمہید باندھی۔

'' میڈم! آپ زندگی کے اس موڑ پر ہیں۔ جہاں آپ کے پاس بہت سے تجربات۔ بہت سے مشاہدات ہیں۔ آپ اسے آئندہ نسلوں تک منتقل نہیں کرنا چاہتیں؟''

وہ بے ساختہ مسکرائی۔'' تم نے لفظ تو اچھے استعمال کئے ہیں۔ لیکن مطلب وہی ہے۔ تم صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم اپنے پرچے کیلئے کسی دلچسپ موضوع کی تلاش میں ہوں۔''

'' پلیز۔ میرا یہ مطلب نہیں۔'' مراد نے کھسیا کر جلدی سے کہا۔

'' میں تو میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ آپ کے بارے میں کچھ جانوں۔ آپ سے کچھ باتیں کروں۔ میں۔ اور سب آپ کے پرستار۔ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کے فن کی قدر کرتے ہیں۔''

اس نے گہرا سانس لے کر ناگواری سے سر جھٹکا۔ اور بیزاری سے کہنے لگی۔'' میں لوگوں کی محبت کی قدر کرتی ہوں۔ انہیں میرے فن سے ہی سروکار ہونا چاہیے۔ وہ میری ذات میں تو دخل نہ دیں۔ یہ تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا کہ اس کی ذاتی باتیں موضوع گفتگو بنیں۔ دوسروں کے سامنے آئیں۔''

احمد مراد اس کے انداز کی ہلکی سی درشتی سے گھبرایا۔ اور اپنے لہجے کو موثر بناتے ہوئے بولا۔'' میڈم آپ درست کہہ رہی ہیں کہ کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ذاتی باتیں دوسروں کے سامنے آئیں۔ لیکن کوئی تو ایسا ہوتا ہے نا۔ جس کے ساتھ انسان اپنے دکھ بانٹتا ہے۔ جس کو وہ اپنے زخم دکھاتا ہے۔ مجھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کی زندگی میں کوئی شدید المیہ ہے۔ جس نے آپ کو الگ تھلگ کر دیا ہے۔ آپ انسانوں سے خوفزدہ سی ہیں۔ مجھے لگتا ہے۔ جیسے آپ تنہائی اور اکیلے پن کے جزیرے میں گھٹ رہی ہیں۔''

میڈم خوش بخت جو پہلے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ کر اپنا سر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دھیمے دھیمے سلگ رہی ہے۔ اندر ہی اندر پگھل رہی ہے۔ وہ دانستہ خاموش ہوگیا۔ تو خوش بخت نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں۔ لیکن ان میں اداسی و تاسف اور غم نمی بن کر تیر رہے تھے۔

'' زندگی تو نام ہی المیوں کا ہے۔ ہر ایک کی زندگی میں کوئی نہ کوئی المیہ ہوتا ہی ہے۔'' وہ بجھے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

'' لیکن ہر ایک کی زندگی میں۔ کوئی دوست' کوئی ہمدرد ایسا بھی تو ہوتا ہے جس کے ساتھ بات کر کے اس المیے کا زخم کم ہو جاتا ہے۔ جو اس المیے کے دکھ کو بانٹ لیتا ہے۔ میڈم! مجھے لگتا ہے۔ جیسے آپ کے پاس تنہائی کے سوا کوئی اور نہیں۔ آپ کے پاس کوئی ہمدرد۔ کوئی غمگسار نہیں۔''

خوش بخت نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبائے اس کی بات سنتی رہی۔ نہ جانے کونسی بات اس کے دل پر جا لگی کہ دو شفاف آنسو اس کی خوبصورت اداس آنکھوں سے بہہ کر اس کے رخساروں پر آگئے۔ مگر اسے ان کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوبی ڈوبی سی بولی۔

'' میں نے کبھی کسی کے سامنے اپنے دکھ کھول کر نہیں رکھے۔ کبھی کسی کو اپنے زخم نہیں

دکھائے۔لیکن نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کرلوں۔تم سے کچھ کہہ دوں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔نہ جانے کیوں؟ پتہ نہیں کیوں؟''

اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی۔اس مدھم مدھم سی خودکلامی نے مراد کے حساس دل میں خلوص اور ہمدردی کے سرچشمے کا رخ اس کی جانب پھیر دیا۔وہ اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں رہ سکا۔ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔اور قدرے خم ہو کر بولا۔''میڈم! میں اس عزت افزائی کے لئے ممنون ہوں۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دوں گا۔ میں صرف ایک انسان' ایک دوست' ایک ہمدرد کی طرح آپ کی ہر بات سنوں گا۔اور یہ باتیں نہ کبھی میری زبان تک پہنچیں گی۔نہ میرے قلم کی نوک تک۔مجھ پر اعتبار کریں پلیز۔''

اس کا لہجہ اس کے اندر کی سچائی اور خلوص میں بھیگا ہوا تھا۔

خوش بخت نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔''کھڑے کیوں ہو۔بیٹھ جاؤ نا۔''

مراد اپنی جگہ پر واپس نہیں بیٹھا۔بلکہ اس کے صوفے کے نزدیک ہی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''اس طرح فرش پر نہ بیٹھو!'' وہ بولی۔

''نہیں جناب! مابدولت یہیں پر ٹھیک ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔میڈم خوش بخت چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔پھر اس کے ہونٹوں پر ایک زخم خوردہ سی مسکراہٹ آئی۔

''تمہاری عمر بہت کم ہے۔تم بھری پری دنیا میں سب کے درمیان رہتے ہو۔تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ جو تنہا رہ جاتا ہے۔اس پر کیا گزرتی ہے۔جس سے سارے رشتے پلک جھپکتے میں چھین لئے جائیں۔وہ کیسے کیسے عذاب جھیلتا ہے۔''

مراد نے اسے ٹوکا نہیں۔اس کی باتوں میں کوئی دخل نہیں دیا۔کوئی سوال نہیں کیا۔وہ چاہتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ دے۔جس طرح کہنا چاہتی ہے۔اسی طرح کہے۔وہ خود کچھ بول کر اس کی سوچوں کا رخ' اس کے کہنے کا انداز' اس کے لفظوں کا مفہوم اور سمت نہیں بدلنا چاہتا تھا۔وہ اس کے مقابل بیٹھی تھی۔لیکن کہیں بہت دور دیکھ رہی تھی۔

وہ اذیت سے کراہتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔''مجھ سے تو دنیا نے سارے ہی رشتے چھین لئے۔خون کے رشتے' محبت کے رشتے' عزت کے ناطے۔جینے کے ڈھنگ' مرنے کے اختیار۔انہوں نے میرے پاس کچھ بھی نہیں رہنے دیا۔انہوں نے مجھے صرف

عورت بنا دیا۔صرف عورت۔!!اس نے سر جھکا لیا اور ہونٹ کاٹ کر جیسے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

احمد مراد کے دل کی دنیا میں ویرانی سی چھا گئی۔خوش بخت کے وہ سلگتے ہوئے آنسو جنہیں اس نے اپنے رخساروں پر نہیں بہنے دیا تھا۔احمد مراد کے دل پر گرنے لگے۔وہ اس کی تسلی کیلئے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔اس نے لمحے بھر کو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

وہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔''میں گلے گلے دکھوں میں ڈوبی ہوں۔انسانوں سے دور رہ رہ کر۔خود کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں مجھ پر کیا کچھ نہیں گزری۔میرے ماں باپ نے تو بڑے چاؤ سے میرا نام بھاگ بھری رکھا تھا۔لیکن انہیں۔کیا خبر تھی۔''

وہ لحظہ لحظہ اپنی یادوں کو سمیٹنے لگی۔ایک ایک کر کے بھٹکے ہوئے لمحوں کو قریب بلانے لگی۔وہ پل پل کو ڈھونڈنے لگی۔وہ لمحہ لمحہ چننے لگی۔اس کے دلکش چہرے پر قرار و بیقراری کی دھوپ چھاؤں کھلنے لگی۔کبھی شفاف آنسو اس کے رخساروں کو بھگو دیتے۔کبھی وہ سسکیوں میں ڈوب جاتی اور کبھی آہوں میں بہنے لگتی۔

احمد مراد کو یوں محسوس ہوتا تھا۔جیسے وہ کبھی اس ملکوتی مسکراہٹ میں ڈھل جاتا ہے۔جو بھاگ بھری کے کنوارے لبوں پر کھلتی تھی۔کبھی وہ آنسو بن جاتا ہے۔جو بخت آور کا مقدر تھے۔کبھی وہ نصیبہ کے لبوں کی آہ بن جاتا ہے اور کبھی میڈم خوش بخت کے پرسوز نغمے میں ڈھل جاتا ہے۔

وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا۔ان سارے مرحلوں میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔اس کا دل احترام سے بھر گیا۔اس کی آنکھیں عقیدت سے نم ہو گئیں۔اس نے بہت کچھ کہنا چاہا۔لیکن ایک لفظ بھی نہیں بول پایا۔اس نے اپنا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھا اور پوری سچائی سے بولا۔

''میڈم! میں آپ کی ہمت کو۔آپ کے جذبوں کو سلام کرتا ہوں۔آپ نے ہر قالب میں بھاگ بھری کی روح کو زندہ رکھا ہے۔اسے مرنے نہیں دیا۔''

وہ ایک آہ سی بھر کر کچھ کہنے ہی والی تھی۔کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

''آ جاؤ۔'' وہ وہیں بیٹھے بیٹھے قدرے بیزاری سے بولی۔

اس کا سیکرٹری کمرے میں داخل ہوا۔اور اسے کسی ریکارڈنگ کے بارے میں بتانے لگا۔احمد مراد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا میڈم۔ مجھے بھی اجازت دیجئے۔" سیکرٹری باہر نکل گیا تو اس نے کہا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے پھر بڑی اپنائیت سے اس کے سر پر یوں ہاتھ پھیرا۔ جیسے اس کی کوئی بزرگ ہو۔ اور مشفق سے لہجے میں بولی۔

"تم بہت اپنے اپنے سے لگتے ہو۔ تمہاری صورت۔" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو کر اپنی بات کو ادھورا ہی رہنے دیا۔

"جی کہیے! کیا ہے میری صورت کو؟" احمد مراد نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"بہت اچھی ہے۔" وہ محبت سے اس کا رخسار چھو کر بولی۔

"شکریہ...... شکریہ!" مراد نے شرارت سے آداب کیا اور چلتے چلتے بولا۔

"اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں کبھی کبھی حاضر ہو جایا کروں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔ کیوں نہیں۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ مراد اسے خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔

احمد مراد اپنے وکیل دوست کے ساتھ جیل آیا تھا۔ اس کا یہ دوست انسانی حقوق کی ایک تنظیم کا بانی تھا۔ وہ ایسے قیدیوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ جو کسی وجہ سے بے قصور۔ بے جرم کسی مقدمے میں پھنس گئے تھے اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے۔

احمد مراد بھی اپنے پرچے میں ایسے لوگوں کے بارے میں لکھتا رہتا تھا۔ جو اس کے دوست کی کوششوں سے آزادی کی فضا میں سانس لینے کے قابل ہوئے تھے۔ جیلر شاید ان کے ساتھ کچھ زیادہ اچھی طرح سے پیش نہ آتا۔ لیکن اس کا دوست اوپر سے کوئی پیغام لایا تھا۔ اسی لئے وہ ان کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے انہیں چائے بھی پلوائی۔ اپنے عملے سے معلوم کر کے اس نے بتایا کہ اس جیل میں بھی ایک ایسا قیدی تھا۔ جو ایک عرصے سے سزا کاٹ رہا تھا۔ لیکن اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا کہ وہ کس جرم میں گرفتار ہوا تھا۔ اس سے بھی کوئی ملنے نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کسی نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی۔

"آپ اس سے ملاقات تو کروا دیجئے سر!" اس کے وکیل دوست مجاہد نے کہا۔

"لیکن مجاہد صاحب یہ خیال رہے کہ آپ کے یہ احمد مراد اپنے پرچے میں انسانی ہمدردی کا ڈھونڈورا پیٹ کر خوانخواہ پولیس کو بدنام نہ کریں۔ یہ مجرم پتہ نہیں کون ہے۔ اس کا

ریکارڈ کس طرح ضائع ہوا۔ ہمیں اس کی خبر نہیں۔ نہ ہی ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن بدنامی ہماری مفت میں ہو گی۔"

احمد مراد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "جناب آپ کا یہ نیازمند۔ اگر کچھ لکھے گا بھی۔ تو ان ہی لوگوں کے بارے میں۔ جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ آپ پر انشاء اللہ۔ کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

جیلر نے ناگواری سے پیشانی پر بل ڈالے۔ "مراد صاحب لوگ تو پہلے ہی پولیس کی جان نہیں چھوڑتے۔ اور محکموں میں بھی بہتیری بے قاعدگیاں ہیں۔ لیکن لوگوں کی زبانوں پر بس پولیس کا نام ہی چڑھ گیا ہے۔"

مجاہد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کی توجہ بٹ گئی۔ احمد مراد نے بھی دروازے کی طرف دیکھا۔ کھچڑی بالوں اور بے ترتیب داڑھی والا ایک لاغر سا بوڑھا ایک پولیس اہلکار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

قریب ہی بیٹھا ہوا ایک اور پولیس اہلکار بولا۔ "یہ جناب بڑی پہنچی ہوئی چیز ہے۔ سارے قیدی اسے پیر مانتے ہیں پیر۔"

"بہت خوب!" مجاہد نے دلچسپی سے کہا۔

"اور یہ خود کیا کہتا ہے۔ کہ واقعی یہ پیر ہے۔" احمد مراد نے پوچھا۔

"آپ خود بات کر کے دیکھ لیں کہ پیر ہے یا ویسے ہی کوئی چکر چلا رہا ہے۔" اس نے آنکھ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

تب تک وہ قریب آ چکا تھا۔ مجاہد نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"آؤ۔ آؤ۔ بابا بیٹھو۔"

اس نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ پھر کرسی کی طرف دیکھا۔ کچھ متذبذب ہوا۔ لیکن پھر وہیں زمین پر بیٹھنے کیلئے جھکا۔

"نہیں۔ نہیں بابا۔ کرسی پر بیٹھو۔" احمد مراد نے بے ساختہ کہا۔ اسے اس پریشان حال بوڑھے کو دیکھ کر افسوس سا ہو رہا تھا جس کی شاید ساری عمر جیل کی ان سنگین دیواروں کی نذر ہو گئی تھی۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے یوں اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو یا جیسے اس کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو۔

"ہاں۔ ہاں بابا۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔" جیلر نے بھی کہا۔

"او بیٹھو بزرگو۔ بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔ دیکھتے کیا ہو؟" ایک دوسرا پولیس والا بولا۔

وہ کچھ جھجکا۔ اور ذرا اکھڑے ہوئے سے انداز میں کرسی پر یوں بیٹھ گیا۔ جیسے ابھی اٹھ کر چل دے گا۔

"کیا نام ہے بابا جی آپ کا۔" مجاہد نے پوچھا۔

اس نے سر کو ایک بے معنی سی جنبش دی۔ اور یوں خاموش رہا۔ جیسے اس کی بات ہی نہ سمجھا ہو۔ مجاہد نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر اس نے اپنا سوال دوہرایا۔

"بابا جی۔ آپ کا نام پوچھا ہے۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پولیس والوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ان سے ہی پوچھ لو۔ انہیں سب کچھ پتہ ہے۔"

مجاہد نے احمد مراد کی طرف دیکھا۔ احمد مراد نے اسے مخاطب کیا۔ "بابا جی! آپ کے ریکارڈ کی فائل گم ہوگئی ہے۔ کچھ آپ کو یاد ہے کہ آپ کو کس جرم کی سزا ہوئی تھی اور کتنی؟"

بوڑھے نے لاعلمی کا اشارہ کیا اور ہارے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"بیٹا! سب کچھ انہیں ہی پتہ ہے۔ جنہوں نے مجھے سلاخوں میں بند کر رکھا ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ ان سے ہی پوچھ لے۔ مجھے کیا پتہ ہے۔ میں تو کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"بابا جی! آپ کا کوئی گھر بار۔ کوئی عزیز رشتہ دار۔ کسی کا کوئی پتہ" مجاہد نے موضوع بدلا۔

اس کا چہرہ متغیر سا ہوگیا۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا گھر بار؟ کیا عزیز رشتہ دار؟ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ کوئی کسی کا نہیں۔" وہ بے خیالی میں کہتا ہوا۔ چلنے لگا۔

"بابا جی۔ ٹھہرو تو سہی نا۔" مجاہد نے اس کو روکا۔

"او بابا۔ بیٹھ جا۔ بیٹھ جا۔" پولیس اہلکار نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں اسے بیٹھنے کیلئے کہا۔ "یہ تیرے بھلے کی بات ہی کر رہے ہیں۔"

"میرا بھلا ہی بھلا ہے۔" وہ بیزاری سے کہہ کر پھر اکتایا ہوا سا بیٹھ رہا۔

"بابا جی! یہ بہت بڑے وکیل ہیں۔ یہ آپ کو رہائی دلوائیں گے۔ یہ پہلے بھی ایسے

بہت سارے قیدیوں کے مقدمے لڑ چکے ہیں۔ جو بے گناہ جیلوں میں بند ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔" احمد مراد نے اس کی حوصلہ افزائی کیلئے کہا۔ اس نے ایک نگاہ سارے چہروں پر ڈالی۔ جو کمرے میں موجود تھے اور زہر خند سے بولا۔

"بیٹا! کیا رہائی اور کیا قید؟!!! اب تو سب کچھ برابر ہے تم تکلیف نہ کرو۔ میں یہاں آرام سے ہوں۔ خوش ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں ہے یہاں مجھے۔ میں یہاں دنیا والوں سے بچا ہوا ہوں۔ میں باہر جا کر کیا کرونگا۔ میں نے باہر جا کر کیا کرنا ہے۔"

احمد مراد کو افسوس سا ہوا۔ بوڑھا جیل کی چاردیواری کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اب اس سے نکلنا اسے عذاب سا لگ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی تسلی کیلئے کہا۔

"نہیں بابا جی! آزادی آپ کا حق ہے۔ آپ کو ہم یہاں سے باہر نکالیں گے۔ آپ باہر آئیں گے تو دنیا آپ کو اچھی لگے گی۔"

"نہ بیٹا! نہ تم تکلیف نہ کرو۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ بڑا آرام ہے مجھے۔ زیادہ گزر گئی۔ تھوڑی رہ گئی ہے۔ باہر جا کر کیا کرنا ہے۔ تمہاری بڑی مہربانی۔" وہ اپنی جگہ سے پھر ایک مرتبہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دور کھڑے ہوئے پولیس اہلکار نے اپنے سر کے قریب انگلی گھما کر اشارہ کیا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ جیلر نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔

"کیوں بابا۔ تم رہا نہیں ہونا چاہتے۔"

اس نے پھر کچھ مبہم سے اشارے کئے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اور پاؤں گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔

"او بابا جی! بات سنو ان کی بیٹھ کر۔" پولیس اہلکار نے درشتی سے اسے رک جانے کو کہا۔

لیکن مجاہد نے اشارے سے منع کر دیا۔ اور جیلر سے بولا۔

"بابا کچھ پریشان ہے۔ تھوڑے دنوں بعد اس سے پھر گپ شپ کریں گے۔ تب تک آپ ذرا اور اس کے ریکارڈ کو تلاش کروا لیجئے گا۔ میں بھی کوشش کروں گا۔"

"بس جی ملک کے سیاسی حالات خراب رہتے ہیں۔ ادھر ادھر کی اکھاڑ پچھاڑ۔ ٹرانسفریں۔ تبادلے۔ بس اس سارے چکروں میں کوئی نہ کوئی گھپلا بھی ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں۔ ہم آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔" وہ پیشہ ورانہ خوش اخلاقی سے کہنے لگا۔

مجاہد اور احمد مراد دونوں اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئے۔ دونوں برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ ایک پولیس والے سے سامنا ہو گیا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

''سر جی! آپ جس بابے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں نا۔ وہ بڑا پہنچا ہوا ہے۔''

مجاہد ہنسا۔''اتنا پہنچا ہوا ہے کہ جیل ہی پہنچ گیا ہے۔''

''نہیں جی! بڑا اثر ہے اس کی بات میں۔ جو کہہ دے وہ ہو جاتا ہے۔ بڑی دعائیں قبول ہوتی ہیں اس کی۔''

''تو پھر اپنی رہائی کی دعا کیوں نہیں کرتا۔ پتہ نہیں کب سے جیل میں پڑا سڑ رہا ہے۔'' مجاہد نے اس کا مذاق اڑایا۔

''آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں۔'' اس نے سر جھکا تھوڑا قریب ہو کر بڑی رازداری سے بولا۔'' آپ کو کیا پتہ۔ ایسے اللہ والے تو آپ خلقت سے دور بھاگتے ہیں۔ بابا جی نے بھی یہاں جیل میں ڈیرہ جما لیا ہے۔ بس اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں۔''

''کبھی تمہاری کوئی آرزو بھی پوری ہوئی ہے۔'' احمد مراد نے پوچھا۔

''ہاں۔ ہاں جی۔ چار بیٹیوں کے بعد اللہ نے بیٹا دیا ہے۔ بابا جی کی دعا سے۔'' وہ بڑی عقیدت سے بولا۔

مجاہد پھر کوئی شرارت آمیز فقرہ کہنے لگا تھا کہ احمد مراد نے اسے روک دیا۔ اس پولیس اہلکار سے پھر آنے کا کہہ کر وہ مجاہد کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

دونوں باہر سڑک پہ آئے۔ تو اس کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ دونوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اس بوڑھے کو رہائی دلوائیں گے۔ وہ کچھ دور ہی چلے تھے۔ گاڑی جھٹکے لینے لگی۔

''اوئے۔ بابا جی نے تو ابھی سے کارروائی ڈال دی۔'' مجاہد ہنستے ہوئے بولا۔ مراد کو بھی ہنسی آ گئی۔''اس کا مطلب ہے۔ پٹرول میں کچرا بھی بابا جی ہی ڈالتے ہیں۔''

''بھئی۔ ہم نے جو ان کی شان میں گستاخیاں کی ہیں۔ کیا پتہ وہ ہماری خبر لینے کے موڈ میں ہی آ گئے ہوں۔'' مجاہد گاڑی کو فٹ پاتھ کے ساتھ لگاتا ہوا بولا۔

دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ مجاہد اس کی ٹھوکا ٹھاکی میں لگ گیا۔

''یار! ہمارے حال پر رحم کیا کرو۔ اس شاہی سواری میں ہمیں نہ بٹھایا کرو۔'' مراد نے

اسے چھیڑا۔

''ابھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ بلکہ دیکھتا ہوں کہ ٹھیک کیسے نہیں ہوتی۔'' مجاہد اس کے پرزوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ لیکن اس کی درستگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔

مراد بھی اکتا کر قریب آ گیا۔ اور اپنی جانب سے بھی کچھ مشورے دینے لگا۔

اچانک ان کے قریب گاڑی کا ہارن بجا۔ دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پردوں والی ایک لمبی سی گاڑی کچھ دور رکی کھڑی تھی۔ تھوڑا سا پردہ ہٹا اور ایک چہرے نے جھانکا۔ احمد مراد تیزی سے اس جانب بڑھا اور اس نے خوشی کے لہجے میں کہا۔

''میڈم خوش بخت آپ؟'' تب تک مجاہد بھی ہاتھ جھاڑتا ہوا قریب آ گیا۔

''یار! یہ میڈم خوش بخت ہیں۔'' مجاہد نے اشتیاق سے کہا۔ اور پھر احمد مراد سے بولا۔''یار ہمارا بھی تعارف کروا دو۔''

''میڈم! یہ میرا بہت اچھا اور تھوڑا سا خبیث دوست مجاہد ہے۔''

''خبیث کیوں؟'' خوش بخت نے ہنس کر پوچھا۔

''اس لئے کہ اس کا دوست ہوں۔'' مراد کے بولنے سے پہلے مجاہد بول اٹھا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''اس کا چھکڑا۔ خراب ہو گیا ہے اور اب ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا۔'' احمد مراد نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ۔ میں چھوڑ دیتی ہوں۔'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''اسے یہیں بند کر دو۔''

احمد مراد نے مجاہد کی طرف دیکھا۔'' کیا خیال ہے؟''

''بہت نیک خیال ہے۔ ایسی حسین پیشکش کو کون کافر ٹھکرا سکتا ہے۔'' مجاہد نے فوراً کہا۔

''تو پھر اس کو بند کرو۔'' احمد مراد نے فوراً کہا۔

مجاہد جب تک گاڑی بند کر کے آیا۔ احمد مراد گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ بھی پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ تو خوش بخت نے استفسار کیا۔'' کہاں جائیں گے آپ لوگ؟''

''ہمیں دفتر تک چھوڑ دیں۔'' احمد مراد نے بتایا۔

’’اس وقت کہاں سے آ رہے تھے؟‘‘ اس نے شاید یونہی بات کرنے کو پوچھ لیا۔

’’جیل سے۔‘‘ احمد مراد نے بتایا۔

’’جیل سے؟‘‘ میڈم خوش بخت نے تعجب سے دوہرایا۔ ’’کیوں خیریت تو تھی۔‘‘ یہ آج کل کونسی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں تم نے۔‘‘

’’کیا بتاؤں میڈم! یہ تو بالکل ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ ابھی ابھی اس کی ضمانت کروا کر لایا ہوں۔‘‘ مجاہد نے شرارت سے کہا۔

’’ارے کیا واقعی؟‘‘ میڈم خوش بخت نے ہنس کر پوچھا۔

مراد ہنسا۔ ’’میڈم! میں نے تو آپ کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ یہ میرا دوست تھوڑا سا خبیث بھی ہے۔‘‘

’’بھئی اب چاہے۔ خبیث کہو یا کچھ اور ہم نے تو تمہاری ضمانت کرا دی ہے۔‘‘ مجاہد بدستور شرارت کے موڈ میں تھا۔

احمد مراد نے موضوع بدلا۔ ’’دراصل میڈم! یہ مجاہد انسانی حقوق کی ایک تنظیم کا کرتا دھرتا ہے۔ یہ لوگ ایسے بے سہارا اور لاوارث قیدیوں کو قانونی امداد فراہم کرتے ہیں جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے جیل گئے اور اس کے بعد کسی نے ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اور وہ بیچارے مفت کی قید بھگتتے رہے۔‘‘

’’اوہو!‘‘ میڈیم خوش بخت نے حیرت آمیز تاسف سے کہا۔ ’’یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ اس طرح بھی ہوتا ہے۔‘‘

’’اس طرح ہوتا ہی نہیں۔ اس طرح ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی ہم جس قیدی سے مل کر آ رہے ہیں۔ اس کی تو شاید ساری عمر ہی جیل میں گزر گئی ہے اور تھانے میں نہ اس کا ریکارڈ ہے۔ نہ کوئی اور خاص تفصیل۔‘‘ مجاہد نے بتایا۔

’’اچھا۔ کمال ہے۔‘‘ میڈم نے حیرت سے کہا۔ ’’اور وہ قیدی خود کیا بتاتا ہے۔‘‘

’’اس بیچارے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔‘‘ اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہاں قیدیوں نے اسے پیر مشہور کر دیا ہے۔‘‘

’’اور وہ بھی بڑا پہنچا ہوا پیر۔ کہتے ہیں۔ اس کی سب دعائیں قبول ہوتی ہیں۔‘‘

’’یہ تو تم لوگ مجھے بہت عجیب عجیب باتیں سنا رہے ہو۔‘‘ میڈم نے کہا۔

’’ذرا اس کی رہائی ہو جائے نا۔ تو ہم آپ کو اس سے ملوائیں گے۔‘‘

’’نہ بابا! میں کسی سے نہیں ملتی ولتی۔ ہاں کوئی مالی امداد وغیرہ چاہئے ہوگی تو مجھے بتایئے گا۔‘‘

’’نہیں۔ نہیں میڈم! آپ گھبرائیں نہیں۔‘‘ مجاہد نے ہنس کر کہا۔

’’میں نے تو اس لئے کہہ دیا تھا۔ کہ کہیں آپ نے کوئی منت وغیرہ پوری کروانی ہو۔ تو اس بابے سے کہہ دیجئے گا۔‘‘

’’نہیں بھئی۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔‘‘

تب تک ان کا دفتر نزدیک آ گیا تھا۔ احمد مراد نے اسے رکنے کیلئے کہا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔‘‘

میڈم آیئے نا۔ کچھ چائے وغیرہ پیجئے پلیز۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘ وہ مسکرا کر بولی۔

’’تم کبھی میرے یہاں آنا۔ تو مل کر چائے پئیں گے۔‘‘

’’مجھے بھی اجازت ہے میڈم۔‘‘ مجاہد چپ نہیں رہ سکا۔

’’چلئے آپ بھی تشریف لے آیئے گا۔‘‘ احمد مراد نے اپنا کالر چھوتے ہوئے بن کر کہا۔

اچھا بھئی۔ میں چلتی ہوں۔‘‘ وہ بولی۔

’’خدا حافظ میڈم۔‘‘ دونوں نے ایک ساتھ کہا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

چند روز نہیں گزرے تھے کہ وہ میڈم خوش بخت کے یہاں جا دھمکے۔ چوکیدار مراد کو پہچاننے لگا تھا۔ اس لئے اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بلکہ دو بالشت زبان باہر نکالے ہوئے بکرے جتنے موٹے تازے خونخوار کتے کو بھی اس نے ایک طرف بھگا دیا اور ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔

مجاہد نے چاروں طرف ایک ستائشی نگاہ ڈالی۔ ’’واہ بھئی۔ میڈم کا ذوق تو کافی عمدہ معلوم ہوتا ہے۔‘‘

’’وہ خود کونسی کم عمدہ ہیں۔ جیسی اچھی شخصیت کی مالک ہیں۔ ویسا اچھا ان کا ذوق ہے۔‘‘ احمد مراد دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز کو دیکھتے ہوئے بولا۔

پردہ ہٹا اور میڈم خوش بخت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ ایک دلآویز مہک بھی چلی آئی۔ سادہ سے ریشمی جوڑے میں وہ بے حد پروقار اور پرکشش معلوم ہو رہی تھی۔ وہ

دونوں جلدی سے ٹھٹک کر تعظیماً اس کے سامنے خم ہوئے۔ وہ خوش دلی سے بولی۔ ''آپ لوگ کیسے ہیں؟''

''خدا کا شکر ہے۔'' دونوں نے ایک ساتھ بڑی تمیز سے کہا۔

''بیٹھیے۔'' وہ ایک نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ مجاہد نے فوراً ہی سلسلہ کلام جوڑا۔ ''میڈم! آپ یقین کریں کہ میں آپ کی آواز کا زبردست پرستار ہوں۔ میری کار میں ہر وقت آپ کی کیسٹ رہتی ہے۔ میں اپنے دفتر میں بھی جب بھی کام کرتے کرتے بہت تھک جاتا ہوں۔ تو مدھم مدھم آواز میں آپ کا نغمہ سنتا ہوں۔ تو بڑی تسکین ہوتی ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ سے یوں آسانی سے ملاقات ہو جائے گی اور اس طرح آپ کو روبرو دیکھوں گا۔''

''شکریہ!'' اس نے اتنی لمبی تقریر کے جواب میں بس ایک لفظ ہی کہا اور احمد مراد سے بولی۔

''تم بہت دنوں بعد آئے ہو۔ خیریت تو تھی؟''

''آج بھی میں اس کو گھسیٹ کر لایا ہوں۔ ورنہ یہ تو اپنی مصروفیت کا رونا روتا ہی رہتا ہے۔'' اس کے بجائے مجاہد نے بات پکڑ لی۔

''کیوں مراد! ایسی ہی بات ہے؟'' وہ بزرگانہ سرزنش کے انداز میں بولی۔

''اب تو اقرار کرنا ہی پڑے گا میڈم کہ ایسی ہی بات ہے۔'' مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن اصل میں بات یہ ہے کہ میں آپ کے پاس کسی کام سے نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں تو جب بھی آتا۔ بس آپ سے ملنے۔ آپ کی اچھی اچھی باتیں سننے۔ اور آپ کے ہاتھ کی بہت اچھی سی چائے پینے۔ مگر یہ شخص۔ جب تک اسے کام نہ ہو۔ کہیں جاتا ہی نہیں۔''

''ایسا کیا کام آ پڑا ہے مجاہد صاحب!'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

مجاہد گڑبڑایا۔ ''اوہو ہو ہو۔ میڈم۔ اس نے تو میری ساری ساکھ ہی خراب کر کے رکھ دی ہے۔ اب میں کیا کہوں؟''

''آپ اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں۔'' مراد نے لقمہ دیا۔

''نہیں۔ میں بغلیں جھانکوں گا۔'' مجاہد بے ساختہ بولا۔ تو میڈم خوش بخت کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

ملازم چائے لے آیا۔ تو میڈم خوش بخت چائے بنانے لگی۔ وہ پیالی مجاہد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔ مجاہد صاحب فرمائیے۔ کیا کام ہے آپ کو؟''

''اف! اس نے برا سا منہ بنایا۔'' اس نامعقول شخص نے مجھے کس قدر بدنام کر دیا ہے۔ توبہ! توبہ!''

''اب چاہے تم توبہ کرو یا کچھ۔ میڈم کو اصل بات تو پتہ چل ہی گئی ہے۔ اس لئے زیادہ بنو نہیں اور اصل مطلب کی طرف آ جاؤ۔'' مراد نے کہا۔

''میڈم بات یہ ہے۔'' وہ سیدھا ہو بیٹھا اور سنجیدگی سے بولا۔ ''کہ اس روز میں نے اس قیدی کی آپ سے بات کی تھی نا۔ جس کی ساری عمر جیل میں گزر گئی ہے۔ ہماری تنظیم کی کوششوں سے وہ عنقریب رہا ہونے والا ہے۔''

''بہت خوب! یہ تو آپ بڑی نیکی کا کام کر رہے ہیں۔'' میڈم خوش بخت نے ستائشی انداز میں کہا۔

''شکریہ میڈم!'' وہ بولا۔

''ہم اس طرح کے لوگوں کیلئے دوبارہ معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کا انتظام بھی کرتے ہیں تاکہ وہ خود کو ٹھکرائے ہوئے نہ سمجھیں اور ایک نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ وہ شخص کافی عمر رسیدہ ہے۔ کہیں کوئی مزدوری یا سخت کام تو نہیں کر سکتا۔ ہمیں آپ سے معلوم کرنا تھا کہ آپ کے یہاں اسے کوئی کام مل سکتا ہے؟ ماشاءاللہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے۔ آپ اسے کسی طرح اپنے یہاں ایڈجسٹ کر سکتی ہیں؟''

خوش بخت کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر قدرے پس و پیش کے انداز میں بولی۔

''مجاہد صاحب! میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرے تمام ملازم اعتبار کے لوگ ہیں۔ میں کسی اجنبی کو اپنے یہاں رکھ نہیں سکتی۔ ہاں۔ میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ مالی تعاون کر سکتی ہوں۔ اس شخص کو بھی مالی امداد کی ضرورت ہے تو میں کرنے کو تیار ہوں۔''

احمد مراد نے بھی سر ہلایا۔ ''ہاں یار! میڈم کہتی تو ٹھیک ہیں۔ ابھی ہمیں اس شخص کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات تو ہیں نہیں۔''

''جیل والے بتاتے ہیں کہ اس کا چال چلن بہت اچھا ہے۔'' مجاہد نے کہا۔

''لیکن میڈم بھی ٹھیک کہتی ہیں۔ میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔''

''میں آپ کو ایک چیک دے دوں گی۔ آپ اس کو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروا دیجئے گا۔ کہیں کوئی دکان یا کھوکھا لے دیجئے گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی اور پردہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''چلو یار! ان کی طرف سے یہ تعاون بھی بہت ہے۔'' مجاہد نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''میں اس بابے کا کچھ اور انتظام کرتا ہوں۔''

میرا خیال ہے کہ کچھ روز اسے بے سہارا بوڑھوں کے اداروں میں رکھا جائے۔ کوئی اور انتظام ہو گیا تو بہتر ہے۔ ورنہ اس کے لئے جیل سے تو بہتر ہی ماحول ہو گا۔'' مراد بولا۔

میڈم خوش بخت کمرے میں آئی اور ایک چیک مجاہد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ لیجئے مجاہد صاحب! یہ میری طرف سے تھوڑی سی امداد ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ آپ کے لئے نہیں کر سکتی۔ آپ میری مجبوریوں کو سمجھتے ہیں نا۔''

مجاہد عجلت میں پیالی رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور چیک لے کر بڑے ادب سے خم ہوا۔

''نہیں۔ نہیں۔ میڈم۔ یہ جو کچھ آپ کر رہی ہیں۔ ہماری تنظیم کے لئے بڑی حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔ وہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ سے اس طرح کی درخواست کر دی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ آپ خاتون ہیں اور تنہا رہتی ہیں۔''

''چھیئے کوئی بات نہیں۔ آپ بیٹھئے۔'' وہ خوش اخلاقی سے کہنے لگی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر دونوں چلنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میڈم خوش بخت نے مراد کی طرف دیکھا اور اپنائیت سے بولی۔

''تم کبھی کبھی آ جایا کرو۔ اور آپ بھی مجاہد صاحب!''

مجاہد ہنسا۔ ''اصل دعوت تو اسی کو مل رہی ہے نا میڈم!''

''نہیں۔ آپ بھی جب چاہیں تشریف لائیں۔'' وہ متواضع لہجے میں بولی۔

''میڈم! میں کسی روز آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اپنی امی سے ملوانے۔ آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی۔ وہ بھی آپ کی پرستار ہیں۔ آپ کے بہت سے نغمے ان کے پاس ہیں۔'' احمد مراد نے اشتیاق سے کہا۔ میڈم خوش بخت نے بڑی شفقت سے اس کے بال چھوئے۔ ''اچھا۔ کسی روز دیکھیں گے۔''

O……O……O

تپتی ہوئی طویل شاہراہ تھی اور وہ تنہا۔ لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ اکیلا۔ اجنبی نگاہوں سے گرد و پیش کو دیکھتا ہوا۔ سنبھل سنبھل کر سانس لیتا۔ اکھڑے ہوئے قدم رکھتا۔ ڈر ڈر کر آگے بڑھ رہا تھا۔ نہ کوئی منزل تھی۔ نہ نشانِ منزل۔ نہ راستے کی خبر تھی۔ نہ چلنے کی سکت۔ زمین پر اس کے پاؤں نہیں جمتے تھے۔ نگاہ کہیں نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہر شے دھندلی اور بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔

جیل کی سنگین دیواروں کے درمیان رہتے ہوئے اس نے باہر کی دنیا کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اسے یہیں مر کھپ جانا ہے۔ باہر کی آزاد دنیا سے اس کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رہا۔ اسے باہر کی دنیا میں جانے کی آرزو بھی نہیں رہی تھی۔ جس میں سانس لینا۔ جیل میں سانس لینے سے زیادہ اذیت ناک تھا۔

لیکن آج اچانک ہی اسے رہائی کا پیغام مل گیا تھا۔ اس نے ان دونوں جوانوں کو جیل میں آتا جاتا اور اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس کو اس کی توقع نہیں تھی کہ واقعی جیل کا یہ مضبوط دروازہ کھل جائے گا۔ اسے وہ کہہ کر گئے تھے کہ وہ دونوں خود اسے لینے آئیں گے۔ مگر نہ جانے کیوں وہ خود نہیں آئے تھے اور جیل والوں نے اسے ایک روز پہلے ہی رہا کر دیا تھا۔ حالانکہ اب اسے رہائی کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو گن گن کر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

وہ بھری جوانی کے سارے رنگین دن جیل کی سنگین دیواروں کے درمیان گزار آیا تھا۔ جوانی کے سب ولولے شباب کے تمام رنگین خواب اور زندگی کے دھنک رنگ دن اس متعفن ماحول کی نذر کر آیا تھا۔ اب تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ زندگی کے دامن میں اس کے لئے کوئی سوغات نہیں رہی تھی۔ وقت کے چمن میں کھلنے والے پھولوں میں سے کوئی پھول اس کے لئے نہیں تھا۔

ہر طرف اجنبیت تھی۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آ تا تھا۔ نہ اسے کوئی جانتا تھا۔ نہ وہ کسی کو جانتا تھا۔ وہ یکہ و تنہا بے ارادہ چلا جاتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا۔ کہ اسے زندگی کا آغاز کہاں سے کرنا ہے۔ اسے کس سمت چلنا ہے۔ اور کس طرف جانا ہے۔

سب کچھ بدل گیا تھا۔ نئے راستے، نئے چہرے، نئے لباس۔ فراٹے بھرتی گاڑیاں، ٹریفک کا ہجوم۔ لوگوں کی آپا دھاپی۔ شور و غوغا۔ سب کچھ نیا نیا اور اکتا دینے والا تھا۔ جیل کی فضا میں وہ مخصوص آوازیں سننے کا عادی ہو چکا تھا۔ یہ شور، یہ ہنگامہ اسے بہت اوپرا اوپرا سا لگ رہا تھا۔

اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اسے گرد و پیش کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ گلی بھی کچھ مانوس تھی۔ لیکن مکانوں کے دروازے بدلے بدلے سے تھے۔ اس نے پھر غور سے چاروں طرف دیکھا کہ یہ کہیں اس کی نظر کا دھوکا تو نہیں۔ ہر طرف کچھ تبدیلی تو تھی۔ لیکن پھر بھی ماضی کے کچھ لمحے کہیں کہیں سے جھانک رہے تھے۔ وہ کبھی یہاں سے گزرا تھا۔ شاید یہاں ٹھہرا بھی تھا۔ اس جگہ اس کی کوئی نہ کوئی وابستگی ضرور رہی تھی۔ کہ وہ سب کچھ فراموش کر کے بھی اس جگہ کو نہیں بھولا تھا۔ اور بلا ارادہ ہی اس طرف نکل آیا تھا۔

اس کے پاؤں آپ سے آپ ایک دروازے کی جانب اٹھ رہے تھے۔ اس دروازے کی دہلیز اس کی پہچانی ہوئی تھی۔ وہ متذبذب سا وہیں رک گیا۔ کچھ گھبرایا ہوا سا۔ خوفزدہ خوفزدہ۔ ڈر ڈر کر یہ سوچتا ہوا کہ وہ ماضی کے ان دریچوں پر دستک دے یا نہ دے؟

نہ جانے کیا جواب ملے؟

نہ معلوم دروازہ کھلے۔ نہ کھلے؟

نہ جانے دروازے کے پیچھے کیا ہو؟

وہ کچھ دیر یونہی متذبذب سا کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنی ہمتوں کو یکجا کیا اور دروازے پر ایک دبی دبی سی محتاط دستک دی۔ اس کا رواں رواں انتظار کی کیفیت میں سلگ اٹھا۔ کہ نہ جانے اس دستک کا کیا جواب آئے گا۔

تھوڑے انتظار کے بعد اس نے پھر ایک بار دروازہ کھٹکھٹایا۔

جواب میں کوئی پکارا۔ کسی نے کچھ پوچھا۔ وہ صاف طور پر نہیں سن سکا۔ لیکن اس شیریں آواز کی کھنک نے اسے زندہ کر دیا۔ بیتابی کی ایک انجانی کیفیت میں وہ یہ بھول

گیا۔ کہ یہاں تک آنے میں وہ کتنا کچھ کھو آیا ہے۔

دروازہ کھلا۔ اس نے مشتاق آنکھوں سے دیکھا۔ پھول ایسا شگفتہ چہرہ اس کی پیاسی آنکھوں کو یکبارگی سیراب کر گیا۔

وہ بڑی نرمی سے پوچھنے لگی۔ ''کیا بات ہے بابا؟''

وہ چونک گیا۔ اسے بدل جانے والے وقت کا احساس ہوا۔ اسے اپنی بدلی ہوئی صورت، اپنی کھوئی ہوئی پہچان اور چھن جانے والی شناخت یاد آئی۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے متاسف ہو کر سوچا کہ وہ گزرے ہوئے ماہ و سال لوٹا نہیں سکتا۔ تو پھر اس دہلیز پہ کیوں چلا آیا ہے۔

اس نے پھر سوال کیا۔ ''کیا بات ہے بابا؟''

اس نے سر جھکایا۔ اور شکستوں سے چور آواز میں بولا۔

''گل! مجھے پہچانو۔ میں سجاول ہوں۔''

''تم؟ سجاول؟'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔

سجاول کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ صرف دو آنسو اس کی میلی آنکھوں سے نکلے اور اس کی الجھی ہوئی داڑھی میں جذب ہو گئے۔

گل نے پھر اس کی طرف دیکھا اور کچھ حیرت اور پریشانی سے بولی۔ ''اندر آ جاؤ۔ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ کہاں چلے گئے تھے تم۔ جو آج خبر لی ہے۔''

وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اپنے دکھوں کے بوجھ سے جھکا جھکا۔ اس آنگن میں داخل ہو گیا۔ جو کبھی اس کے لئے عافیت کا گہوارہ تھا۔ گل نے ایک نشست کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ''بیٹھ جاؤ آرام سے۔ تم مجھے بہت پریشان لگ رہے ہو۔ کچھ پانی۔ چائے وغیرہ پیئو گے؟''

وہ ایک کرسی پر ڈھے سا گیا۔ اس میں سر اٹھانے کی تاب بھی نہیں رہی تھی۔ گل پانی کا گلاس لے کر آئی اور اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ''یہ لو پانی پیو۔ اطمینان سے بیٹھو۔''

سجاول کو خواہش تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر دو تین گھونٹ بھرے۔ وہ بھی سامنے ایک نشست پر بیٹھ گئی اور مدھم سے لہجے میں بولی۔

''سجاول! تم نے تو حد ہی کر دی۔ نہ کوئی اتہ پتہ۔ نہ اطلاع۔ آخر تم چلے کہاں گئے تھے؟ ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ تمہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔''

"ہاں۔ حادثہ ہی تھا۔" سجاول نے اذیت سے ہونٹ کاٹ کر کہا۔

"حادثہ ہی سمجھو۔ جب میں بہت کچھ کرتا تھا۔ تو آزاد پھرتا تھا۔ لیکن جب میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ تو میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔"

"کیا مطلب؟ یہ تم کیا کہہ رہے؟" وہ بھونچکی سی رہ گئی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں گل۔ وہ اذیت سے تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اوہ!" گل کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ وہ چند لمحے یوں بالکل چپ رہی۔ جیسے سمجھ نہ پاتی ہو کہ کیا کہے۔ پھر سرد آہ سی بھر کر بولی۔

"خدا کی مصلحتوں کی کس کو خبر ہے سجاول۔ کیا پتہ یہ تمہاری گزشتہ کوتاہیوں کا کفارہ ہو۔"

سجاول نے ایک مفہوم نگاہ اس کے مہربان وجود پر ڈالی۔ وہ آج بھی ویسی ہی دلکش اور پاکیزہ سی معلوم ہوتی تھی۔ وقت کی گردش نے اسے کچھ اور زیادہ بردبار اور باوقار بنا دیا تھا۔ اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے دیکھ کر وہ بولی۔

"سجاول۔ تمہیں نیلم بھی یاد ہے یا اسے بالکل بھول گئے۔ تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔"

"نیلم!" سجاول نے دوہرایا اور اس کے دل کو جیسے ایک ٹھیس سی لگی۔ اسے گھر کی دہلیز پہ کھڑی نیلم یاد آئی۔ جس سے اس نے جلدی لوٹ کر آنے کا کہا تھا۔ مگر پھر پلٹ کر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ اس کے بارے میں بتاؤ۔ ویسے مجھے اس کی طرف سے اطمینان تھا کہ وہ تمہارے پاس ہی آئے گی اور تم اسے سنبھال لو گی گل! اس وقت کہاں ہے وہ؟ نظر نہیں آ رہی؟"

"وہ تمہیں اب نظر نہیں آئے گی سجاول!" گل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"تقدیر نے اس کی زندگی میں خوشیاں صرف ایک پل کیلئے ہی لکھی تھیں۔ سجاول وہ تمہیں بہت چاہتی تھی۔ تمہارے بعد اس نے ایک لمحہ بھی چین سے نہیں گزارا۔ وہ تمہارے لئے گھلتی رہی۔ تمہارے لئے سلگتی رہی۔ بستر سے ایسی لگی کہ پھر اٹھی نہیں۔ تمہارے بعد تو شاید وہ ایک سال بھی زندہ نہیں رہی۔" وہ مغموم سے لہجے میں کہنے لگی۔

سجاول ساکت سا ہو گیا۔ اس نے اذیت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھکا دیا۔ اس کے اندر درد کی ایک ٹیس سی جاگی۔ سلگتے ہوئے سے آنسو اس کے دل میں کہیں گرنے لگے۔ اسے اپنی تہی دامانی کا احساس ہوا۔ اس نے اذیت سے ہونٹ کاٹے اور کرب آلود لہجے میں بولا۔

"میرے نصیبوں میں تو نہ محبت ہے۔ نہ کوئی رشتہ۔" وہ بے چینی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اور جیسے اپنے آپ سے بولا۔ "ان اللہ کے بندوں سے کہا بھی تھا کہ میں رہا نہیں ہونا چاہتا۔ میں جیل سے باہر نہیں جانا چاہتا۔ مگر انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔" اس نے گل کی طرف دیکھا اور پژمردہ سے لہجے میں بولا۔

"اچھا۔ میں چلتا ہوں۔"

"کہاں...... کہاں جا رہے ہو۔" گل بھی اپنی جگہ سے اٹھی۔

"ذرا ٹھہرو تو سہی۔"

"بس تمہیں دیکھ لیا۔ یہ بہت ہے گل!" اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ لیکن اچانک ٹھٹک کر رک گیا اور پلٹ کر گل سے بولا۔

"یہ کس کی تصویر ہے؟"

"میرے بیٹے کی۔" وہ تھوڑے توقف کے بعد بولی۔

"تمہارا بیٹا؟" وہ مسرت آمیز حیرت سے بولا۔ "یہ تو۔ یہ تو مراد ہے۔ اس نے تو مجھے رہا کروایا ہے۔ یہ...... یہ جیل میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے آج بھی آنا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں نہیں آیا اور پولیس والوں نے مجھے رہا کر دیا۔" وہ دو قدم گل کی طرف بڑھا اور خوشی کے لہجے میں کہنے لگا۔ "گل! گل! وہ تو بالکل تم پر گیا ہے۔ بہت سمجھدار لڑکا ہے۔ بہت اچھی باتیں کرتا ہے وہ۔"

گل ایک عجیب سی حسرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"سجاول۔ تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔"

"ہاں...... ہاں۔ اب تو میں ضرور بیٹھوں گا۔" وہ بدلے ہوئے خوش کن لہجے میں بولا۔ "گل! میں بہت خوش ہوں کہ تمہارا اس جیسا لائق اور سمجھدار بیٹا ہے۔ وہ کب آئے گا۔ میں اس سے مل کر جاؤں گا۔"

"ہاں۔ بیٹھ جاؤ۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ "مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔ تم بیٹھ جاؤ سجاول!"

سجاول ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر گل اسی طرح کھڑی رہی۔ اس کے دلکش چہرے پر کسی سوچ کا گہرا عکس تھا۔ وہ کچھ متذبذب سی نظر آتی تھی۔ سجاول چند لمحے اسی انتظار میں رہا کہ وہ کچھ کہے گی۔ لیکن جب وہ اسی طرح خاموشی میں ڈوبی کچھ سوچتی رہی تو سجاول نے اسے متوجہ کیا۔

"گل کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہی ہو۔"

وہ چونک سی گئی۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم لیتی قریب آئی اور اس کے شانے کو تھپتھپا کر بولی۔ "سجاول! ایک بات ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ تم سے کس طرح کہوں؟"

"کیوں؟"

"تم اگر میری بات حوصلے سے سنو تو کہوں۔ اگر تم میری بات سہارو تو تمہیں بتاؤں کہ تمہارے جانے کے بعد نیلم نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ بچے کی ولادت وقت سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ نیلم کو بچایا نہیں جا سکا تھا۔"

سجاول نے بے یقینی اور یقین کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا۔ اور اٹکتے ہوئے بولا۔ "اور بچہ؟"

"بچے کے بچنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ بہت کمزور تھا۔ میں نے بڑے جتن کیئے۔ بڑی دعائیں مانگیں۔ اللہ نے اسے زندگی دے دی۔"

سجاول کی جیسے جان میں جان آئی۔ اور اس کی بیقراری سوال بن گئی۔ "کہاں ہے وہ؟ میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"مراد تمہارا بیٹا ہے سجاول۔ میں نے تو صرف اسے پالا ہے۔"

گل کا ایک ایک لفظ جیسے اس کے دل میں سے ہو کر گزرا۔ اس کی روح میں پھول کھل گئے۔ اس کے روئیں روئیں میں سرخوشی بن کر اتر گئے۔ اس نے حیرت و مسرت سے کانپتے ہوئے لہجے میں جیسے یقین کر لینے کو پوچھا۔

"گل! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مراد میرا بیٹا؟"

"ہاں سجاول! مراد تمہارا بیٹا ہے۔ نیلم کی آخری نشانی۔"

سجاول کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ زندہ ہو گیا۔ اسے یہ سب کچھ جیسے ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار جیسے پھر خود کو یقین دلانے کو دوہرایا۔

"مراد۔ میرا بیٹا۔"

"ہاں۔ مراد تمہارا بیٹا ہے سجاول۔ میں نے اسے ماں بن کر پالا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ سمجھدار ہوا۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ میں اس کی سگی ماں نہیں ہوں۔ مگر وہ یقین ہی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے۔ میں ہی اس کی سگی ماں ہوں۔ وہ بھی مجھے بہت پیارا ہے۔ جیسے میرا اپنا بیٹا ہو۔"

"وہ تمہارا ہی بیٹا ہے گل! تم نے اسے پالا ہے۔ اسے اپنا جیسا بنا دیا ہے۔ اس کی باتیں سن کر مجھے لگتا تھا۔ وہ کسی بہت اچھی ماں کا بیٹا ہے۔" وہ شادماں شادماں سے لہجے میں کہتا گیا۔ پھر یکدم خاموش ہو گیا۔ اور کچھ پشیمانی سے جھجکتا ہوا سا بولا۔

"گل! گل! تم نے اسے میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"تمہارے بارے میں۔" وہ کچھ متاسف سی ہو گئی۔ تمہارے بارے میں۔ میں اسے کیا بتا سکتی تھی سجاول! تمہارا کچھ پتہ ہوتا تو بتاتی نا۔ تم تو یوں گئے تھے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔"

"پھر؟" وہ سانس روک کر بولا۔

گل نے ایک گہرا سانس لیا اور ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "جب مراد چھوٹا سا تھا تو مجھے تمہارے آنے کی آس تھی۔ میرا خیال تھا کہ جلد یا بدیر تم آ جاؤ گے یا اپنے بارے میں کوئی اطلاع ہی دے دو گے۔ لیکن تمہارا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور مراد۔ مراد کو ہمیشہ بچہ تو نہیں رہنا تھا نا۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا۔ اپنے باپ کے بارے میں سوال کرنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ میری وقتی باتوں سے بہل جاتا تھا۔ لیکن پھر وہ زیادہ شدت سے تمہارے بارے میں پوچھنے لگا۔"

"میں اسے ٹالنے کی کوشش کرتی تو وہ ناراض ہو جاتا۔ گھر کے ایک کونے میں روٹھا ہوا سا بیٹھا رہتا۔ ٹھیک طرح کھانا بھی نہ کھاتا۔ اسکول سے اس کی رپورٹ بھی خراب آنے لگی۔ وہ اپنے ہم جماعتوں سے لڑنے لگا۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اسے کیا بتاؤں۔ اسے کس طرح سمجھاؤں؟"

"پھر؟" سجاول نے یوں پوچھا۔ جیسے اس کی موت اور زندگی کا سوال ہو۔

"سجاول! بیٹا ہمیشہ اپنے باپ کے نقش قدم تلاش کرتا ہے۔ وہ اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک مثال کی طرح اسے اپنے سامنے رکھتا ہے اور اپنے ساتھیوں میں اپنے باپ کا ذکر فخر سے کرتا ہے۔"

گل جیسے سانس لینے کو رکی پھر تھکے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"اب تم خود ہی سوچو کہ بھلا میں اس کو کیا جواب دیتی کہ اس کا باپ کون ہے؟ کہاں ہے؟ میں اس سے یہ کس طرح کہتی کہ اس کا باپ۔ اس کی ماں کو۔ اپنے ہنستے بستے گھر کو چھوڑ کر اچانک کہیں چلا گیا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ میری راتوں کی نینداور دن کا چین حرام ہو گیا۔

"میرے سامنے صرف مراد تھا۔ میرے لئے وہی سرمایہ تھا۔ میں اسے کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اس میں کوئی کمزوری یا خامی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر میں نے فیصلہ کرلیا اور اسے باپ کا ایک خیالی تصور دے دیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ اس کا باپ ایک بہادر سپاہی تھا۔ جو مشرقی پاکستان کے محاذ پر گیا تھا۔ مگر پھر نہیں لوٹا۔ میں نے اسے اس کی بہادری کی فرضی داستانیں سنائیں۔ اور ہر اچھائی اور ہر خوبی کو اس کے باپ کے روپ میں مجسم کر دیا۔ تم یقین کرو سجاول کہ اس کے بعد مراد ایک دم سدھر گیا۔ وہ ایک اچھا اور بہادر بچہ بن گیا۔ اس کے اسکول سے بھی اچھی رپورٹ آنے لگی۔"

"وہ اب تک یہی سمجھتا ہے گل؟" سجاول نے ہونٹ کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں سجاول! وہ اپنے ان دیکھے باپ کے تصور میں ہی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اس کی قربانی کو سامنے رکھ کر ہی زندگی کے سفر پر نکلا ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتا ہے کہ اس کا باپ ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن اس کے پاس شہادت کا رتبہ ہے۔ جس سے بڑا رتبہ شاید انسان کے لئے کوئی اور نہیں۔"

"اوہ!" سجاول نے بیقراری سے اپنے بال نوچے۔ اور پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

"اوہو۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے سجاول۔" گل نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہ مجھے جیل میں دیکھ چکا ہے۔ اسی نے تو مجھے رہا کروایا ہے۔ گل! وہ مجھے دیکھ کر کیا کہے گا۔ وہ کیا سوچے گا؟ وہ سمجھے گا کہ تم نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔" وہ تاسف سے کہنے لگا۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" گل بھی قدرے پریشان ہوئی۔ سجاول سر جھکائے پریشانی سے کچھ سوچتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر شکستہ سے لہجے میں بولا۔

"گل! اس زندگی میں کبھی کوئی رشتہ میرا اپنا نہیں ہوا۔ جو حاصل ہوا۔ وہ چھن گیا۔ وہ لٹ گیا۔ میں اب اس رشتے کو اپنا کر کیا کروں گا۔ یہ رشتہ میری زندگی ہے۔ میرا اطمینان ہے۔ میرا آسرا ہے۔ لیکن میں اسے اپنا کر کھونا نہیں کرنا چاہتا۔

"میں اپنے بچے کی زندگی میں زہر نہیں گھولنا چاہتا۔ میں اس کے خواب توڑنا نہیں چاہتا۔ گل میں تمہیں اس کے سامنے جھوٹا نہیں بنانا چاہتا۔ میں باپ ہو کر اسے کچھ دے نہیں سکا۔ تو اس سے کچھ چھینوں گا بھی نہیں۔ میں اس سے باپ کا تصور نہیں چھینوں گا۔ جو تم نے اسے دے رکھا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ضبط کی اذیت سے چور چور ہو کر بولا۔

"گل! میری تو زیادہ گزر گئی ہے۔ تھوڑی رہ گئی ہے۔ وہ بھی گزر جائے گی۔ مراد کے سامنے تو ابھی پوری زندگی ہے۔ میں اس پر اپنا منحوس سایہ نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہ جس تصور کو لے کر چل رہا ہے۔ اسے اسی کے سہارے چلنے دو۔ اسے میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔"

گل نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دو قدم چل کر اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"گل! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مراد کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔"

"تم کچھ سوچنے تو دو سجاول!" گل نے بے طرح الجھ کر کہا۔

"نہیں بس۔ اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔" وہ کرب سے تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں جا رہا ہوں۔ تم میری طرف سے مراد کا ماتھا چومنا۔"

"اوہو سجاول۔ تم بات تو سنو۔" گل نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن پار کر کے دہلیز تک پہنچ۔ گل اس کے پیچھے لپکی۔

"سجاول! بات سنو۔ ٹھہرو۔" اس نے پھر پکارا۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔ اور مراد کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"امی...... امی جان۔" وہ خوشدلی سے پکارتا ہوا اندر آیا۔

سجاول اس کے عین سامنے تھا۔ وہ ٹھٹک کر رکا اور حیرت سے بولا۔

’’ارے بابا...... آپ......!! آپ یہاں......!!‘‘

سجاول بھی چند لمحے کو ٹھٹکا۔ اس کا جی چاہا کہ پہلی اور آخری بار اپنے دل کے ٹکڑے کو سینے سے لگا کر اپنے دل میں بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کر لے۔ شاید پھر کبھی یہ لمحہ ہاتھ نہ آئے۔ شاید پھر کبھی یہ موقع نہ ملے۔ شاید پھر کبھی یہ پیاس نہ بجھے۔ مگر پھر اس نے خود کو سمجھا لیا۔ خود کو روک لیا۔ امنڈتے جذبوں کو سینے میں گھونٹ کر اس نے نظر بچا کر گزر جانا چاہا۔ لیکن احمد مراد نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

’’بابا۔ ٹھہرو تو سہی۔ ایک منٹ۔ مجھ سے بات کر کے جانا۔‘‘

گل بھی تب تک دروازے تک آ گئی تھی۔ مراد کو اس کا بازو پکڑے دیکھ کر وہ کچھ متذبذب سی ہو گئی اور کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں گرفتار۔ چپ کی چپ رہ گئی۔ مراد اسے دیکھ کر بولا۔

’’امی...... دیکھیے۔ کون آیا ہے؟‘‘

گل ہکا بکا سی رہ گئی۔ مراد سجاول کے بارے میں اس طرح کیوں کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کیا جانتا تھا۔ اس نے حیرت سے سوچا۔ مراد نے پلٹ کر دروازے میں سے جھانکا۔

’’آ جایئے نا پلیز۔ ہمارا غریب خانہ تو بس ایسا ہی ہے۔‘‘

سجاول اور گل دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک فیشن ایبل دراز قد خاتون بڑے وقار سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے سیاہ چشمہ اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

’’میڈم...... یہ ہیں میری امی۔ بہت ہی پیاری امی اور دنیا کی سب سے اچھی امی۔‘‘

احمد مراد خوشدلی سے تعارف کرانے لگا۔

’’امی جان! اب آپ جلدی سے حیران ہونے کے لئے تیار ہو جایئے‘ کیونکہ یہ ہیں میڈم خوش بخت!‘‘

گل جو پہلے ہی اس کے رکھ رکھاؤ اور حیثیت سے قدرے مرعوب سی ہو رہی تھی۔ یہ سن کر واقعی ایک خوشگوار حیرت کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی کہ وہ اس کی پسندیدہ گلوکارہ خوش بخت تھی۔

احمد مراد نے سجاول کی طرف دیکھا۔ جو ایک ٹک خوش بخت کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اور بولا۔ ’’میڈم لگتا ہے۔ بابا جی بھی آپ کے پرستار ہیں۔‘‘ اس نے ہنس کر اس کی محویت کی جانب اشارہ کیا اور خوش بخت سے بولا۔

’’میڈم! یہ وہی بابا جی ہیں۔ جن کی رہائی کے لئے مجاہد اور میں کوشش کر رہے تھے۔ اور مزے کی بات یہ کہ پولیس نے ہمیں تو یہ بتایا تھا کہ انہیں کل رہا کیا جائے گا۔ لیکن چھوڑ دیا انہیں آج ہی۔ عجیب لوگ ہیں۔ میرا خیال ہے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں بابا۔ زیادہ ہی پبلسٹی نہ لے جائے۔‘‘

’’مراد! انہیں یہیں کھڑا رکھو گے یا اندر بھی آؤ گے۔‘‘ گل نے اسے ٹوکا۔

’’اوہ۔ آئی ایم سوری میڈم۔‘‘ مراد جلدی سے بولا اور بڑے آداب کے ساتھ اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ اور سجاول سے بولا۔ ’’بابا جی آپ بھی آ جائیں۔ ذرا بتائیں تو سہی کہ آپ یہاں کس طرح پہنچ گئے تھے۔ میرا پتہ آپ کو کس نے دیا۔‘‘

سجاول نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اور اب بھی حیران آنکھوں کے ساتھ میڈم خوش بخت کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ الجھ کر آگے بڑھی۔ مراد نے بھی اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا لی اور سجاول کا شانہ ہلا کر بولا۔

’’آ جاؤ۔ بابا جی آ جاؤ۔ چلو اندر چلو۔‘‘

سجاول نے چونک کر سر جھٹکا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک آہ سی پھسل گئی۔

’’آپا بھاگ بھری!‘‘

میڈم خوش بخت یوں چونک کر پلٹی۔ جیسے کرنٹ لگ گیا اور بھونچکی سی ہو کر سجاول کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر دو قدم آگے بڑھی اور اس کے بازو کو ہلکا سا جھنجھوڑ کر بولی۔

’’کون ہو تم؟ یہ ابھی تم نے کیا کہا تھا۔‘‘

’’کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔‘‘ سجاول اس کا ہاتھ ہٹا کر جانے کیلئے مڑا۔

’’اوہ میڈم! یہ شخص آپ کو جانتا ہے۔ مجھے یاد آ گیا اس نے ابھی آپ کا اصلی نام لیا ہے۔‘‘ مراد نے قدرے جوش سے کہا۔

خوش بخت نے پھر سجاول کو روک لیا۔

’’تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ تم مجھے کس طرح جانتے ہو۔ کون ہو تم؟‘‘

''بابا! بتاؤ نا میڈم کو۔ تم اس کا نام کس طرح جانتے ہو؟'' مراد نے بھی زور دیا۔ گل بھی قریب آ گئی۔ اور نرمی سے بولی۔

''سجاول! آپا بھاگ بھری کو بتاؤ نا کہ تم اس کے چھوٹے بھائی ہو۔ اور تم نے ساری زندگی اسے ہی تلاش کرنے میں گزار دی ہے۔''

سجاول کے ہونٹ کانپے۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کی کھچڑی داڑھی میں جذب ہو گئے۔ خوش بخت بھونچکی سی رہ گئی اور آگے بڑھ کر اسے دونوں شانوں سے تھام کر بولی۔ ''تو سجاول ہے۔ سجاول!''

غیر ارادی طور پر سجاول کا سر اثبات میں ہل گیا۔ لیکن وہ ہونٹوں سے ایک لفظ نہیں کہہ سکا۔

''ہائے۔ وے میرے ویرا۔ ہم تو لٹ گئے۔ لٹ گئے۔'' وہ اپنے گاؤں کی مخصوص زبان میں کہتی ہوئی بے ساختہ اس کے گلے سے لگ گئی۔

''میں تو ساری زندگی۔ تیری آس میں جیتی رہی ہوں ویرا! کہ کبھی تو تو مجھے ملے گا۔ کبھی تو تو مجھے نجات دلانے آئے گا۔ میں تو تیری راہ تکتے تکتے تھک گئی تھی۔'' وہ سسکیوں کے درمیان نہ جانے کیا کچھ کہتی جا رہی تھی۔ سجاول اس کے بال سہلاتا ہوا دکھ سے پگھل رہا تھا۔

احمد مراد متاثر سا ہو کر دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گل کی پلکیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں کو علیحدہ کیا۔

''چلیے اندر چل کر اطمینان سے باتیں کیجیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے یہاں آپ دونوں بہن بھائیوں کو ملایا ہے۔ یہ بہت خوشی کا دن ہے۔''

اس نے خوش بخت کا بازو تھاما اور اسے اندر لے جاتے ہوئے مراد سے بولی۔

''مراد! بابا کو اندر لے آؤ۔ اور ذرا بڑے احترام سے۔ یہ تمہارے بابا ہیں۔ سمجھے کچھ؟''

احمد مراد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گل کی طرف دیکھا۔ جو خوش بخت کے ساتھ صحن پار کر کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ پھر سجاول کی طرف دیکھا جو کچھ متذبذب' کچھ پشیمان سا کھڑا یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ اندر چلا جائے یا دروازہ کھول ... سمت سے باہر نکل جائے۔ اور ہنس کر بولا۔

''بابا جی! یہ امی جان کیا شوشہ چھوڑ گئی ہیں۔ آئیں ذرا۔ اندر چل کر ان سے پوچھتے ہیں۔''

سجاول کے روئیں روئیں میں ایک تڑپ سی جاگی۔ وہ ضبط نہیں کر سکا۔ اس نے آگے بڑھ کر مراد کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور اس کی فراخ پیشانی کو چوم کر بولا۔ ''مراد! تم میرے بیٹے ہو۔ میرے...... میرے اپنے......!!''

(ختم شد)